فورٹ ولیم کالج

کی

نثری داستانیں

(ایک تہذیبی مطالعہ)

(ڈاکٹر) عفّت زرّیں

ناشر

شمیم صدیقی

۵۴۳، گلی حکیم جی والی، چوڑی والان

جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

فورٹ ولیم کالج

کی

نثری داستانیں

(ایک تہذیبی مطالعہ)

(ڈاکٹر) عفّت زرّیں

ناشر

شمیم صدیقی

۵۴۳، گلی حکیم جی والی، چوڑی والان

جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

کتاب کا نام :- فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں۔ (ایک تہذیبی مطالعہ)

مصنف کا نام :- ڈاکٹر عفت زریں

اشاعتِ اوّل :- ۱۹۹۲ء
تعداد : چھ سو (۶۰۰)
کاتب : واحد علی خاں
مطبع : مرکزی پرنٹرز۔ ۲۰۲ چوڑی والان، دہلی ۱۱۰۰۰۶

قیمت :- ۱۱۵/- روپے

ناشر :- شمیم صدیقی، ۴۲۳۵ گلی حکیم جی، چوڑی والان، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

تقسیم کار :- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

یہ کتاب اُردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

انتساب

اپنے والد مرحوم حضرت مشیر جھنجھانوی

کی

روح پر فتوح

کے

نام

تمھاری خوبیاں زندہ تمھاری نیکیاں باقی

(زریں)

داستانِ دل بھی ہے، تہذیب کی تاریخ بھی
وقت کے قصے ہیں، جو دہرائے جاتے ہیں یہاں

(عفت زرّیں)

فہرست

حرفِ آغاز	۹
پیش لفظ	۱۳
باب اوّل : تہذیب اور ہماری داستانیں	۲۱
باب دوم : آرایشِ محفل	۴۷
باب سوم : باغ و بہار	۱۶۳
باب چہارم : بیتال پچیسی	۲۲۱
باب پنجم : قصۂ گُل بکاولی	۳۱۱

حرفِ آغاز

اب سے دس برس پیشتر جب راقمہ نے اپنے تحقیقی مقالے کے لئے "فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانوں کا تہذیبی مطالعہ" بطور عنوان چنا اور "شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی" نے اس کی منظوری عطا کی تو موضوع کی ندرت پر جہاں ایک گونہ مسرت ہوئی۔ وہاں میں سلسلۂ تحقیق و تنقید کی دشواریوں کا احساس بھی مسلسل میرے ذہن کو گھیرے رہا ـــــ یہ کام کیسے ہو؟ اور اس کے رہ نما خطوط کیا مقرر کئے جائیں؟ اس سے متعلق میں اپنے استاذ اور بالخصوص اپنے "سپروائزر" "ڈاکٹر تنویر احمد علوی" سے تبادلۂ خیال کرتی رہی اس لیے اس سے پیشتر داستانوں کا کوئی تہذیبی مطالعہ سامنے نہیں آیا یا پھر اپنی محدود نظر کی بنا پر اس تک میری رسائی نہیں ہوئی تھی۔

فنی نقطۂ نظر سے داستانوں پر اچھا خاصہ لکھا جا چکا تھا پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر وقار عظیم کی نگارشات میں داستانوں کی فنی تنقید سے متعلق بعض بنیادی امور پر روشنی ڈالی گئی تھی لیکن داستانیں ایک تہذیبی مرقع کے اعتبار سے کیا اہمیت رکھتی ہیں اس کے لیے رہ نما روشنیوں کی ضرورت تھی۔ ان روشنیوں تک رسائی داستانوں کے مطالعہ کے دوران ہوئی اس میں میرے ریسرچ گائیڈ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کا خصوصی تعاون اور رہ نمائی مجھے حاصل رہی کہ موصوف بھی اسی زمانے میں "بارہ ماسہ" کے تہذیبی مطالعہ پر کام کر رہے تھے یوں بھی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ ان کی دلچسپی کے اہم موضوعات میں

سے تھا اور اب بھی ہے۔

جیسے جیسے میرا مطالعہ آگے بڑھتا رہا اس کے رہ نما خطوط بھی زیادہ روشن اور واضح ہوتے گئے۔ سب سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوا کہ تہذیب کے وسیع اور متنوع مفہوم پر غور کیا جائے اور ایک حد تک اس کے تعین کے بعد ادبیات بالخصوص داستانوں میں اس تہذیبی مفہوم اور اسکے معنیاتی مطالبہ کی جستجو کی جائے معلوم ہوا کہ داستانوں میں قصے اور کہانیاں چاہیئے فرضی ہوں لیکن جس تہذیب کو داستانیں پیش کرتی ہیں ان کے کردار روایت کے جس سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان میں آرائشی لوازمات کی جو فراوانی ہوتی ہے وہ سب فرضی نہیں۔ ہاں اسے ہم بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی "تخیل اور تمثیل کا آمیزہ کہہ سکتے ہیں۔

زندگی میں اس سے گریز یا فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہم تو بات بات میں مبالغے سے کام لیتے ہیں ہمارے محاورے، کہاوتیں اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوا کہ داستانیں ان کا ماحول اور کردار مبالغہ آرائی اور اسی خیال آفرینی کی نمایندگی کرتے ہیں۔ جن، بھوت، دیو، پری، ہماری زندگی میں داخل ہیں اس طرح کے وہ ہمارے ذہن سے کبھی الگ نہیں ہوتے تبھی تو ہم قدم قدم پر کسی نہ کسی صورت میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے گذرتے ہیں۔ زندگی یوں بھی بھول بھولیوں اور پرچھائیوں سے کسی طرح خالی نہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے خیال، ہمارے خواب اور ہماری کہانیاں، ہمارے قصے اور ہماری داستانیں ان سے خالی کیسے ہوسکتی ہیں؟ آخر انسان نے اس طرح سوچا تھا تبھی تو اس طرح کہا بھی۔ بغیر سوچے بغیر سمجھے کوئی داستان نہیں بنتی۔

حقیقت وہ بھی ہے جو بہت سادہ ہے بالکل سپاٹ اور بے لباس ہے اور حقیقت وہ بھی ہے جو پیچ در پیچ ہے منقش اور مزین ہے ایسے ہی آثار اور نقوش کو ہم داستانوں میں دیکھتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس طلسمات عجائب

کی سیر معاشرے کے فکر و خیال کی سیر ہے۔ جس کے سحر انگیز پیکر حیرت خیز خیالات خوبصورت الفاظ اور دلکش عبارتوں سے داستانوں کو سجایا جاتا ہے اور یہ سب اس طرح آتے اور گذر جاتے ہیں جیسے فانوس خیال کی متحرک پرچھائیاں ہیں۔

راقم حروف نے ان سب امور کی طرف اشارے کئے ہیں اور آئندہ آنے والے اوراق میں ان ہی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شکریہ ادا کرنا ایک رسمی بات ہے گرچہ اپنے اساتذہ بالخصوص اپنے ریسرچ سپروائزر ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر فضل الحق، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر شریف احمد اور شعبۂ اردو کے دوسرے اصحاب کا شکریہ ادا کرنا کوئی رسمی بات نہیں اس کا تعلق میرے جذبات تشکر اور احساس ممنونیت سے ہے اسی کے ساتھ ہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ڈاکٹر ذاکر صاحب اور اردو اکیڈمی کے سربراہ شریف الحسن نقوی صاحب اور اشتیاق عابدی صاحب کی بے حد مشکور ہوں۔ ان سب نے میری حوصلہ افزائی کی مجھے مشورے دیئے اور میری مشکلات کو حل کیا یہ کتاب خود دہلی اردو اکادمی کے تعاون سے شائع ہورہی ہے۔

اس بارۂ خاص میں اپنے مرحوم والد مشیر جھنجھانوی صاحب کی حوصلہ افزائی کو آج لمحہ بہ لمحہ یاد کرتی ہوں اگر وہ میری علمی سرپرستی نہ فرماتے۔ میری والدہ میرا ساتھ نہ دیتیں اور میرے شوہر شمیم صدیقی وقت نہ نکالتے تو شاید یہ کام اس طرح نہ ہوتا۔

ان تمام صاحبان کے علاوہ بطور خاص محترم شریف بھائی اور جناب جہانگیر بھائی کی بھی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے میری دشواریوں کو آسان کرنے میں میرا ساتھ دیا۔ شریف بھائی نے وقتاً فوقتاً کتابوں کی فراہمی اور پروف ریڈنگ میں میری

مدد کی جہانگیر بھائی نے کتاب کی طباعت اور اشاعت میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

مخلصہ
عفت زریں

۲۰ جون ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

تہذیب اپنا ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور اس وسیع مفہوم کے زمرہ میں بہت سی وہ باتیں آجاتی ہیں جن کا تعلق کسی بھی معاشرے کے فکری اور عملی نظام سے ہوتا ہے۔ یہ فکری اور عملی نظام ایک قوم کی سوچ کا حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے پیچھے صدیوں میں پھیلا ہوا سلسلہ بھی۔ اس کے جغرافیائی ماحول سے متعلق اس کا تصور یا تاثر بھی۔ سچ یہ ہے کہ جسے ہم مشاہدہ کہتے ہیں، وہ صرف مشاہدہ نہیں ہوتا صرف آنکھوں دیکھی کانوں سنی باتیں نہیں ہوتیں نہ جانے ان کی تہوں میں اور ان سے رشتہ رکھنے والی ذہنوں سے کتنے خواب۔ کتنے خیال، کتنی آرزوئیں اور شکستہ آرزو کی کتنی بڑی دھوپ چھاؤں موجود ہوتی ہے جس کو ہم کبھی سمجھ پاتے ہیں کبھی نہیں سمجھ پاتے خود سامنے کی باتیں بھی ہمارے لیے کبھی کوئی معنی رکھتی ہیں کبھی کوئی۔

روایتوں کا سلسلہ ہماری تاریخ بھی بناتا ہے اور تاریخ کو کہانیوں اور حکایتوں میں بدل دیتا ہے اور یہ سب چیزیں مل کر ہماری تہذیب۔ ہمارے اخلاق۔ ہمارے عوائد رسمیہ۔ ہمارے نفسیاتی عمل اور رد عمل سبھی کو متاثر کرتی ہیں ان کی شکلیں بدلتی ہیں۔ ان کو نئے معنی پہناتی ہیں کبھی ان سے اپنا رشتہ توڑتی ہیں اور کبھی جوڑتی ہیں۔ غرض کہ تہذیب کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں شہری شعور اور کاروبار شعور قصباتی اور دیہاتی نفسیات اور وہ چیزیں حصہ لیتی ہیں۔ جن کو ہم مذہبی اور معاشرتی قدریں یا سماجی [illegible] کہتے ہیں۔ ماننے اور نہ ماننے کا مسئلہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے معاشرہ جن باتوں کو مانتا

ہے ان کو دراصل نہیں مانتا اور جن کو نہیں مانتا ان کو اپنائے رہتا ہے۔ ہم مذہبوں کی طرح تہذیبوں کو بھی ان کی تاریخ ان کی روایت ان کے زمینی اور زمانی ماحول غرض کہ سبھی سے وابستہ کرکے دیکھتے ہیں کسی بھی ادب پارے یا فن پارے کے تہذیبی مطالعے کے لیے نہ صرف یہ کہ تہذیب کے مفہوم کا فی الجملہ متعین کر لینا ضروری ہے بلکہ ان اداروں کو سمجھنا بھی لازمی ہے جو تہذیب کو داخلی اور خارجی واضح اور نیم واضح طور پر متاثر کرتے ہیں اس کو کوئی شکل، کوئی صورت اور کوئی معنی پہناتے ہیں یہ ادارے کئی دائروں میں تقسیم ہوتے ہیں اور مختلف رنگوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک حلقۂ خواب بناتے ہیں جو ایک طرف ہفت رنگ ہے اور دوسری طرف ہشت پہل ان میں مذہب بھی ایک ادارہ ہے مذہب سے وابستہ رسوم مابعد الطبیعیاتی فکر فلسفیانہ رجحان، حکیمانہ نظر صوفیانہ افکار اور نہ جانے کن کن چیزوں سے اس کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے کو وہ کسی بھی زمانے کسی بھی سرزمین کسی بھی نسل سے وابستہ ہو۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس دور کا اقتصادی نظام بھی متاثر کرتا ہے۔ ہماری سوچ کا، ہماری پیداوار، آمدنی، خرچ اور معاشی رشتوں سے گہرا وابستہ ہوتا ہے۔ حقوق اور فرائض میں سب سے زیادہ یہی پہلو کارفرما رہتا ہے جو زیریں لہر (UNDER CLERRENT) کے طور پر کام کرتا رہتا ہے۔ نظام تعلیم و تربیت کو بھی خواہ وہ کسی سطح پر ہو۔ تہذیبی افکار کو دخل ضرور ہوتا ہے۔ مدرسہ ہو یا خانقاہ، مکتب ہو یا دارالعلوم سبھی ہمیں کچھ نہ کچھ دیتے ہیں اور ہم سے وفاداریوں کی شکل میں کچھ نہ کچھ لیتے ہیں۔ اس سے نچلی سطح پر زندگی کے بہت بڑے دائرے میں توہم پرستی اور تخیئل پسندی ہمیں اپنے طور پر اپنے تار و پود میں قید رکھتی ہے۔ جن، بھوت، پری، دیوتا، راکشس، فرشتے کاتبانِ اعمال یہ سب ہماری سوچ ہی کے نتائج ہیں جو طرح طرح سے تشکیل پاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں جغرافیائی ماحول، قوموں کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔

جنگل کا معاشرہ کچھ ہوتا ہے۔ صحرا کا کچھ اور۔ دشت کہسار کا کچھ اور ندی اور دریاؤں اور سمندروں کے کناروں پر بسنے والوں کا کچھ اور غرض کہ تہذیبی مطالعے کی دنیا ایک بڑی رنگا رنگ دنیا ہے جس کی سیر ایک عجائب کدے کی سیر سے کم نہیں ہے اور دید و دریافت کا ایک طویل سلسلہ اس سے وابستہ ہوتا ہے۔ کبھی چھوٹی سی بات کی طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے اور کبھی بڑی بڑی علامتوں کے ذریعے ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کو اس طرح دریافت کرتے ہیں جیسے پہلے کبھی ان کے بارے میں ہم نہیں سوچتے تھے۔

ڈاکٹر عفت زریں نے کہانیوں کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ اپنے تحقیقی کام کا ایک اہم موضوع بنا لیا اور اس اہم موضوع کے ساتھ ہر ممکن انصاف کرنے کی غرض سے تہذیب کے مفہوم، اس کے وسیع معنی، اس کے اطراف و جہات کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اپنے مقدمے میں ان کو سمیٹا۔ اور کچھ رہنما روشنیاں ساتھ لے کر فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا مطالعہ کیا یہ داستانیں سات ہیں جن کا انتخاب کیا گیا ہے یوں بھی سات کا عدد خود ایک تہذیبی علامت ہے۔ سات سمندر، سات اقلیمیں، سات آسمان، سات طبقاتِ زمیں، سات زبانیں، سات قلم، سات رنگ، سبھی ہماری زندگی میں تہذیبی جامعیت کی علامت بنتے نظر آتے ہیں ان کہانیوں کی زبان، ان کے کردار اور ان کے اجزاء ترکیبی نیز اپنے دور کی نثری روایت سے ان کا تعلق غرض کہ کئی پہلوؤں سے اب تک انھیں دیکھا جا چکا ہے اور دیکھا جا رہا ہے۔ عفت زریں نے ان کے کرداران کی علامتوں یا پھر ان کے نقوش و آثار میں چھپے ہوئے تہذیبی رویوں پر گفتگو کی اور ان کہانیوں کی شناخت کے لیے ادبی دنیا کو ایک نیا پیمانۂ نظر دیا۔

یہ کہانیاں جس کی کل تعداد سات ہے ان میں سے چار پہلے حصے میں زیر بحث آئی ہیں اور تین بعد کے حصے میں۔ ایک حصہ بہت زیادہ طویل نہ ہو جائے اس کے خیال سے یہ تقسیم ضروری تھی یوں بھی ہم اربع عناصر اور ارواحِ ثلاثہ

سے قائل ہیں۔

لکھنے کے لیے ان کہانیوں کی تعداد چاہے چار ہو، چاہے تین لیکن ان کی جہتیں ان کے اعداد اور نشانات سے الگ بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں ہندوستانی، ایرانی، تورانی، عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت عناصر کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ شریک ہیں ظاہر ہے کہ ان سب کے معنی اور معنویت کی تلاش کوئی آسان کام نہیں۔ جینکاری سے شمع و چراغ، انجم و کہکشاں اور آفتاب اور ماہتاب کا سفر روشنی کا سفر ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس میں ہر مرحلہ سمت آئے ہاں کچھ اشارے ہی یہاں ممکن ہیں۔ تفصیلات کا بہت تھوڑا سا حصہ ان مطالعات کے دائروں میں سما سکتا ہے۔ ایسا ہی یہاں بھی ہوا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر عفت زریں نے اپنے ذوق و شوق، اپنی محنت، کاوش اور اپنی لگن اور لگاوٹ سے اس کا مطالعہ بھی کیا اور اس سلسلہ کو جاری بھی رکھا اور ایک منزل تک اسے پہنچانے کی کوشش بھی کی۔ اس میں ان کے ریسرچ گائیڈ اور عزیز ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے رہنمایانہ کردار کو بھی کچھ دخل رہا ہے۔ ایک اچھا طالب علم بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق اپنے استاد کو بھی محنت پر مجبور کر دیتا ہے میں سوچتا ہوں اور صحیح سوچتا ہوں کہ اردو ادب اور اس کی ادبیات کی مزاج شناسی اس طرح کے افکار اور قدروں کے احساسات، تعارف اور تجزیے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

ہندوستان بہت سی تہذیبوں کا گہوارہ ہے بلکہ تہذیبی اور لسانی اعتبار سے ایک عجائب کدہ ہے۔ اس عجائب کدے کی سیر اس کی ادبیات کے اس کے فکر اور فن کے تہذیبی مطالعے کے وسیلے ہی زیادہ بہتر صورت میں ممکن ہو سکی ہے۔ میں اس سے پہلے کہ اپنی بات ختم کروں کہ ختم کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں۔ میں تو صرف شروع ہی کر سکتا ہوں یوں بھی ہم میں سے کون ہے جو ختم کر سکتا ہے۔ یہ کہیے کہ عفت نے بھی شروع کیا ہے بہر حال ان کے نقطۂ

نظر کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ان ہی کی بیان کردہ بعض تہذیبی وضاحتوں کو پیش کرنا مفید مطلب ہوگا۔ مثلاً قربانی پر گفتگو کرتے ہوئے عفت زریں نے لکھا ہے :-

"قربانی کا گوشت تو دوسروں کو پیش کیا ہی جاتا تھا اور آج بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے بڑا ایثار اور قربانی یہ تھی کہ اپنا گوشت کاٹ کر دوسروں کو کھلایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام نہ آسان ہے اور نہ قابلِ عمل مگر وہ معاشرہ ایسی باتوں پر یقین رکھتا تھا اور ان کی آئیڈیل ازم کی تسکین اس طرح کے غیر معمولی کارناموں سے ہوتی تھی۔ یہ گویا ایک بڑے امتحان سے گذرنا ہوتا ہے بعد میں کامیابی کی بڑی منزل سامنے آتی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بھیڑیا حاتم کے گوشت سے پیٹ بھر کر اس کی رہنمائی دشت ہویدا کی طرف کرتا ہے۔"

یہاں عفت زریں نے آئیڈیل ازم کا ذکر کیا ہے اور ایک تاریخی رسم کا حوالہ بھی دیا جو آج بھی بہت سی قوموں کی معاشی اور معاشرت کا حصہ ہے اسی کے ساتھ قربانی کا وہ تصور بھی پیش کیا ہے جہاں اپنا گوشت دوسروں کو کھلایا جاتا تھا یہاں اس کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا کہ اس دور میں طبی نہار کے معنی یہ بھی تھے کہ جو گوشت بدن سے جدا ہو جائے وہ کسی جڑی بوٹی کے چھو جانے سے دوبارہ واپس آ جائے اور زخم بھر جائے۔ جب ہی تو بھیڑیے کے ساتھ دشت ہویدا میں حاتم کا فوری طور پر سفر ممکن بھی ہو سکا۔ یہاں اس کی بھی اشارہ کر دینا چاہیے کہ یہ میتھولوجی سے متاثر کردار بھی ہے۔ اس کے بعد ایک موقع پر عفت زریں نے یہ تبصرہ قلم بند کیا ہے۔

"انگوٹھی دینا، تصویر دینا، اپنا بال سر سے توڑ کر دے دینا ایسے طلسمی تحفہ جات میں سے تھا جس سے وقت پڑنے پر بڑے سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا یہاں حاتم کو ریچھ کی بیٹی نے ایک مہرہ دیا ہے جس

سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مہرہ مصیبت پڑنے پر حاتم کے کام آئے گا
دپتھروں اور مہروں پر یقین سماج کے اکثر لوگوں میں پایا جاتا رہا
ہے اور آج بھی اس کی مثالیں موجود ہیں ۔"

اس طرح تہذیب اور پر اسرار اشیاء کا جو ذہنی رشتہ ہے اس کی طرف
معنی خیز اشارے کر دیئے گئے ہیں اس کے وسیلہ سے زمانی رشتوں کے بارے میں بھی مزید کچھ سوچ
سوچ سکے۔ اس تہذیبی دور کے رویوں سے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"حاتم جہاں بھی جاتا ہے وہاں اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ شادی کرے
اور عیش سے زندگی بسر کرے۔ خاص طور پر کسی ایسی عورت سے شادی
کرے جو غیر معمولی طور پر حسین وجمیل ہو یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یہاں
اظہار عشق عام طور پر عورتوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور وہ خصوصیت
سے یہ چاہتی ہیں کہ حاتم ان سے شادی کرلے اس میں یہ بھی پہلو
سامنے آتا ہے کہ حاتم کی شخصیت ایک ہیرو کے ناطے غیر معمولی طور
پر جاذب نظر اور دلکش تھی۔ اس معاشرے میں سندھ و تہذیب کی روایت
یا پھر مادرانہ سوسائٹی کا اثر موجود ہے کہ شادی کی تحریک عورت کی
طرف سے ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:۔

" بادشاہ اور امیر جب، کے سامنے سر ننگا کئے ہوئے دوزانوں بیٹھے
تھے کنواری لڑکیاں اور لڑکے صف باندھے چاروں طرف کھڑے تھے
اس آدمی کے کہنے پر پہلے بادشاہ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا پھر وزیر کا
دامن پکڑا بادشاہ نے پوچھا کون ہے۔ کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا میرا رشتہ دار
ہے بادشاہ کی قدم بوسی کے اشتیاق میں بہت دور سے آیا ہے اس
توقع پر کہ اس کو اپنی غلامی میں سر بلند کرے۔ مذہب اور دین کی قبولیت
پر نقارخانہ بجنے لگا اور سیاہ رسی گلے میں ڈال کر بت کے سنگھاسن

کے آگے کھینچ کر لے گئے اور سجدہ کروا کر کھڑا کیا۔

مندروں میں دیو داسیاں تو ہوتی ہی تھیں اور جنوبی مندر میں اب تک ان کا
رواج ہے عیسائی گرجوں کی وہ عورتیں جو ہمیشہ کنواری رہتی ہیں وہ "نن" کہلاتی ہیں
وہ بھی اسی مذہبی ادارے کی یاد دلاتی ہیں بہت سی خانقاہوں میں جوان لڑکے بھی
ہوتے تھے مگر وہاں عورتوں کا کوئی دخل نہیں تھا بہر حال قبول مذہب ایک اچھا
خاصا اور اہم خوشی کا موقع ہوتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب کسی بڑی شخصیت
کی طرف سے تبدیلی مذہب کا واقعہ پیش آئے اس پر مندر میں نقارے بجنے ایک
فطری بات ہے قابل توجہ رسم گلے میں کالی رسی ڈال کر بت کے سامنے لے جانا ہے
یہ اعتراف گناہ ہوتا تھا اور اس کی صورت میں گویا اپنے آپ کو بندۂ عاجز بنا کر
پیش کیا جاتا تھا اس کا رواج اہل تصوف میں بھی رہا ہے خود قرآن پاک میں بھی
اس کا ذکر آیا ہے۔

اس پر عفت زریں نے جو تبصرہ کیا ہے اس سے اس طرح کے تہذیبی کوائف
کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور رسوم و ادب کی تہذیبی توجیہ ممکن ہو سکتی ہے بڑی
بات یہ ہے کہ انھوں نے جس روشن اور شفاف نقطہ نظر سے ان داستانوں کا تہذیبی
مطالعہ کیا اور ان کے ثقافتی پس منظر کو سمجھا ہے وہ تہذیبی مطالعے کو بڑھانے
میں ایک رہنما روشنی کا کام دے سکتا ہے۔

اب تک ہم نے داستانوں، کہانیوں اور قصّوں میں جن سچائیوں کی موجودگی
کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ایک طرح سے معروضی مطالعہ تھا یہ بھی معروضی مطالعہ
ہی ہے لیکن اس میں ایک اعتبار سے (SUBJECTIVITY) موضوعیت بھی ہے
اسے ایک ایسا آئینہ خانہ سمجھئے جس میں مختلف زاویوں سے عکس پڑتے ہیں مگر
اس میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے اور بات کو اس طرح نہیں کہا گیا ہے کہ آدھی بات
سمجھ میں آئے اور آدھی نہیں۔ کوئی بھی زبان بہت سادہ نہیں ہو سکتی اس میں
تنقیدی، تحقیقی، علمی، ادبی، ثقافتی سطح پر تہہ داریاں ہوتی ہیں اور کس زبان

میں کیا کہا گیا ہے اسے سمجھنے کیلئے اس موضوع سے دلچسپی اور بنیادی واقفیت ضروری ہے تاکہ یہ بھی سمجھ میں آئے کہ زبان کا استعمال جس سطح پر ہوا ہے جس رنگ اور جس ڈھنگ کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کا زیر بحث گفتگو اور موضوع سے بھی ایک گہرا رشتہ ہے۔

چڑے اور چڑیا کی کہانی سے لے کر طلسم ہوش ربا تک کہانیاں ایک ہی انداز سے نہیں کہی گئیں ان کو شش کر یا پڑھ کر ان سے نتیجے یا فائدے بھی ایک ہی سطح پر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی سطحیں مختلف رہیں اور صورتیں بھی مختلف رہیں گیں۔ اسی اختلافِ احوال کا عکس داستان پر اب تک جو کام ہوا ہے اور جو کام عفت زریں نے کیا ہے دونوں میں الگ الگ دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شریف احمد
ریڈر، شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

۵ ستمبر ۱۹۹۲ء

تہذیب اور ہماری داستانیں

تہذیب کے بیشتر پہلوؤں کی بازیافت داستانوں سے کی جا سکتی ہے اور ان پہلوؤں میں تہذیب کی حقیقی، ورعین واقعی عکاسی بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ داستانوں میں اس سلسلہ کی کوئی ارادی کوشش نہیں کی جاتی اور نہ ہی داستانوں کا یہ مقصد ہوتا ہے لیکن بالواسطہ انداز سے تہذیب جا بہ جا راہ پاتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے داستانوں سے ان کے زمانۂ تصنیف کی تہذیب کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ قریب قریب عوامی زندگی اور معاشرت کا ہر ایک پہلو داستانوں میں آجاتا ہے اگر کوئی کسی ایک زمانے کی تہذیبی تاریخ مرتب کرنا چاہے تو اس زمانے میں تصنیف شدہ داستانوں کا بازیافتی مطالعہ کرے اور داستانی لہجہ و بیان کے پردے ہٹائے اور تہذیب کے رخ زیبا کے خدوخال دریافت کرے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان سیاسی مقاصد اور انتظامی ضرورتوں پر مغربی ادبیات اور اس کے مطالعے کی ایک گونا گوں چھاپ موجود ہے جو حوالہ میں زاویۂ نگاہ سے دور رس نتائج کی حامل ہے۔

کسی تہذیب کے ذہنی پس منظر اور اس کے مادی ماحول کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ وہ سوچتے کیسے ہیں اور ان کی اس سوچ نے ان کے علم کو ان کے فن نے کس سانچے میں ڈھالا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر عمل میں آیا تھا۔ ان مقاصد
کی چھاپ ان کی داستانوں میں پائی جاتی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس زمانے
کی تہذیب اور معاشرتی زندگی کی کہانی بیان ہوگئی ہے کالج کے منتظمین روک بھی نہ سکتے
تھے اور اس میں انھیں کوئی حرج بھی دکھائی نہیں دیتا تھا چنانچہ اس کا بار بار پایا جانا قدرتی
بھی تھا۔ کیونکہ لکھنے والوں کی اپنی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہی تھا۔ اگر وہ نہ بھی چاہتے تو بھی
غیر شعوری طور پر یہ سب کچھ ان کی تصنیف کی جانے والی داستانوں میں آجاتا۔ غالباً یہی
سبب تھا کہ ارکان اقتدار کالج اور کالج کی کارگذاریوں سے خوش نہیں رہے اور جب
بھی انھیں کوئی بات ہاتھ آئی انھوں نے بڑی شد و مد سے اعتراضات کیے اور اس
ساری کارروائی کو دولت کی تضیع کا سبب بتایا۔ گارساں دتاسی جیسا ادب کا پرستار
اور بہی خواہ بھی اس کالج کی داستانوں میں اس عنصر کو دیکھ لیتا ہے حالانکہ اسے کمپنی سے زیادہ
ان ادبی کاوشوں سے لگاؤ تھا۔

اگرچہ اس زمانے تک کئی ایک تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں آچکی تھیں لیکن
معاشرت اور حقیقی ماہیت کا گہرا عکس اب بھی اس پر موجود تھا۔ ابھی یہاں کی تہذیب
میں اتنی کشش تھی کہ حکومت کرنے کے لیے آنے والے بھی اسے اپنانا چاہتے تھے اس لیے
ان داستانوں میں جو کالج کے لیے نصاب کی حیثیت سے لکھوائی جا رہی تھیں قدیم تہذیب
معاشرت کے بیان کو نامناسب نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ یہی وہ چیزیں تھیں جو ہندوستان
کے روح و دل میں جھانکنے کی تحریک پیدا کرتی تھیں اور ہندوستان کی اصل تصویر
دکھاتی تھیں۔ ان داستانوں سے سندھ باد کے لوگوں کو بھی اور آج کے زمانے میں ہم
لوگوں کو پتہ چلا کہ ہندوستان میں کیسے شب و روز ہوتے تھے اور لوگ کن قدروں
کے حامل رہا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے یہاں آکر حاکم کی حیثیت سے چند
برس رہنے والوں نے جیسا چاہیے تھا ویسا فائدہ اٹھایا انھیں ان سے اتنی دلچسپی
ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ماسوائے چند ایک کے۔ وہ بھیجے گئے تھے حاکم بنے رہنے کے لیے۔
اور عہدے کی میعاد پوری کرکے بہت ساری دولت بٹورنے کے بعد واپس چلے

جانے کے لیے۔ اس لیے حقیقت میں ان سے جو مقصد برآری پیش ہوئی وہ بیشتر معاملات
میں حقیقت نہیں بنی بلکہ خواب ہی رہی۔ ہوسکتا ہے اور بھی کئی وجوہ رہے ہوں۔ ان
سے کما حقہٗ یا خاطر خواہ دلچسپی نہ لیے جانے کے۔ اس کے اور دوسرے اسباب بھی تھے۔
یہ کالج اچھی خاصی مدت تک جاری نہیں رہنے دیا گیا۔ اگرچہ اس کی ضرورت رہی
لیکن اس کی جانب سے دولت کی حریص کمپنی بہادر نے آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن
اردو ادب کو اس کالج سے بڑا فائدہ پہنچا اور اردو کی نمایاں ترقی ہوئی۔ اس زمانے
میں کالج سے باہر بھی اور اس زمانے کے بعد بھی۔ اردو کے کلاسکی ادب میں جو اضافہ
اس زمانے میں ہوا کبھی نہیں ہوا۔ اس سے تہذیب اور معاشرت کے بہت سے
پہلو وقت کی گرد میں دب کر اوجھل نہیں ہوئے۔ اس سے پیشتر اردو نثر کا رویہ
بالعموم وہ تھا جسے ہم فارسی کی آرائشی نثر کہہ سکتے ہیں۔ ابوالفضل اور سہ نثر
ظہوری اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔

روایت کی پاسداری اس وقت بھی تھی جب غربت اور تنگدستی جہاں
تہاں پائی جاتی تھی یہاں تک کہ قلعہ بھی اس سے محفوظ نہ تھا۔ اس وقت کی دلی
ملک کا تہذیبی مرکز روایات اور اقدار کے سلسلے میں کیسا ہوگا اس سے اندازہ
کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس وقت کمپنی بہادر کا دور آغاز پا چکا تھا بلکہ ملک کے
بیشتر حصوں پر حاوی ہو چکا تھا۔ داستانیں تو اس تہذیب کی حامل اور عکاس ہیں
جب ہندوستانی سماج پر یہ سائے نہیں پڑنے پائے تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا
جاسکتا کہ زمانۂ تصنیف داستان ہائے فورٹ ولیم کالج کی تہذیبی پرچھائیاں بھی
بار بار پائی گئی ہونگی۔ کیونکہ ان کے مصنفین نے ان کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں اور
پرورش پائی تھی۔ سلطنت کا زوال اگرچہ اٹھارہویں صدی میں شروع ہو گیا تھا اور
انیسویں صدی میں اس پر نزاع کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے
کہ اس زمانے میں ادبی اور علمی فکر کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے اس لیے بھی کہ جس
سماج نے شاہ ولی اللہ، غالب اور سر سید کو پیدا کیا اس کی علمی، اخلاقی اور فکری

صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا حالانکہ یہ دَورِ انحطاط کی پیداوار تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ زمانہ اس عہد کی باقیات کی نشانیاں لیے ہوئے تھا جس دور نے اور جس کے بنیادی ادوار نے فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی داستانیں تصنیف کرا دی تھیں۔
اس دور کی بنیاد میں شاہ ولی اللہ کا دَور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جن کا مدرسہ علم و عرفان کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اور جن کے متعلق مولانا شبلی علم الکلام میں لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب کی نواسنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے تھے۔ اگر ہندوستان میں علوم اسلامی کی ۹۰۰ سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو کوئی عالم شاہ ولی اللہ کی علمی سرفرازی اور بلندی کا مدمقابل نظر نہیں آئے گا۔"

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین یا مترجمین زیادہ تر دہلی اور لکھنؤ جیسے شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اور کلکتہ سے ذہنی رشتہ کے باوصف اس قدیم عہد کی فضا میں رہتے ہیں جو لکھنؤ دہلی کے فکری ماحول پر ابپاروں کی طرح چھائی ہوئی ہے اور اس سے مراد زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور یہاں تک کہ بعض ایسے خاندانوں میں جنھیں معاشرتی طور پر خوش حال نہیں کہا جا سکتا ہے بیٹھکوں کا رواج تھا۔
۱۸۵۷ء تک ایک خاص طبقہ پر مغربی اثرات کی چھاپ ہونے کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کردار اور اپنی رفتار و گفتار میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ اور گویا بحیثیت مجموعی قدیم ماحول اس وقت تک قائم ہے۔
پروفیسر خلیق احمد نظامی قدیم دلی کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک امیر کی بیوہ نے اپنے لڑکے کو چاندنی چوک کی سیر کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم یہ کہہ کر دی تھی کہ اتنی رقم میں چاندنی چوک کی سیر ممکن نہیں لیکن حالات اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے۔"

اس سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ چاندنی چوک کا بازار اس زمانے میں دنیا کا سب سے زیادہ بھرا پُرا بازار تھا۔ دوسرے یہ کہ ایک لاکھ روپے اس زمانے میں

صرف سیر کے لیے بھی صرف کیے جا سکتے تھے۔ یہ لاکھ روپیہ اس زمانے کے کم سے کم دس لاکھ کے برابر تو ہوگا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ ہو۔ یہ درست ہے کہ بڑی تعداد اس توفیق کی حامل نہیں ہوگی۔ ________________ تیسرے اگر باپ ہوتا تو میر ________________ زادے کے لیے سیر کو کتنا روپیہ مناسب یا واجب سمجھا جاتا۔ بہرحال اس سے تہذیب اور معاشرت کی شستگی اور خوشگواری کا تصور کیا جا سکتا ہے اور اس کے مطابق زندگی کے دوسرے شعبوں کے خاکے بھی تصور میں لائے جا سکتے ہیں۔
اس میں ممکن ہے کوئی مبالغہ ہو کیونکہ اس میں ایک لاکھ روپیہ چاہے رؤسا کے لیے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن اقتصادی اعتبار سے اسکی بڑی قدر و قیمت تھی۔ بہرحال اس سے رؤسا کی خوشحالی اور فارغ البالی اور صاحب دولت طبقہ کی شاہ خرچی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جبکہ حالات تیزی سے بدل رہے تھے لکھنؤ کی شہری اور معاشرتی فضا میں تصنع اور تکلف کا نمایاں پہلو بعض اعتبارات سے غلو کا پہلو رکھتا ہے۔
لکھنؤ کی تہذیب بنیادی طور پر دلی کی تہذیب ہی کی ایک توسیع تھی یعنی خلوص کی بڑھی ہوئی لے اور اخلاقیات کو خصوصاً آدابِ مجلس کو سب ہی دوسرے معاملات پر سبقت حاصل تھی۔ یقیناً تکلف اور رواداری کے دبیز پردوں کے نیچے لکھنؤ میں بھی دہلی ہی یعنی دلی دربار جھانکتا ہوا پایا جاتا تھا۔ کم و بیش یہی صورت حیدرآباد میں بھی رہی دلی کے دیوان خانوں میں جو بقول مولانا ابوالکلام آزاد دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کے ترجمان تھے جہاں بعض مغرب دوست احباب جمع ہوتے تھے یہیں علمی اور ادبی افکار کی تشکیل ہوتی تھی اور یہیں فکر و نظر کے سانچے بنتے تھے۔ یہ دیوان خانے داستانوں میں پائی جانے والی تہذیب کی فکری و نظری شکل کے مرکز ہوتے تھے۔
ان کا رشتہ اس صدیوں کی تہذیب سے تھا جو داستانوں میں اپنے بعض پہلوؤں کی جھلک کے ساتھ موجود پائی جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اس آخری بزم کی جھلک دہلی کے ہر عام اور ہر امیر کے یہاں دیکھی جا سکتی تھی۔ خانقاہیں نہایت اہم تہذیبی رول ادا کرتی

تھیں جن میں شاہ غلام علی کی خانقاہ سب سے زیادہ بارونق تھی اور جس میں روم و شام، بغداد و مصر، چین اور حبش تک سے لوگ آتے تھے اور یہاں سے اپنے اپنے ملکوں کو فکر و نظر کے تحفے لے جاتے تھے۔ ان (شاہ غلام علی) کے ایک خلیفہ مولانا خالد کردی تھے جن کا مزار دمشق میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ایک دوسری خانقاہ شاہ محمد آفاقی کی تھی یہ خانقاہیں کیا تھیں اچھی خاصی عشق کی دکانیں تھیں۔ مدرسوں کا اپنا ہی انداز تھا دلی میں ان کی بڑی تعداد تھی۔ ملک کے مختلف حصے بھی علم کے مرکز تھے جو تہذیبی روایت کا تمدنی مزاج کا عکس پیش کرتے تھے۔ اگرچہ دربار کا کردار تہذیب کی نشوونما اور ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن مدرسوں اور خانقاہوں کی اہمیت اس سلسلے میں اس سے ہرگز کم نہیں تھی۔

صوفیوں اور سنتوں نے جس رواداری کو رواج دیا تھا وہ روح کی حیثیت سے تہذیب کے پیکر میں بعد کے دَور میں جاری و ساری رہی۔ یہ دونوں انہی باتوں کو مانتے تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک تھیں۔ پندرہویں سولہویں کے بزرگوں کی ہدایت و تعلیم کا یہی مقصد تھا کہ مذہبی حد بندیاں اور اختلافات ختم کر دیئے جائیں۔ مذہب اور ذات پات کے عائد کیے ہوئے سب قید و بند توڑ دیئے جائیں۔ سارے ہندوستانیوں بلکہ ساری انسانیت کا خدا ایک ہے۔ یہی تعلیم و ہدایت تھی جس کے نتیجے میں وحدت الوجود اہم اور مؤثر روحانی اور تہذیبی مرکزِ فکر ثابت ہوا ہے اور دونوں کے نزدیک میسّر ٹھہرا اکبر کا دَور تو تہذیبی اشتراک اور مذہبی رواداری کے فروغ کا عہد رہا۔ شاہجہانی دَور میں تہذیبی نقطۂ نظر کی علامت شہزادہ دارا شکوہ قرار دیا گیا۔ اور یہ خیال مسلّمہ حیثیت اختیار کیے رہا کہ اسلام مذہب اور ہندومت دونوں اپنے حقیقی مفہوم اور روح معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔

رواداری اور تہذیبی اشتراک کے جذبے کو اورنگ زیب کے زمانے میں چاہے اس کی ملکی مصلحتوں کے سبب چاہے کسی اور وجہ سے شدید زک پہنچی پھر سلطنت کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ اگرچہ اس نے بہت سی رواداریاں بھی دوسرے فرقے والوں سے برتیں اور ان کی عبادت گاہوں کو تعمیر کرایا۔ مگر وہ جذبہ اس طرح سے پھر سارے مغلیہ دَور میں پیدا نہیں ہوا۔

یہ درست ہے کہ بعد میں کئی بادشاہوں نے اس جذبے کے احیاء کی کوشش کی اور انھوں نے علمی تعاون بھی دیا۔ "عہد محمد شاہی میں شاہ جہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں" میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب اس دور کے تہذیبی آثار کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کا سب سے قوی محرک وہ مذاق سخن ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچرل اشتراک نے رسوم و آداب کے ساتھ دہلی کے ذہنی افق پر قوس قزح کی طرح اُبھار دیا تھا۔"

اس بات کو ڈاکٹر موصوف نے اس مضمون میں ذرا اور وضاحت سے لکھا ہے اور اس کے سرچشمے کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد کے ان فقروں کا حوالہ دیا ہے۔

"یہ عہد جوہر انسانیت جو پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا تھا وہ فقرا کے شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آ گیا تھا۔ شاہنامے کے ڈھنگ میں نہ آیا تھا۔"

اس وقت کی دہلی کو عاقبت سے زیادہ عیش امروز سے لگاؤ تھا اور یہی تصور اس وقت کی دہلی کو عزیز تھا۔ لیکن دہلی اس دَور میں بھی ایسی غیر معمولی اور عظیم شخصیتوں سے خالی نہیں تھی جنھوں نے عاقبت کی یاد دلائے رکھی۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہی تھی جیسے مرزا بیدلؔ نے جو اس دَور کی نمائندہ شخصیت اور فقر دوست شاعر تھے۔

آخری مغل بادشاہ کی دلی تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اکبر اور شاہجہاں کی دلی نہیں ہوئی تھی اور بہادر شاہ ظفر کی رواداری اور تہذیبی اشتراک کی اور کوئی مثال نہیں دکھائی دیتی اگرچہ بادشاہت ایک زمانے سے صرف نام کی بادشاہت رہ گئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی تہذیبی مرکزیت برقرار رکھی تھی۔

ان داستانوں کے کردار ان کے مقاصد کی بنا پر قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ ایک مقصد تو یہی پیش نظر رکھا گیا کہ نیکی بدی پر آخر میں فتحمند ہوتی ہے۔ نیکی کی فطرت اور سیرت رکھنے والے کردار ویسے ہی ہو سکتے ہیں جیسے اس خصوصیت کے سبب ہونے چاہئیں۔ باغ و بہار تو

لکھی ہی گئی تھی حضرت نظام الدین اولیاء کی ان دنوں طبیعت بہلانے کے لیے جن دنوں وہ علیل رہے تھے۔ اس سے دو مقصد تو یہاں پہلی نظر ہی میں خیال میں آتے ہیں۔ ایک تو فرحت بخشی، فرحت بخشی بھی بے مقصد نہیں بلکہ بالمقصد۔ دوسرا مقصد حضرت جیسی شخصیت کے حضور میں جیسی داستان پیش کی جانی چاہیے اس کی خصوصیات آسانی سے تصور میں لائی جاسکتی ہیں۔ کوئی بیہودہ داستان تو انھیں پیش ہی نہیں کی جاسکتی تھی وہ داستان ہی پیش کرنا لازم تھی جن میں ان کے اپنے شعار کردار اور تعلیمات کا عکس موجود ہو۔

چونکہ یہ داستانیں نصاب کے لیے لکھوائی جاتی تھیں اس لیے بنیادی مقصد تو حکومت وقت کا مفاد رہا۔ اس لیے فورٹ ولیم کالج کے لیے کوئی ایسی داستان نہیں لکھوائی جاسکتی تھی جو کسی پہلو سے حکومت کے مفاد کے منافی ہوتی۔ اور یہ کہ انھیں پڑھنے والے اور یہاں حکومت کرنے کے لیے انگلستان سے آنے والے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس ملک کو بھی سمجھیں اور اس کے لوگوں کو بھی جانیں۔ ان کی پسند و ناپسند سے واقف ہوں۔ ان کے طور طریقوں سے بے خبر نہ رہیں اور ان کے دلوں کو ایک حد تک ہاتھ میں لیں۔ ورنہ حکومت کی پائیداری مشتبہ ٹھہرتی۔ اور ان کا تجارتی مقصد جو بڑا اہم مقصد تھا جس لیے وہ ہندوستان آئے تھے۔ جس کے بعد وہ آسانی سے حکمراں بن سکے۔

حالانکہ ڈاکٹر گلکرسٹ صرف چار سال اس کالج میں رہے مگر ان کے جانشینوں نے ان کا کام جاری رکھا۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ان جیسی لگن اور لگاؤ والا نہیں تھا۔ وہ تو ہندوستان کی زبانوں اور ان کے ادب کے اپنی قسم کے والا و شیدا تھے اور اپنی جیب سے بھی خرچ کرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ یہی لگن تھی کہ انھوں نے انگلستان واپس جاکر بھی اپنے کام کو جاری رکھا۔ (۵۰)

اس کا مقصد کالج اور کالج سے شائع ہونے والی کتابوں کا جن میں اکثریت داستانوں کی تھی یہی تھا کہ ان کے ذریعے انگلستان سے حکمرانی کے کاموں کے لیے آنے

والوں کو ہندوستان اور ہندوستان کے بارے میں بتایا جائے اور انھیں یہاں کے لوگوں کی فطرت اور سیرت کی تصویریں دکھائی جائیں تاکہ ان لوگوں سے حکومت کے استحکام میں تعاون حاصل کیا جاسکے اور تجارت کو بے فروغ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ داستانوں کے محرکات کیا تھے۔ کیونکہ داستان زندگی اور اس کی حقیقت سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے اس کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے شروع میں ہوئی جبکہ پورا معاشرہ ایک عجیب بے بسی کا شکار ہو گیا تھا اور علمی زندگی سے بے گانگی عام ہو گئی تھی اس لیے تخیل کی دنیا میں سکون کی تلاش کی گئی عوام و خواص دونوں نے اس دنیا میں پناہ لی اور داستان اٹھارہویں صدی کے اختتام تک عروج کو پہنچنے لگتی ہے۔ زندگی سے فرار اور سکون کی تلاش داستان کا ایک پہلو ہیں۔ اس میں ان کے علاوہ کچھ بھی ہوتا ہے۔ اس کچھ اور کے احاطے میں اخلاق، انسانیت، فیاضی، دوستی، محبت، ہمدردی، جرائت مندی، شجاعت اور نیکی کے لیے تحریک اور ترغیب بھی پائی جاتی ہے اور ہمیں معاشرت کے عہد بہ عہد حالات سے آشنائی ہوتی ہے۔ رہن سہن کے طور و طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ لباس اور زیورات کی قسموں کا پتہ چلتا ہے جنھیں زمانہ بدل جانے کے سبب جاننا دشوار ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کی رسمیں، مشروبات اور طعامات کے انواع، آلات اور اسلحہ جات، لشکری تنظیم اور اس کی مختلف مہمیں جو پہلے ہی کے زمانوں میں ہوتی تھیں۔ جلسے جلوس کے اہتمامات تہوار اور عقیدے یا اور بہت سی دوسری معلومات داستان ہی کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔

داستانیں تخیلی اور تصوراتی ہی سہی، یہ تخیل اور تصور کے کارنامے بھلے ہی ہوں لیکن یہ ماضی کی یاد دلاکر موجودہ پست دلی کو کسی حد تک دور کرنے میں مدد دیتی ہیں اور علمی زندگی اور حقیقی جد و جہد میں حصہ لینے پر ابھارتی ہیں۔ جب ان میں بیان کیے ہوئے شاندار حالات و کوائف سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ اگر ہم داستان کے نشے کی پینک میں جھولتے ہی نہ رہیں اور اپنے سے پہلے ادوار میں مہمات اور ان کے نتائج پر غور بھی کریں۔ یہ سمجھ لینا غالباً درست ہی نہیں کہ داستان زندگی سے فرار ہے اور زندگی سے فرار ہی پر راضی اور مطمئن رکھتی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کی داستانیں داستانوں کے عہد کے دوسرے حصے سے متعلق ہیں۔ پہلا حصہ سب رس سے شروع ہوکر میر عطا حسین تحسین کی نو طرز مرصع پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصے کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ باغ و بہار اور اس کے اسٹائل سے متعلق ہے اور دوسرا رخ فسانۂ عجائب اور اس کے نوع کی داستانوں سے۔ پہلے رخ کی داستانوں کا انداز نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم ہے اس میں فورٹ ولیم کالج کا بڑا حصہ ہے اور اس کا اثر بڑے پیمانے پر کالج سے باہر بھی ہوا۔ اس حصے کی داستانوں پر اپنی ________ زبان و بیان اور انداز و اسلوب کا اثر ہے۔ اس تیسرے حصے کی داستانوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اس میں سب آرزوئیں حقیقت بنتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ تسخیر کائنات کی بات ہوتی ہے اور مزاحمتوں پر غالب آنے کی تحریک پائی جاتی ہے اور حق کی جانب مائل ہونے کی ترغیب ملتی ہے۔ کیونکہ ان داستانوں میں آخر فتح حق کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بڑی تعداد میں لوگ خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے رہنے کے لیے داستانوں سے دلچسپی لیتے رہے۔ اور اس کے افادی پہلوؤں سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس نے شاندار ماضی کی تصویر دکھائی اور بزرگوں کے مشوروں نے ________ تحریک و ترغیب کی صورت پیدا کی۔

عام طور پر داستانیں عملی زندگی کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتی ہیں جن میں عیش و عشرت کی فراوانی ہے۔ جرأت، ہمت، شجاعت اور مردانگی کے بدلے ابدی سکون و راحت کا انعام ہے۔ مروت، محبت اور دردمندی کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی محنت کوشش کے بدلے دائمی راحت ہے۔ اس نوع کی داستانوں کو وقار عظیم صاحب مختصر کہانیوں کا نام دیتے ہیں اس لیے کہ ان کی نمایاں خصوصیت ان کا اختصار ہے اور لکھنے والوں کی نظر دلچسپی مہیا کرنے سے زیادہ کسی نہ کسی اخلاقی مقصد کے قصوں کی طرف ہے۔ ان میں فورٹ ولیم کالج کی خرد افروز" "اخلاق ہندی" "طوطا کہانی" "بیتال پچیسی" "سنگھاسن بتیسی" "باغ اردو" کو شامل کرتے ہیں۔ چونکہ سب ہی داستانیں (مختصر کہانیاں) مختلف مراحل طے کرتی ہوئی سنسکرت سے فارسی اور اردو میں آئیں۔ قدیم ترین کہانی کا مجموعہ ۸۰۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ اس میں موجود کہانیاں ہندوستان میں جانوروں سے متعلق لکھی

ہوئی کہانیوں میں سب سے زیادہ پرانی ہیں۔ یہ اپنشد سے آئی ہیں۔ کہانیوں کا دوسرا قدیم خزانہ مہابھارت ہے۔ اس کی کہانیاں اخلاقی نکات کی وضاحت کرتی ہیں۔ کہانیاں جو مہاتما بدھ سے منسوب ہیں ۵۰۰ قبل مسیح کے زمانے کی ہیں پنچ تنتر (۲۰۰ ق م۔ ۲۰۰ ق م) ہتوپدیش (۸۰۰ء) کتھا ساگر، اور بیتال پچیسی کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔(۵۵) چونکہ فورٹ ولیم کالج کی سب داستانیں باغ اردو کو چھوڑکر جو گلستان سے متعلق ہے سنسکرت سے آئی ہیں۔ یہی سبب ہے ان کے اسلوب فکر اور انداز تخیل پر قدیم ہندوستانی تہذیب اور معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی گہری اور واضح پرچھائیاں پڑتی ہیں۔ اگرچہ لکھنے والے یعنی ترجمہ کرنے والے کے مزاج اور مذاق سے کچھ نہ کچھ فرق وارد ہوجاتا ہے۔ لیکن ہر ایک داستان کے پیچھے اخلاقی مقصد کی ایک لہر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اخلاق ہندی، خرد افروز، اور گنج خوبی میں یہی اخلاقی احساس کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مترجموں نے بھی ان کی تمہید میں اس حقیقت کی وضاحت کی ہے۔

ان سب مترجموں کی تالیف کا مقصد اخلاقی ہے۔ یہ سب ترجمے بقول حسینی سلیس ریختہ میں اور بقول حیدر بخش حیدری زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوئے معلی کی نثر میں موافق عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب منتقل کیے گئے۔

(ص۔ ۵۰۔ داستان سے افسانہ تک)

ان داستانوں کے مجموعوں کے محرکات اخلاقی قدریں، پند و نصیحت، انسانیت، اور رواداری اور اشرف المخلوقات ہونے کا احساس تھے۔ ان کے معمولات جن، دیو، پری، شیاطین، ارواح خبیثہ، سحر و طلسم، جنتر منتر، گنڈا، تعویذ، اسم اعظم وغیرہ ہندوستان کے عقائد میں سے ہیں۔ ان کو یہاں کی زندگی سے غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ زندگی ہی اس زمانے میں کچھ ایسی تلخ تھی کہ یہ وا ہمے عقیدوں کی حیثیت اختیار کرچکے تھے اور تہذیب اور معاشرت ہی کے ایک پہلو کو دکھاتے تھے۔ اس صورت حال کو علی عباس حسینی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

"ہمیں یہ تسلیم ہے کہ داستان گو نے اپنی قوت تخلیق کے ذریعہ ہمارے لیے ایک

ایسا طلسماتی عالم تیار کر دیا ہے جو ہماری دکھوں سے بھری دنیا سے بالکل الگ چیز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ معترضین کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا قصہ بالکل خلا میں نہیں پیدا ہوا۔ داستان گو اس دنیا میں پیدا ہوا اور اس نے الفاظ اس دنیا کے استعمال کیے ہیں ـــــ ـــــ ہر تصنیف میں اس معاشرت کی تصویر بھی کھنچ گئی ہے جس میں اس کا مصنف ہزار داستان فریادی تھی۔" (ص۔ ۱۶۹۔ ناول کی تاریخ و تنقید)

تہذیب و معاشرت کے جن پہلوؤں پر داستان گو کی نظر رہتی تھی جو شعوری یا نیم شعوری ان کی داستان میں در آتے تھے ان کے متعلق حسینی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

دہلوی داستان گو اپنی داستانیں دہلی کے دربار کے ماحول سے سجاتا ہے اور اس معاشرت کا نمونہ پیش کرتا ہے جو قلعہ معلیٰ میں رائج تھی۔ لکھنؤ کا داستان گو جب سماں کھینچتا ہے تو ہم نوابین اودھ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں کے ہاں وہی آداب شاہی ہوتا ہے وہی طمطراق، وہی شان و شکوہ، وہی آن بان، وہی سیر و تفریح، وہی عیش و عشرت، وہی تعلق و سخن طرازی جو اس وقت کے درباروں کی خصوصیت تھی۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی بہو بیٹیوں سے عشق نہیں کراتا بلکہ غیر قوموں کی بے پردہ، آوارہ عورتوں سے اس کے نزدیک پردے میں بیٹھنے والیاں اتنی عزت مآب ہوتی تھیں کہ ان کا ذکر رومانوں میں ناممکن تھا۔ وہ معشوق کو مذکر بنا کر امرد پرستی کا الزام اپنے سر اوڑھ سکتا تھا لیکن وہ اپنی خواتین کا ذکر کر کے بے حیائی کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ ان تمام امور کے باوجود تقشف کا بھی ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ کھیل ہو، خواہ مذاق، تفریح ہو خواہ تفنن ہو ان کا ۔۔۔ نزد شرع مبین میں آنا اس کے نزدیک ضروری تھا۔ البتہ اگر وہ کسی غیر مسلم کے سامنے قصہ کہتا یا داستان سناتا تھا تو وہ ایسے موضوعات ہی سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ اپنے سامع اور ناظر کو اس کے اسلاف کے خیالی کارنامے سنا کر خوش کرنا اور اس کی زخم خوردہ خودداری کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا۔

(ص ۱۷۰/۱۶۹۔ ناول کی تاریخ و تنقید)

جیسا کہ علی عباس حسینی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے دہلی یا لکھنؤ کا داستان گو

اور قصہ نگار اس ماحول اور تہذیبی فضا کو پیش کرتا تھا جس میں وہ خود سانس لیتا تھا اور جس کے تمدن آداب و رسوم اس کے فکر و خیال کی دنیا میں موجود رہتے تھے اور اس کی تخلیقی حِس پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس دَور کے شاعروں، مصوروں اور صناعوں کی طرح اس کی تخلیقی حمیت بھی مبالغے سے اپنے فن پارے کے خدوخال کو سجاتی تھی اور اس کی زبان و بیان میں نت نئے گل بوٹے کھلاتی تھی۔ حسینی صاحب نے آگے چل کر داستان گو کے تصورِ عشق اور ان معاملات حسن و محبت کے بارے میں بھی لکھا ہے جن کو داستان نگار اپنے قصے کی فنی حدود میں لازمی طور پر شامل رکھتا تھا اور اپنے سامع یا قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرتا تھا۔

حسینی صاحب نے یہ بیان بہت رواداری میں قلم بند کیا ہے۔ داستانوں کے ہیرو جن خواتین سے عشق کرتے نظر آتے ہیں وہ سب آوارہ گرد عورتیں نہیں ہیں غیر علاقوں اور غیر ملکوں کی عورتیں ضرور ہیں۔ اس کی بڑی وجہ مہم جوئی کا تصور ہے اور شہزادے کی داستان ہائے عشق میں بھی وہ اس کو شامل رکھنا چاہتے ہیں بلکہ بہت سی مہمات تو صرف عورتوں کے حصول کے لیے پیش آتی تھیں۔ امرد پرستانہ رجحان اس وقت موجود طوائفوں سے عشق کیا جاتا ہے۔ اپنے اندرونی محل کی باندیوں اور کنیزوں سے محبت کی جاتی اور دوسرے علاقوں اور ملکوں کی شہزادیوں اور وزیر زادیوں کے لیے مہمات سر کی جاتی تھیں۔ اس پوری بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے ان میں کسی بات کی حمایت یا غیر ضروری تاویل ایک غیر علمی طریقہ رسائی ہے تاہم حسینی صاحب کی اس تنقیدی نظر سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ داستان اور اس کے تہذیبی ماحول سے ایک حقیقی اور واقعاتی رشتہ ضرور ہوتا ہے چاہے وہ قریب کا ہو یا دور کا۔

داستان تک معاشرت کے صرف انہیں پہلوؤں نے رسائی حاصل کی جن پہلوؤں کو بیشتر سماجی فرقوں نے معیار کی حیثیت دیدی تھی۔ ایسے ہی پہلوؤں کے پسندیدہ اور مقبول عناصر ملکی اور قومی تہذیب کو ترتیب دیتے ہیں ملک اور قوم کی سطح پر پسندیدہ ہو جانے والے معیار قومی اور ملکی تہذیب کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جن سے انحراف یا

جن کی نفی غیر مہذب ہونے کا نام دیتی ہے۔ چونکہ ادب کی کوئی بھی صنف خصوصاً وہ جن کی عوام اور خواص تک یکساں رسائی ہوتی ہے کوئی ایسی بات اپنا حصّہ بنانے کے لئے قبول نہیں کرتی جو ایک معیاری حیثیت اختیار نہ کرے۔ اس معیاری حیثیت کے بلاشبہ کئی درجے ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ اعلیٰ اور ارفع درجہ قومی اور ملکی سطح پر آتا ہے۔ اس سے نیچے کئی درجے ہوتے ہیں۔ سب سے نیچے کا درجہ ایک گروہ یا قبیلے کی سطح پر آتا ہے یا علاقے کی سطح بھی اس کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے درمیانی درجے کئی ایک ہیں۔ وسعت اور اشاعت کے مطابق ہی ہر ایک کی سند تسلیم کی جاتی ہے۔ داستان میں ان میں سے بیشتر درجوں کے پائے جانے کا امکان ہوتا ہے۔

مالی حیثیت کی نسبت سے ایک ملک گیر اور ایک قوم پسند تہذیب میں فرق سماج کے مختلف طبقات میں رہتا ہے لیکن بنیادی طور سے کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ بعض تقریبات پیدائش سے موت تک کئی موقعوں پر ہوتی ہیں۔ اعلیٰ طبقے میں بھی اور سب سے نچلے طبقے میں بھی۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ ایک جگہ شان و شوکت اور کر و فر اپنے عروج پر ہوتا ہے اور دوسری جگہ سب سے نیچے کی سطح پر مگر دل دونوں طبقوں میں یکساں طور پر نشاط سے مخمور ہوتے ہیں اور کسی ایک طبقے کو کم سرور یا کم سرشاری نہیں ہوتی۔

وہ سماجی ادارے جو تہذیبی روشوں میں انضباط کا موجب ہوتے ہیں اور جن کی تصدیق سے یہ روشن تہذیب اور قدر کی سندیں حاصل کرتی ہیں دربار، مدرسے یا خانقاہیں اور بازار ہیں۔ یہی تہذیبی ماحول کے مظاہر قرار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں سے ایک خاص طرح کی فضا بنتی ہے جس میں ایک مخصوص طرح کی تہذیب، تعمیر اور تشکیل کے مراحل طے کرتے ہوئے پروان چڑھتی ہے۔ یہ ادارے ہی اپنی اپنی داخلی قوت اور خارجی کشش کے مطابق تہذیب کو سنوارتے اور نکھارتے ہیں اور تہذیب کو ان غیر سماجی عناصر سے بچاتے ہیں جو تہذیب کو ایک ایسا جیتا جاگتا مرقع بنا دیتے ہیں جن میں رواداری، ایثار، تنگ نظری، خود غرضی، حق طلبی، محبت، نفرت، وہم اور خیال سبھی کچھ ہوتا ہے۔ غرض پوری انسانی زندگی متحرک نظر آتی ہے۔

اس سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج ہماری ادبی اور معاشرتی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے کہ اس نے علم اور ادب کے وسیلے سے ہمارے ذہنوں کو بدلنے کے ایک لمبے طریقۂ عمل کی ابتدا کی اور ابتدائی سطح پر تاریخ کے لئے رجحانات اور تقاضوں سے آگاہ کیا لیکن ایسا نہیں ہے کہ داستانوں کے تمام تر خدوخال یا فکری تانا بانا اس لئے انداز نظر نے تیار کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں کہیں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ فکر و عقائد سے ہمارا ذہنی رشتہ منقطع ہوگیا۔ مذہب اور سماج کے مختلف اداروں کو ہم کل تک جس انداز سے مانتے تھے آج کا ذہن اس انداز سے نہیں مانتا اس میں بہت کچھ تبدیلی آگئی ہے اور آتی رہے گی اس تبدیلی کو بھی ہم معاشرتی ماحول ہی کا ایک حصّہ قرار دیتے ہیں۔

فورٹ ولیم کی داستانوں کا مطالعہ دراصل ان مشرقی روایات اور وسطی عہد کے اس تہذیبی ماحول کا مطالعہ ہے جو اس وقت تک اپنے پورے آب و رنگ کے ساتھ موجود تھا۔ ان داستانوں کے ترجمہ کرنے والے یا اس کے تالیف کرنے والے ہندوستانی ہی تھے جو لاہور، دہلی، لکھنؤ اور ایسے ہی دوسرے ہندوستانی مقاموں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک رہنما کی حیثیت سے کام کرنے والے رنگوں کے نقطۂ نظر سے واقف ہیں۔ یہ تو ممکن ہے لیکن ان کا فکر و خیال مغربین کے اندازِ نظر اور طریقۂ رسائی کے سانچے میں ڈھل گیا ہو اس کا امکان بہت کم ہے۔

اس دور کی تہذیب یا کسی دوسرے دور کی تہذیب ہی سے جڑی ہوئی ہے۔ جو مختلف ادوار میں مختلف انداز کی تبدیلیاں قبول و رد کرتی ہوئی اس دور تک پہنچی ہے۔ یہ تبدیلیاں زندگی کے ہر پہلو میں واقع ہوئی ہیں۔ ملبوسات میں، زیورات میں، ظروف و آلات میں، سامانِ آرائش و زیبائش میں، آداب و رسوم میں اور جنگ و جدل کے طریقے اور اس کے اثرات مابعد اور اس کی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں۔ ہر دور کے مطالبے اور تقاضے کی تعمیل میں۔ کبھی پچھلے ادوار کی تبدیلیاں برقرار ہیں، کبھی ان میں کسی قدر ترمیم و تنسیخ ہوئی اور کبھی یہ یکسر بدل گئیں۔ دوام روحانی اور اخلاقی

اقدار ہی کو حاصل رہا۔ معاشرتی اقدار تغیر پذیر ہوتی رہیں لیکن ان میں اخلاقیات سے کسی وقت بھی آنکھیں بند نہیں کی گئیں۔ کیونکہ ہندوستانی زندگی کی مانند معاشرت کی بنیاد میں بھی روحانیت پڑی ہوئی تھی۔ اور یہی روحانیت ہر دور میں خانقاہ کے فروغ کی موجب ہوئی اور خانقاہ کا معاشرت پر ہی نہیں زندگی کے قریب قریب ہر شعبے پر اثر پڑا۔ بعض اعتبارات سے خانقاہ کا رول دربار سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ کسی دور میں خانقاہی آداب و اقدار دربار پر غالب آتے رہے لیکن ایسا کسی دور میں نہیں ہوا کہ دربار خانقاہ پر اثر انداز ہوا ہو۔ اس حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیشتر دربار تہذیب کا مرکزی کردار رہا ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہی ہے کہ خانقاہ نے دربار کی نمود و نمائش اور ظاہر پسندی کو تہذیب کے خد و خال بگاڑنے سے بڑی حد تک روکے رکھا۔ اس کی مثالوں سے تاریخ بھی بھری ہوئی ہے اور داستانیں بھی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ہر ایک داستان میں درویش کا وجود اہم قرار دیا جاتا رہا ہے اور درویش، بادشاہ، امیر، غریب یعنی ہر طبقے کی امیدوں کا مرکز بنا رہا۔ اور لوگوں کے لئے قابلِ احترام رہا۔

جہاں تک ہندوستان کی معاشرت کا سوال ہے اس میں ہم تغیر کے عمل کو جاری اور ساری دیکھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بنیادی طور پر اس کی روحانی قدریں، اخلاقی روایتیں اور تہذیبی شعور کی مختلف حیثیتیں برابر اس کے ساتھ چلتی رہیں۔

دربار اور خانقاہ کے بعد تہذیب کی آئینہ داری بازار کی فضا میں پائی جاتی ہے یہی تہذیب و معاشرت کا نہایت اہم اور موثر جزو ہے اس لئے کہ خرید و فروخت، دستکاری اور صناعی دولت و ثروت نمود و نمائش کا ایک مرحلہ ہے اس لئے اپنی حد تک اسے بھی تہذیب کے عوامل میں مرکزیت کی حیثیت حاصل ہے اور ان سے گذر کر زندگی کی ضروریات کی بہت سی چیزیں بازار کے وسیلے سے ہی مہیا ہوتی ہیں۔ خانقاہ، دربار، مدرسہ، گھر یا تکیہ کوئی بھی تہذیبی واحدہ ان کے درمیان قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے وہ بازار ہے۔ دوسرا دربار مدرسے اور خانقاہ سے

گذر کر ہم جس مرکزی دائرے کی طرف آتے ہیں وہ گھر ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ تہذیب کا پہلا مرحلہ تو گھر ہی ہے اس کے بعد ذہنوں پر تہذیب کے نقش و نگار مدرسے میں ابھرتے ہیں۔ ان دونوں ابتدائی مرحلوں کے بعد ہی دوسرے مرحلے آتے ہیں۔ یہی دونوں مرحلے تعلیم و تربیت کے لئے موثر اور کارگر ہوتے ہیں۔ تہذیب کا نقش اول یہیں مرتب ہوتا ہے۔ یہی تہذیب کی خشت اول ہے۔ بازار تو دربار اور خانقاہ کی طرح نوک پلک سنوارنے والا ہوتا ہے۔ یہیں خامیوں کا پتہ چلتا ہے اور آدمی اپنا تہذیبی تجزیہ کرنے پر متوجہ ہوتا ہے کیونکہ یہاں ہر ایک عمل اور ہر ایک کیفیت مہذب شکل میں پائی جاتی ہے۔ یہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ملک اور قوم کی تہذیب کس قدر پسندیدہ اور دل پذیر ہے۔ کسی تہذیب کے خد و خال کو نمایاں ہوتے اور اس سے متعلق زندگی اور ذہن کو ترتیب پاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

غرضیکہ داستانوں میں پائی جانے والی تہذیب کے ہر ایک مرحلے میں جاگیردارانہ نظام کا عمل دخل پایا جانا یقینی ہے اور اس نظام کے متعلقات و لوازمات کی گہری چھاپ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ ہندوستان میں صدیوں سے جاگیردارانہ نظام رہا ہے۔ غالباً زمانۂ تاریخ سے پہلے ہی سے۔ اگرچہ روپ بدلتا رہا۔ کبھی کچھ ہوا اور کبھی کچھ۔ لیکن رہا بنیادی طور پر جاگیردارانہ نظام ہی۔ اس لئے تہذیب کے سب ہی عناصر جاگیردارانہ ہی رہے۔ کیا دربار، کیا مدرسہ، کیا بازار، کیا گھریلو زندگی اور اس کے معاملات۔ تہواروں میں بھی اس کے رنگ ڈھنگ پائے جاتے ہیں۔ عوام تو ہمیشہ سے سامعین اور رونق بڑھانے والوں میں شمار رہے ہیں۔ خانقاہ بہت کچھ اس کے اثرات سے بچی رہی لیکن اس کے سلسلۂ عمل دخل سے یہ بھی خالی نہیں رہے۔ نچلے طبقے یعنی عوام کی بھی اپنی تہذیب ہوتی ہے اور وہ اپنے طور پر اپنے تہذیبی اور معاشرتی معاملات کے زیر اثر زندگی گذارتے ہیں۔

دوسرے ملکوں سے رابطے کا بھی داستانوں سے پتہ چلتا ہے۔ یہ رابطے

انجانے زمانے سے ہیں۔ داستانوں میں مشرق وسطیٰ کے ممالک اور ترکی اور روس کا ذکر آتا ہے۔ گاہ تجارت کے مقصد سے گاہ کسی اور امر کے پیشِ نظر۔ کبھی کبھی اس کا معرکۂ عشق بھی ہوتا ہے۔ داستانوں سے ان مختلف النوع سفروں پر روشنی پڑتی ہے اور دوسرے ملکوں کی تہذیبوں کا ذکر ملتا ہے۔ جن کا ایک زمانے سے ہمارے ملک کی تہذیب سے لین دین رہا ہے جس کی تاریخ بھی شاہد ہے۔ لیکن مختلف ملکوں کے مابین تہذیبی رشتوں کو بیدار کرتے ہیں سب سے زیادہ حصّہ تجارت پیشہ طبقے نے لیا ہے۔ اس کا تعلق قدیم زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک تاریخ اور تہذیب کے مختلف دھاروں سے رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ بازار، صنعت اور تجارت ہمیشہ سے اس کا ایک اہم حصہ اور ایک کارفرما عنصر ہے۔

تہذیب اور معاشرت کی بہت سی باتیں داستانوں میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ انھیں محض تصورات کی پیداوار طلسم و وہم خیال کہہ دینا کافی نہیں۔ یہ باتیں اس لیے بھی بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کا ذکر تاریخ میں کسی نہ کسی وجہ سے نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ تہذیب و معاشرت کے نہایت اہم اجزا ہیں۔ کچھ تکلف اور تصنع کے پردے جو ان پر آ پڑے ہیں انھیں آسانی سے ہٹایا جا سکتا ہے اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کے بغیر تہذیب کا تصور نامکمل ہی رہتا ہے۔ اگرچہ یہ فروعات ہی ہیں لیکن ان کی اہمیت ———— داستانوں میں آئے ہوئے تہذیبی اور معاشرتی امور کو کم تر غیر اہم یا کم اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔

تہذیب کے ذیلی مظاہر کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس طویل فہرست میں آدابِ مجلس سے لے کر بھانڈوں کے تماشوں اور راس، نوٹنکی اور سوانگ تک شامل ہیں۔ یعنی اس دور کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا سماجی پہلو ہو جو اس ذیل میں نہ آ جاتا ہو۔ جسمانی طاقتوں کی نمائش کے میلے جن میں کشتی کے دنگل، دوڑ کے مقابلے، اور وزن اٹھانے کے مظاہرے شامل تھے۔ اس وقت بھی عام تھے اور آج بھی عام ہیں۔ آج کم اس وقت زیادہ۔ آج کے تو ہر معاملے پر شہریت کا

رنگ غالب آتا جا رہا ہے۔ اس وقت شہریت پر اتنا زیادہ تکلف اور تصنع کا جادو نہیں چلا تھا اگرچہ دیہات اور شہر میں نمایاں فرق تھا۔

غرض کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں داستان کے کسی بھی پہلو میں جاگیردارانہ نظام کے اثرات کا کسی نہ کسی نوعیت سے موجود ہونا اور پایا جانا ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دربار سے خانقاہ تک، خانقاہ سے بازار تک اور بازار سے گھر تک اس کا رنگ اور دائرہ کچھ اس طرح بدلتا ہے جیسے ہم دھنک کے رنگوں کو دائرہ افق کی تشکیل میں حصہ لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

حوالہ جات باب اول

۱۔ اسلام اور معاشرتی سیاسی اور معاشی نظریات کا تاریخی و تقابلی مطالعہ۔
مصنف چودھری غلام رسول ایم۔ اے۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ The Columbia Encyclopedia Third Edition 1963 Page 521

۵۔ The Columbia Encyclopedia Third Edition 1963 Page 521

۶۔ Rafai, bring out of Babarism.

۷۔ Cultivating State of manners taste and intellectual development at a time or place.

۸۔ Page 825 Encyclopedia Britanica

۹۔ اسلام اور معاشرتی سیاسی اور معاشی نظریات کا تاریخی اور تقابلی مطالعہ۔
مصنف چودھری غلام رسول ایم۔ اے

۱۰۔ Page 409 New Oxford Illustrated Vol I Dictionary

۱۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ نیا ایڈیشن ۸/۴۵۹

۱۲۔ ایضاً ۸/۴۴۷

۱۳۔ ایضاً ۸/۴۹۱

۱۴۔ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ نیا ایڈیشن ۸/۴۴۷

۱۵۔ ۴ مئی ۱۸۰۰ء (۷ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ) کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ (ص ۸۱۔ داستان تاریخ اردو) کالج کی یہ خدمات کم و بیش ۲۰ برس جاری رہیں اور اس عرصے میں مصنفوں نے ۵۰ کتابیں اردو میں تصنیف و تالیف کیں۔ ص ۱۴۰۔ ایضاً

۱۶ Foundation of Prior to innertittle Indian Culture (P2K.M. Munshi)

۱۷ Foundation of Prior to innertittle Indian Culture (P2K.M. Munshi)

۱۸۔ شاہ جہاں آباد کو جس خطۂ زمین پر بنایا اور بسایا گیا وہ اس سرزمین ہی کا ایک حصہ تھا جہاں ہندوستان کے وسطی عہد کی تاریخ میں جنم لینے والے تہذیبی انقلاب نے اپنی نمو پذیری اور شگفتگی کے بہت سے مراحل طے کئے تھے (شاہجہاں آباد ایک تہذیبی روایت) ڈاکٹر تنویر احمد علوی) شاہ جہاں آباد نمبر فکر نو۔

۱۹۔ شاہ جہاں آباد نمبر فکر نو۔ "مدارس" صاحب درس

۲۰۔ علم و فن کی روایتوں کے امین مدرسے اور پر تقدس خانقاہیں اس تمدنی مزاج اور تہذیبی روایت کا عکس پیش کرتے ہیں جس نے اس کی محراب زندگی کو قوس قزح کے نیم دائرہ کی طرح ہفت رنگ بنا دیا تھا۔ (شاہ جہاں آباد ایک تہذیبی روایت) ایضاً

۲۱۔ پانڈوؤں نے ہند کی تاریخ میں ایک سپاہانہ کردار خدمت خلق قربانی و ایثار کی جو مثال پیش کی ہے اس نے مہابھارت اور دوسری کتھاؤں اور کہانیوں کے ذریعے پیش کیا اور اس وطن کی تہذیبی روح کو زندہ رکھا۔ (ایضاً)

۲۲۔ وہ (نظام الدین اولیا) عام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ عقائد و نظریات کے اختلاف انسانی برادری کے اشتراکی رشتے پر اثر انداز نہ ہو (شاہ جہاں آباد ایک تہذیبی روایت)

۲۳۔ علاء الدین نے قاضی معین الدین کے ساتھ اپنی گفتگو میں مذہب کو نظام ریاست و سیاست سے الگ رکھنے کی بات کھل کر کہدی۔ (ایضاً)

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ان (سنتوں) کے مرید ہندو اور مسلمان دونوں تھے مگر وہ ان دونوں کے مذہبی شعائر کو نہیں مانتے تھے ان کے نزدیک صرف وہی چیزیں قابلِ قبول تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک تھیں۔ (ایضاً)

۲۷۔ سب سے قوی محرک وہ مذاقِ سخن ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچرل اور اشتراک کے نئے رسوم و آداب کے ساتھ ذہنی افق پر قوس قزح کی طرح ابھار دیا تھا۔ (عہد محمد شاہی ہیں شاہ جہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں)

۲۸۔ یہ عہد جو ہر انسانیت جو پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا تھا وہ فقرا کے شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آیا تھا۔ شاہنامے کے ڈھنگ سے نہیں آیا تھا۔ (ایضاً)

۲۹۔ اس سے پہلے کمپنی کے انگریز ملازموں کے لیے اردو تعلیم کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہیں تھا۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اوّل نے رئیس کالج کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ جس سے انگریز ملازم اور ہندوستانی طلبار فارسی پڑھتے تھے لیکن یہاں اردو یا کوئی ملکی زبان نہیں پڑھائی جاتی تھی وہ لوگ اردو اپنے طور پر پڑھ لیتے تھے یا انگریز حکام اپنے ماتحتوں کے لیے اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ (ص ۸۱ داستان تاریخ اردو)

۳۰۔ جو انگریزی کمپنی میں ملازم ہو کر آتے تھے وہ ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے نہیں آتے تھے اور کاردانی و حکمرانی کے لیے علوم و فنون کی مہارت ضروری ہے اس لیے

اس (لارڈ ویزلی) نے چاہا کہ یہ فورٹ ولیم کالج علوم و فنون کی اعلیٰ درس گاہ ہو ص ۸۱

۳۱۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے محرکات خالصتاً ادبی نہیں بلکہ اس تحریک میں سیاسی اغراض و مقاصد نسبتاً زیادہ کارفرما ہیں۔ ص ۱۲۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک انور سدید دائرے علی گڑھ۔

پلاسی کی جنگ کے بعد کمپنی نے سیاسی ذمہ داریاں اور انتظامی نظم و نسق بھی سنبھال لیا تھا اس لیے اب ایسے ملازمین کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی جو مشاہدے اور تجربے سے مقامی مسائل کو سمجھ سکیں اور حکمت و دانش سے ان کا حل تلاش کر سکیں۔ چنانچہ ملازموں کی قابلیت اور ذہانت کے ساتھ رعایا کے میل جول کی صلاحیت کو بھی پرکھا جانے لگا۔ ص ۱۰ دائرے علی گڑھ

۳۲۔ ان قصوں میں ہر صفحہ پر آپ کو قومی خصوصیات کے متعلق ایسی باتیں ملیں گی جو ہمیں اہل ہندوستان اور خاص کر اسلامی ہندوستان کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہوگی (خطبات ذاسی بحوالہ داستان تاریخ اردو ص ۸)

۳۳۔ اسلامی قصوں میں آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ تبلیغ اسلام کی جانب کسی نہ کسی پیرائے میں ضرور اشارہ کیا جاتا ہے اور غنائی شاعری تصوّف، عشق مجازی اور ہمہ اوست کے مسائل سے آگے نہیں بڑھتی۔ تصوّف میں اسلامی عقائد اثباتی [illegible] کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ اور اسلام کی جانب غیر مسلموں کو نہایت موثر انداز میں رجوع کیا جاتا ہے۔ ص ۸۸۔ ایضاً

۳۴۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابیں۔ بیرونی ادبی حلقے کو بھی متاثر کر رہی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کی نثر کے اثرات صرف کالج کی فضا تک محدود نہیں تھے بلکہ یہ دور تک پھیل رہے تھے۔ اس کے خلاف منفی ردِّعمل بھی ہوا اور اسے مثبت طور پر قبول کرنے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔

۳۵۔ غالب کی دلّی پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ غالب سیمینار ۱۹۸۱ء غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب دلی۔ سلاطین چھتوں پر چڑھ چڑھ کر بھوکے مرتے تھے۔ آوازیں بلند کرتے تھے۔ مساکین دربار اپنی تنخواہوں کے انتظار میں بے چین رہتے تھے لیکن عزت اور تنگدستی میں اپنی روایات کی پاسداری کرتے تھے۔

۳۶۔ غالب کی دلی۔ (ایضاً)

۳۷۔ غالب کی دلی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

۳۸۔ دلی کئی بار لٹی اور بسی تھی لیکن یہ تبدیلی صرف شہر دلی کی نہ تھی۔ یہ ایک تہذیب ثقافت ایک تمدن کی بربادی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بربادی نے اخلاق تباہی اور گمراہی کی راہیں ہموار کر دیں۔ (غالب کی دلی)

۳۹۔ غالب کی دلی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

۴۰۔ فکرِ نو (شاہ جہاں آباد نمبر) میں مشمولہ "مدارس" صاحب درس" ایسے بڑے اور اہم مدارس کا مفصل بیان کرتا ہے۔ ان مدرسوں کی تعداد چودہ تھی جس میں مدرسہ غازی الدین خاں جو بعد میں دلی کالج اور اب ذاکر حسین میموریل کالج ہو گیا' اٹھارہویں صدی کے علماء کی درسگاہ رہا ہے۔

۴۱۔ فکرِ نو شاہ جہاں آباد ایک تہذیبی روایت

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ فکرِ نو شاہ جہاں آباد نمبر

۴۴۔ مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار یقیناً بے بس بے اختیار اور مجبورِ محض تھا۔ لیکن عوام کی نظر میں حلقہ کی حیثیت ایک نشانی کی تھی۔ ۱۸۰۳ میں جب فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں تو مغل شاہ کی حیثیت کمپنی کے ایک ملازم کی سی رہ گئی تھی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو ہٹانے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے اقتدار کے سہارے جس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ تھی۔ اپنے اثرات کو مضبوط کرتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس میں ذاتی کردار کی بعض خوبیاں ایسی تھیں جو اس کو اپنے پیش روؤں سے ممتاز کرتی ہیں لیکن ذاتی کردار کی یہ چند خوبیاں ایک سلطنت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ غالب کی دلی۔ (خلیق احمد نظامی)

۴۵۔ تحسین کی نوطرزِ مرصع یا باغ و بہار تالیف (۱۸۰۱ء) اور انشا کی رانی کیتکی کی کہانی تصنیف ۱۸۰۳ء۔ چھوڑ کر بیسویں صدی میں جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ سب کی سب فورٹ ولیم

کالج کے منصوبے کے تحت لکھی گئیں (ص ۷۔ داستان سے افسانے تک۔ وقار عظیم۔)

۴۶۔ ہندوستان کے سیاسی مسلک کا نشوونما میں ایم ایم جیلی نے اس لیے مشورہ دیا کہ حکومت کو چاہیے کہ مسلسل مداخلت چھوڑ دے اور خواہ کتنی ہی مدت کیوں نہ درکار ہو اس وقت کا انتظار کرے جبکہ وہ مناسب طریقے پر داخل ہو سکیں۔ رعایا اپنی قدیم رسوم اور روایات کے ساتھ بڑی وابستگی رکھتی ہے اور ہماری تہذیب و تمدن کو قابل کشش اور خوشگوار نہیں پاتی۔ لہٰذا اس کی طرف آہستہ آہستہ صبر و سہولت کے ساتھ اس کی روایتوں کو نتیجہ خیز بناتے ہوئے اپنا کام نکلا چاہیے مگر باشندگان ہند کو غیر ملکی آقاؤں کی مسلسل حکومت میں رہنے کی ذلت کا معاوضہ اس احساس پیہم سے ملنا چاہیے کہ انھیں مسلسل پہنچ رہے ہیں۔ بحوالہ دائرے علی گڑھ۔ ص ۶۳

۴۷۔ انگریز ہندوستان میں تاجروں کے روپ میں آئے تھے اور انھوں نے تادم رخصت ہندوستان کو تجارتی منڈی ہی تصور کیا۔ اس کے ساتھ تاجروں جیسا سلوک کیا اور صرف اپنے منافع پر نظر رکھی۔ تاہم واقعات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ یہ تاجر آہستہ آہستہ ہندوستان کی فرمانروائی کا خواب دیکھنے لگے۔ ص ۱۲۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک۔ (انور سدید) دائرے علی گڑھ۔

۴۸۔ ڈاکٹر صاحب گلکرائسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک کالج کے پرنسپل ہوئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ان کی تالیف میں مدد دی اور خود بھی لغت جہاز رانی وغیرہ کتابیں لکھیں۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر بھی فورٹ ولیم کالج کے اردو پروفیسر تھے۔ (ص ۸۴ داستان تاریخ اردو)

۴۹۔ تالیف ترجمہ کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے لیکن حکومت میر بہادر علی حسینی کو اپنے مصارف پر ماتحتی میں ہندوستانی کتابوں کے مقابلے اور ان کی تصحیح پر بحال رکھے۔ بحوالہ گلگرائسٹ اور اس کا نمبر (ص ۲۰۔ دائرے علی گڑھ)

۵۰۔ ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے اور انڈین سول سروس کے امیدواروں کو پرائیویٹ طور پر مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتے رہے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورنٹیل انسٹی

ٹیوٹ قائم کیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب از روئے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۵ء میں یہ درسگاہ بند کردی گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے طور پر لوگوں کو اردو پڑھاتے رہے۔ (ص ۴۷۔ داستان تاریخ اردو)

۵۱۔ یہ سب داستانیں پڑھنے والوں کے لیے ایسی تفریح، دلچسپی اور ذہنی انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی تھیں جن میں منطق اور استدلال کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان سب داستانوں اور کہانیوں کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ (ص ۸۔ داستان سے افسانے تک۔ وقار عظیم)

۵۲۔ نثری داستانوں کا سفر (صغیر ابراہیم) ہماری زبان دلی بابت ۱۵-۲۲ جون ۱۹۹۶ء

۵۳۔ ص ۱۱ ایضاً

۵۴۔ ہماری داستانوں نے کہانی دلچسپی اور دلفریبی کی تخیّل و تصوّر، کشمکش اور جدوجہد کی اور بعیر شادمانی و مسرّت کی سکون و راحت کی، باطل پر حق کی فتح کی۔ انسان اور فطرت کے تصادم اور ہم آہنگی کی، مادہ، روح اور سحر و افسوں کی نیرنگئ عمل کی فضا بنائی اور اس طرح ایک ایسی دنیا بنائی جو کبھی کبھی حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ صحیح اور قابل یقین نظر آتی ہے۔ جو کچھ فطری نہیں وہ یہاں فطری اور ناقابل یقین ہے۔ یقینی اور قابل قبول بن جاتا ہے۔ (ص ۳۵۔ داستان سے افسانے تک)

آرائش محفل کا تہذیبی مطالعہ

قصہ حاتم طائی یوں تو بنیے کو سات سوالوں کی داستان ہے اگرچہ ایک سوال کی ایک داستان میں کئی کئی داستانیں شامل ہوگئی ہیں اور اس میں سے ہر ایک میں ہماری سماجی روایتوں اور تہذیبی قدروں کا حسن نکھرا ہوا ہے ان سے ہم اپنی ماضی کی صدیوں سے چلی آرہی مختلف روایتوں اور گوناگوں سلسلوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اور یہ جاننے لگتے ہیں کہ اس عہد کے لوگ جن کے معاشرتی دائرے اور تہذیبی حلقے دھنک کے رنگوں کی طرح بہت کچھ الگ الگ بھی تھے، کس طرح زندگی گزار دیتے تھے۔ اور کیا سوچتے تھے۔ ان کی تمناؤں کے پیچ در پیچ سلسلے کیا کیا تھے۔

مشکلات زندگی میں سبھی کو پیش آتی ہیں اور دشواریوں پر قابو پانے کی جدوجہد کم و بیش سب کو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مختلف قصوں اور داستانوں میں جن میں قصہ حاتم طائی بھی شامل ہے۔ ہیرو کی شخصیت اور عظمت کا مدار بہت کچھ اس بات پر ہوتا ہے کہ اس نے کیسی مہمات سر کیں اور کیسے کیسے دشوار مراحل اور صبر آزما منزلوں سے وہ اپنے حوصلہ اور ہمت سے کامیابی کے ساتھ گزر گیا یہ عام مہمات اور مشکلات گویا ہیرو کی شخصیت کو پرکھنے کا ایک معیار بھی ہے۔

وہ معاشرہ روایتی طور پر یہ بھی سمجھتا ہے کہ نیکوں کو ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس عقیدے کا اثر ہیرو کی اپنی شخصیت اور اس کے معتقدات میں بہت نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

صالح معاشرے اور اعلیٰ تہذیب کے آثار اس داستان میں منزل بہ منزل نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شاید اس بات میں باغ و بہار بھی اس کا مقابلہ نہیں کرتی۔ واضح اور صاف تہذیبی اور معاشرتی قدریں ہم کو آرائش محفل میں ملتی ہیں جو باغ و بہار میں کم نظر آتی ہیں۔ یہیں معاشرے کے ایک فرد میں نہ صرف بہادری۔ دانش مندی اور فراست یک جا طور پر نظر آتی ہے۔ بلکہ ان قدروں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو فرد کی عظمت کے اس پیمانے پر پورا اتر آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حاتم خود کی عظمت کے لیے دوسروں کے واسطے تکلیف اٹھاتا ہے۔ حق کے لیے نکل پڑتا ہے۔ ایثار اور خدمت کے جذبے اسے قربانی کے راستے پر مستحکم رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کردار و عمل کی ضرورت سے ان سب باتوں کو ثابت کرتا ہے۔ اس کشمکش سے گزرنے پر داستان کی مقصدی حیثیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

حاتم کے کردار کے مطالعہ سے اور اس کی مہم جوئیوں سے ایثار اور خدمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑی حد تک یہ جذبہ یقینی ہو جاتا ہے۔

قربانی اور ایثار کے جذبہ کو ہم انسان تو انسان حیوانوں میں بھی نمایاں طور پر پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے پس منظر میں وہ محرک قوت موجود ہے جو دلوں کو نیکی پر گدگداتی ہے۔ اور ذہنوں کے لیے روشنی کا باعث بنتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تصنیف "اردو کی نثری داستان" میں قصہ حاتم طائی کے تہذیبی پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اس میں ہندوستانی اخلاقیات کے مخصوص پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کے اندر ہندوستانی عناصر کثرت سے ملتے ہیں۔ کوہ ندا والے سوال میں حاتم طائی ہندوستان پہنچا ہے۔ ایک ہندو اس کی تواضع کے لیے ایک کٹورا دودھ اور ایک کٹورا پانی اور دوسری بار دودھ اور چاول لاتا ہے۔ اس شہر میں حاتم دیکھتا ہے کہ ایک مرد کے مرنے پر چار عورتیں ستی ہو جاتی ہیں۔ حاتم کو اس بات پر بہت حیرت ہوتی ہے تو لوگ اس سے پوچھتے ہیں کیا تو ہندوستان کا باشندہ نہیں۔

اس طرح بندر اور لومڑی کا قصہ۔ زمیندار کا ذکر وغیرہ تہذیبی عناصر ہیں۔ یہ کوئی قوی ثبوت نہیں لیکن یہ الگ بات ہے کہ قصہ کی عقبی زمین ہندوستانی ہے۔"

حاتم طائی کے تیسرے سوال میں الگن پری کا بیان ہے۔ جب حاتم جوان کا ذکر کرتا ہے۔ جو الگن پری کے فراق میں تڑپ رہا ہے تو الگن پری اس نوجوان کے بجائے حاتم پر عاشق ہو جاتی ہے۔ حاتم بہت سمجھاتا ہے لیکن اس کے سمجھانے کا اثر اس پر بالکل نہیں ہوتا۔ آخر حاتم اس کے دروازے پر ایک درخت کے نیچے دانا پانی چھوڑ کر سارے دن گزار دیتا ہے اس سے الگن پری ڈر جاتی ہے اور کہتی ہے۔ وہ اگر بے آب و دانہ مر جائے گا تو میں تیرے گناہ میں پکڑی جاؤں گی اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اس طرح انسان تو انسان پری کے دل میں گناہ کے خلاف جذبۂ خوف کا احساس پیدا کرنے میں حاتم کامیاب ہوتا ہے اور دنوں کی تعداد سات ہی کارگر رہتی ہے۔

اس پری کا نام خود ایک طرح کی تہذیبی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا تعلق خاص طور پر ہندوستان سے ہے۔ الگن ہم آغوش کو کہتے ہیں ایسا کوئی نام پریوں کو وہی ادبی روایت دے سکتی ہے۔ جو کام شاستر کے فلسفے میں یقین رکھتی ہو۔

اس کے علاوہ یہاں دنوں کا ساتھ ہونا ایک تہذیبی فکر ہی کی علامت ہے۔ ابھی جیسے واقعہ کا ذکر ہوا ہے اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے کے نزدیک اصل ہمدردی یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے لیے جو کچھ بھی کرے اس میں اپنی ذات اور غرض کو کبھی شامل نہ ہونے دے۔

تین دن بعد یہ احساس پری کے دل میں بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور سات دن کے بعد خدا کو منہ دکھانے کے خیال سے اپنی ہٹ پر قائم نہیں رہتی۔ کیونکہ اس ایثار میں اسے گناہ میں پکڑے جانے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ستیہ گرہ کے ذریعے احتجاج کرنے سے کہیں زیادہ اونچی روش ہے اور دوسروں کی آگ میں کود پڑنا دوسروں کے لیے قربانی اور ایثار کی انتہائی صورت ہے۔

مسافر نوازی اور مہمان نوازی کی نیا فتیں ہمارے معاشرے کی ان خوبیوں کو واضح

کرتی ہیں جن سے ہماری معاشرت اور تہذیب کی روایت کو پیش کرتی ہیں اور ان خوبیوں کے متعلق تذکروں اور واقعوں سے داستان بھری ہوئی ہے۔ جو ہمارے تہذیبی معیار کی وضاحت کرتے ہیں اور بہت حد تک اس تہذیب کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہیں جس کو ہم مشرقی تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہماری تہذیبی قدریں اسے نازک مراحل سے بھی سلامت روی کے ساتھ گزار دیتی ہیں جہاں ایک عام آدمی اخلاقی معیاروں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ نیز اس واقعہ میں اس حقیقت کا پرتو بھی موجود ہے اور وہ امور بھی پائے جاتے ہیں جو ایک بات پر قائم نہیں رہتے۔ اور انسانی اخلاق کے اس پہلو کو سامنے لاتی ہے جہاں دوسروں سے اچھا سلوک اور ان کے لیے تکلیف اٹھا کر خوش ہوا جاتا ہے۔

ہماری دوسری داستانوں کی طرح اس داستان میں بھی تبلیغ اسلام کا جذبہ موجود ہے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر اطہر پرویز لکھتے ہیں۔

"دوسرے امور کے علاوہ اس میں اپنے مخصوص عقائد کو پھیلانے اور اپنے مذہب کو عام کرنے کا جذبہ بھی ملتا ہے، اس جذبے کو ہماری تہذیبی تصورات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی ہے۔

ہندوستان میں داستانوی ادب اس عہد کی پیداوار ہے جب یہاں زوال کے آثار واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کی سیاسی شکست نے تمام مسلمانوں کو جذباتی طور پر متاثر کیا تھا اور وہ ان تمام داستانوں کو صرف دل بہلانے کے لیے پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ ایک قسم کی جذباتی تسکین بھی حاصل کرتے تھے۔"

ڈاکٹر اطہر پرویز کے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی تبلیغ میں زیادتی بھی اس کی ایک وجہ قرار دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایسے معاشرے میں ہر انسان کسی نہ کسی پناہ گاہ کی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ ہماری داستانوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے۔

ڈاکٹر اطہر پرویز مزید لکھتے ہیں کہ وہ حقیقت کی دنیا میں سانس لینے کے بجائے ایک

خواب کی دنیا کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی داستانوں کے مواد کا جواز ہے۔

اس کی تائید کے لیے جناب ممتاز حسین صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے۔

"جن چیزوں کا آرزومند ہوتا ہے ان کی تحصیل کا خواب اپنی کہانیوں میں دیکھتا ہے۔ زندگی کے سفر کے نشیب و فراز میں جو کٹھنائیاں پیش آتی تھیں ان کے مقابلے اور اپنے حالات کے مطابق کرنے اور ان پر قابو پانے کی تعلیم بھی ان کہانیوں کے ذریعہ دیتا ہے۔"

آغاز داستان

اس داستان میں وہ اقدار کہانی ہی میں شامل ہیں جنہیں عظیم اخلاقی قدروں کا نام دیا جاتا ہے جیسے ان تین سوالوں میں یہ تین اخلاقی قدریں نمایاں ہیں۔

(۱) نیکی کو دریا میں ڈال۔ (۲) کسی سے بدی نہ کر جو کرے گا وہی پاوے گا۔

(۳) سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔

"ان پہلوؤں پر گفتگو آئندہ آئے گی۔"

اس داستان کے ذریعہ انسان دوستی کا درس جس نے ہماری تہذیب کی بنیاد کو مضبوط کیا ملتا ہے۔ "برائے خدا دوسروں کے کام آؤ: اور کبھی کسی کی مدد سے دریغ نہ کرو۔ یہی محور ہے جس کے گرد حاتم کی زندگی اور آرائش محفل کا قصہ گھومتا ہے۔

یقیناً آرائش محفل ہمارے کلاسیکی ادب یعنی کلاسیکی داستانوں میں ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی اس کی اہمیت مسلم ہے کہ اس میں معاشرتی و تہذیبی قدریں بیان ہوئیں۔ جو دوسری داستانوں میں بھی شامل رہیں لیکن اس میں کس قدر موثر پہلو سے آتی ہیں۔

اگر ہم ساتوں سوالوں کی داستانوں میں بیان کی گئی قدروں کو یکجا کر کے دیکھیں تو ہماری معاشرت اور تہذیب کے خدوخال اپنے واضح خطوط کے ساتھ سامنے آجائیں گے کیونکہ یہی عناصر ہیں جن سے مل کر ہماری تہذیب اور معاشرہ مکمل ہوتا ہے۔

مصنف نے آغاز داستان میں لکھا ہے:

(۱) "وہ لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں طے نامی یمن کا بادشاہ تھا نہایت صاحب حشم عالیجاہ۔ فوج کی طرف سے فرخندہ حال اور جواہر سے مالا مال اس کی رعیت ہزار اور سپاہ بے شمار۔"

ان چند فقروں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب تصنیف کا معاشرتی پس منظر کیا ہے اور اس نے بادشاہت کے لیے اپنے مخصوص انداز میں جن امور کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس قصے اور دوسری داستانوں میں تقریباً مشترک ہے۔

اس تحریر کے پہلے حصہ میں یعنی آغاز داستان ہی سے اس دور کے معاشرے پر روشنی پڑتی ہے۔ جو داستان کے انداز میں کہے جانے والی باتوں کو ایک خاص نوع کی اہمیت دیتا تھا اور لکھنے والے نے یوں لکھا۔ لکھے جانے والے واقعات اور بیانات کو تاریخی نوعیت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ دوسرے حصے سے معاشرے کی ان توقعات کا پتہ چلتا ہے۔ بادشاہ ان اوصاف وکوائف کے اہل ہونے چاہئیں۔

آگے چل کر مصنف نے حاتم کی پیدائش کے بارے میں لکھا ہے:-

"بنتِ عم سے نکاح ہوا اس سے حاتم جیسا بیٹا پیدا ہوا تو طے بادشاہ نے یمن کے حکیموں و نجومیوں۔ رمالوں۔ نذیموں پنڈتوں کو بلا کر کہا کہ تم اپنی اپنی عقل کی رسائی اور پوتھی قرعہ کی رو سے دریافت کرو اور بچارو تو اس لڑکے کے نصیب کیسے ہیں۔"

اس بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معاشرے میں اولاد ہونے پر اس کے نصیب منجموں اور رمالوں کے ذریعے پتہ لگانے کا رواج تھا جس کے لیے زائچہ بنایا جاتا تھا اور احکام نجوم کے مطابق نومولود کی آئندہ زندگی کا پتہ لگایا جاتا تھا۔ اور ان لوگوں کو معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو سچا سمجھا جاتا تھا کہ وہی درست ہونے کا یقین کیا جاتا تھا اور ان کی ہدایات پر عمل کیا جاتا تھا۔ جیسے حاتم کے بارے میں کیا ہوا قول: "یہ صاحبزادہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوگا اور کئی ملکوں پر اس کی حکومت ہوگی۔ اور تمام عمر برائے خدا کام کیا کرے گا۔ مہر سپہر کی طرح قیامت تک دنیا میں جلوہ گر رہے گا۔" اس داستان سے لفظاً لفظاً درست ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ اس قول کو سن کر

نہایت خوش ہوا اور سجدۂ شکر ادا کیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ تمام عمر برائے خدا کام کرے گا، کیونکہ اس معاشرے میں برائے خدا کام کرنے کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ان کے یہاں انتظام اور احترام سے زیادہ قابلِ تحسین کام خدا کی راہ میں زندگی بسر کرنا تھا تاریخی واقعات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں کہ لوگ اس طرح سوچتے تھے۔

اس زمانے میں ساری دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ہر حصہ ہفت اقلیم کہلاتا تھا اور تصور کیا جاتا تھا کہ بڑا بادشاہ وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا پر حکومت کرے، یہی وجہ ہے کہ حاتم کے بارے میں بار بار یہ بات دہرائی گئی ہے کہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہوگا۔

طے کا یہ اشتہار کرا دینا "میرے قلمرو میں آج جس شخص کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے وہ بھی آج کی تاریخ سے نوکر بادشاہی ہے۔ بلکہ اس کے ماں باپ محل ہمارے پہنچا جائیں بلکہ وہ پرورش بھی یہیں پائے گا۔ بادشاہ کی خوشی سے زیادہ اس کی بڑی خصوصیت سخاوت کا پتہ دیتی ہے۔ اور غالباً داستانوں میں پہلی ہی بار یہ واقعہ بیان میں آیا ہے۔ اس کی مثال بھی شاید کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ اگر مل بھی جائے تو اس شان کی نہیں ہوگی۔ اس سے یہ بھی طے پا جاتا ہے کہ خدا کو ایک مثالی سخی دنیا کو دینا منظور ہے کیونکہ اس کے سوا اس کے برعکس کوئی نتیجہ نکلنا خدا کی خدائی میں کچھ کمی کا موجب کہلایا جا سکے گا۔

دوسری طرف اس سے یہ بات بھی ذہن کی سطح پر ابھرتی ہے کہ شاہی نظام اور جاگیردارانہ نظام میں جس بے باکانہ انداز سے عوام کا استحصال کیا جاتا تھا اور دوسروں کی دولت کو زبردستی جائز قرار دیا جاتا تھا اسی نسبت سے دولت کو بے دریغ خرچ بھی کرتے تھے۔ اور دوسروں پر احسان اور ان کی پرورش کو بھی آداب سلطنت کے لوازمات میں شمار کرتے تھے۔ جن کی پرورش ہوتی تھی ان کی شاہی محل سے بطور خاص وابستگی عمل میں آتی تھی اور شاہی خزانے سے ان کے اخراجات برداشت کیے جاتے تھے۔

حاتم کے لیے چار دائیاں تھیں لیکن وہ کسی کا دودھ نہ پیتا تھا۔ سیانوں نے بتایا۔

"یہ حاتم زمانہ ہوگا۔ تنہا دودھ نہ پیے گا۔ پہلے ان کو بلوائے گا پیچھے آپ پیے گا۔ اور جب تک جیتا رہے گا تنہا نہ کھائے گا نہ پیے گا۔ اس کے علاوہ نہ روتا۔ نہ غفلت کی نیند سوتا۔ اس لیے جب کھانا پینا شروع کیا تو سب کے ساتھ کھانا پینا مقرر ہوا۔ جن بچوں کی اس دن سے پرورش شروع ہوئی تھی جس دن وہ پیدا ہوا تھا۔ بڑا ہوا تو غریب غربا۔ بھوکے پیاسے ننگے کو بے دیے دلائے نہ رہتا تھا۔ رات دن اس کا شغل دینا دلانا تھا۔ جو دہ برس کا ہوا تو باپ کا خزانہ راہِ خدا میں خرچ کرنے لگا۔ شکارگاہ میں جانور کو مارتا نہ تھا۔ زندہ پکڑ کر چھوڑ دیتا تھا۔ حسین بھی ایسا جس نے دیکھا وہ شیدا ہوا۔ کردار یہ تھا کہ کبھی ظلم و ستم کا روادار نہ ہوتا۔ نہ اپنے کی حمایت کرتا نہ بے گانے کی رعایت کرتا۔ اور ہر شخص کو نصیحت کرتا۔"

"بندگانِ خدا کی سب ہی مخلوق حسن قدرت اس خالق کی دیکھے کہ اس نے اپنی رحمت سے اٹھارہ ہزار عالم کو پیدا کیا ہے۔ اس کی حمد و ثنا کیجیے اور سجدۂ شکر الٰہی بجا لائیے۔ اور اپنی زندگی کو جواں مردی اور نام آوری کے ساتھ بسر کیجیے۔"

بچّے کو دودھ پلانے کے لیے دایا کا رکھا جانا ایک بہت پرانا دستور ہے اس کی مثالیں ہمیں اس قصے کے علاوہ بھی دوسرے قصوں میں اکثر و بیشتر مل جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ عورتیں شریف خاندانوں کی ہوتی تھیں۔ جب کسی رئیس کا بچہ ان کے سپرد کیا جاتا تھا تو اس بچہ کی کفالت بھی اس رئیس کے ذمہ ہوتی تھی جو اس عورت کا ہوتا تھا۔ اور ان کی راحت و آرام کا ــــ کا ہر طرح کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے آغاز کے وقت خود عرب میں بھی یہ طریقہ جاری تھا۔ جو لوگ ایک سے زیادہ عورتوں کا خرچ برداشت کر سکتے تھے ان کے یہاں کئی کئی دودھ پلانے والیاں بھی رکھی جاتی تھیں۔ جیسا کہ حاتم کے سلسلے میں کہا گیا ہے۔

بزرگوں کی کہانیوں میں ہم دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں کہ وہ بچپن سے ایسی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں جو بڑے انسانوں کے لیے وجہ امتیاز بنی ہیں۔ یہاں حاتم کے لیے لکھا گیا ہے کہ وہ اپنی شیر خوارگی کے زمانے میں تنہا دودھ نہیں پیتا تھا۔ اور بعد میں کبھی

تنہا کھانا نہ کھاتا تھا۔ یہ اچھے انسانوں کی ایک بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

جاگیرداری دور میں بخشش و عطا اور کرم انسان کی بہت بڑی صفات تھیں۔ جو حاتم کے ساتھ بھی روایت اور حکایت کے ساتھ وابستہ تھیں اور اس کو بہت بڑا سخی قرار دیا جاتا تھا اور آج بھی جس کی بخشش اور سخاوت کا ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے اس کو حاتم وقت کہا جاتا ہے۔ مردوں کا بہت زیادہ حسین ہونا کوئی بڑی خوبی تو نہیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے مردوں کو غیر معمولی خوبصورتی اس کے لیے ایک بڑی وجہ کشش سمجھی گئی ہے۔ جیسے جو بھی دیکھتا وہ اس پر عاشق ہو جاتا اس لیے حسنِ یوسف ایک مثال بن گیا۔ مردانہ شخصیت کی محبوبیت اور مقبولیت کی ایک مثال شری کرشن کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ پھر ہمارے یہاں عشق کا تصور بھی یہی رہا ہے۔

دیدن ہمیں و اول، دادن ہمیں

جس کے معنی ہیں کہ دیکھتے ہی عشق ہو جاتا ہے۔ حاتم کے سلسلے میں بھی یہ روایتی طور پر یہ بات کہی گئی ہے۔ ایک اور بات جو بہت اہم سمجھی جاتی ہے اور جس میں کامیابی بڑی مشکل سے ہی کسی شخص کا مقسوم بن سکی وہ اپنوں اور غیروں کے لیے انصاف کے تقاضوں کے پیش نظر برابری کا قایم رکھنا ہے جو گویا عدل کی سب سے بڑی مثال ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حاتم کو بھی عدل و انصاف کے معاملہ میں ایسی صفت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ مختلف مخلوقات گویا اپنی الگ الگ دنیائیں رکھتی ہیں وہ اٹھارہ ہزار ہیں اس لیے فارسی میں ہشت دہ ہزار عالم کہا جاتا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تصور کہاں سے اور کیسے پیدا ہوا حاتم نے اس عالم کی سیر کا مشورہ دیا ہے غالباً اس لیے کہ صوفیوں کے نزدیک یہ کائنات اور موجودات متخلیہ آئینۂ جمال الٰہی ہیں ان کی سیر گویا حقیقت کائنات کا ادراک اور صفات الٰہی کا عرفان ہے۔ یہ تمام نظام انسان جس کا ایک جز ہے کیونکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے حاتم کہا گیا ہے۔ اسی لیے انسان پر سجدۂ شکر واجب ہے۔ احترام کے طور پر سجدہ کرنا اہلِ تصوف کے یہاں بھی رائج ہے۔ اور بادشاہ کے سامنے تو سجدے کیے ہی جاتے تھے۔ یوں بھی

مذہب پسند لوگ اپنی یا اپنے خاندان کی یا اپنی جماعت کی زندگی میں کسی خیر و برکت کے آنے پر سجدۂ شکر الٰہی ادا کرتے تھے۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔

جانوروں سے بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا کہ انسانوں سے وہ خدا کے بندوں کا کام برائے خدا ہی لیا کرتا تھا۔

ان تمام خصوصیات سے ایک اچھے انسان کے کردار۔ عادت اور اس دور کے معاشرے کا علم ہوتا ہے۔ پہلا قصہ سنا ہے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان باتوں سے معاشرتی نظام کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بہت سی چیزوں کو لکھا نہیں جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار باتیں زبانی روایت کے طور پر نقل ہوتی تھیں یعنی یہ معاشرہ لکھنے کے ساتھ ساتھ سننے کو بھی اہمیت دینے والا تھا۔

بادشاہ کے لیے اس دور میں عدل و انصاف کی خوبی نہایت ضروری خیال کی جاتی تھی۔ نوشیرواں کا عدل۔ بکرماجیت کے انصاف، جہانگیری عدل اور رعایا پروری کی داستان کی حیثیت اور کہاوت کا مرتبہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ شیر و بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا انصاف کا سب سے بڑا معیار ہے۔ اس سے بھی زیادہ اپنے بیٹے کا پاس نہ کرے خراسان کے بادشاہ کی ایسی ہی تعریف کی گئی ہے۔

سوداگر بادشاہ کے بعد معاشرے کا ایک اہم شخص ہوا کرتا تھا بلکہ معاشرے میں بادشاہ اور امرائے سلطنت کے بعد اس کا مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ وزیروں اور بادشاہ کے امیروں اور درباریوں سے بھی زیادہ بادشاہ کے قریب رہتا ہے۔ چونکہ تاجر ملک ملک گھوم کر تحفے اور اچھی اچھی چیزیں جن میں بادشاہوں کے من پسند ہیرے۔ ہاتھی، گھوڑے، باندیاں اور کنیزیں بھی ہوتی تھیں لا کر دیتے تھے اور گاہ بگاہ پیش کرتے تھے۔ اس لیے اکثر وہ لوگ بادشاہ کے بہت زیادہ قریب ہو جایا کرتے تھے۔

پہلے قصے کا سوداگر برزخ نامی اس قسم کا ایک تاجر ہے حسن بانو اس کی وارث تھی۔ جب وہ مرنے لگا تو اس وقت حسن بانو کی عمر بارہ سال کی تھی بادشاہ کو اس کا نگران ٹھہرایا بادشاہ نے اپنی لڑکیوں کی طرح اس کی پرورش کی اور اس کے زر و مال کا لالچ نہ کیا۔

دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھ کر پرورش کرنا بادشاہ کی رحم دلی اور نیک نیتی کا ثبوت ہے۔ حسن بانو کے مال و دولت کا لالچ نہ کرنا بادشاہ کے لیے کوئی بڑی بات نہیں لیکن قصہ نگار کے ذہن میں یہ بات اس لیے آئی کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب کوئی امیر و وزیر یا بڑا تاجر فوت ہو جاتا تھا تو بادشاہ اپنے حکم نامے کے ذریعے اس کی دولت اور ثروت کو اپنے قبضے میں لے لیتا تھا اور وہ شاہی ملکیت قرار پاتی تھی۔

جوان ہونے پر حسن بانو نے دائی کو بلا کر مشورہ کیا اور یاد الٰہی میں مشغول رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے جیسا کہ رواج ہوتا تھا بلائیں لے کر سات سوالوں کا اشتہار نامہ تیار کر کے دروازے پر لگانے اور انھیں پورا کرنے والے کو قبول کرنے کے لیے کہا۔ ایک تو سات امتحان جو سات آگ کی مانند کچھ بھی کھوٹ نہ رہنے دے۔ دوسرے امتحان بھی کیسے صبر آزما۔ کردار اصلی کی کسوٹی۔ حق و نیکی کا معیار پھر ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ معاشرے میں کن امور کو خدا ترسی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور کون سے اوصاف کو انسانیت کے لیے لازم قرار دیا جاتا تھا۔

حسن بانو کا جوان ہونے پر اپنی دایہ کو بلا کر مشورہ کرتی ہے۔ اس کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دایہ بھی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر زادیوں کے نجی معاملات میں شریک رہتی تھیں۔ اور وہی کبھی اُن کی رازدار بھی ہوتی تھیں۔

وہ سوال مندرجہ ذیل ہیں جن کا اشتہار حسن بانو نے لکھ کر لگایا۔

۱، ایک بار دیکھا دوسری دفعہ کی ہوس ہے۔

۲، نیکی کر دریا میں ڈال۔

۳، کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پاوے گا۔

۴، سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔

۵، کوہ ندا کی خبر لاوے۔

۶، وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کی برابر ہے اور موجود ہے اس کی جوڑی کا موتی پیدا کرے۔

(۷) حمام بادگرد کی خبر لاوے۔

یہ سوالات خود اپنی جگہ پر تہذیبی رجحانات کی نقش گری کرتے ہیں۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ آج بھی گویا ہمارا اخلاقی معیار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نیکی کو نیکی کے لیے کیا جائے اور اس کے بدلے کی تمنا نہ کی جائے۔

(۲) بدی کا بدلہ قدرت کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ یہ بھی اس زمانے کے اخلاقی تصورات میں سے ہے۔ اور ہر زمانے میں یہی خیال کیا جاتا رہا ہے۔

(۳) اس طرح سچ کی فتح ہوتی ہے۔ یہ بات ہم اب بھی سوچتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اچھائی کا نتیجہ ملنے میں چاہے دیر ہو جائے لیکن وہ ملتا ضرور ہے۔ اور بہتر ہی ملتا ہے۔

(۴) کوہ ندا۔ کوہ قاف۔ کوہ سمرو۔ دیوار قہقہہ یہ اس طرح کی داستانی علامتوں میں سے ہیں۔ اور قدیم زمانے کے قصّے کہانیوں میں اس نوع کی بہت سی چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔ اور آج بھی انھیں علامتی اظہار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

(۵) انڈے کے برابر موتی۔ ظاہر ہے کہ ایک آئیڈیل ہے۔ بالکل کوہ نور ہیرے کی طرح جو اتفاق سے موجود ہے اور جس کا بدل دنیا میں موجود نہیں۔

(۶) حمام ایران کے لیے ایک عام بات رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا رواج مغلوں کے زمانے سے شروع ہوا۔ اب بھی یعنی ہیر ڈریسنگ کی دوکانوں کے ساتھ حمام وابستہ رہتے ہیں۔

پرانے زمانے میں جس طرح بعض محلات اور قلعے مشہور تھے ایسے ہی بعض خزانے بھی مشہور تھے۔ داستان نگار نے ممکن ہے حمام بادگرد کا تصور اس سے لیا ہو۔ کیونکہ حسن بانو نے جان لیا تھا کہ ایسا کوئی آدمی نہیں ہوگا جو ان ساتوں سوالوں کو پورا کرے۔ اس لیے اس نے جیسا سوچا تھا کہ اپنے آپ کو آلائش دنیوی سے پاک رکھوں اور شادی بیاہ بھی نہ کروں۔ اس کے مطابق روزے نماز میں مشغول رہتی۔

نماز روزے کی پابندی اور آلائش دنیوی سے پاک رہنا۔ یاد الٰہی میں اپنا وقت گزارنا یہ اس دور کے مذہبی رجحانات کی بہترین عکاسی خیال کی جا سکتی ہے۔

ایک دن کوٹھے سے اس نے چالیس خادموں کو اور ایک فقیر صورت بزرگ کو دیکھا پاؤں زمین سے نہ اٹھتا تھا۔ اس کے خادم سونے چاندی کی اینٹیں اس کے ہر قدم کے نیچے رکھتے جاتے تھے۔ حسن بانو نے یہ دیکھ کر دائی سے کہا: "یہ کوئی بہت بڑا صاحب کمال معلوم ہوتا ہے۔" دائی نے حسن بانو سے کہا: "یہ بادشاہ کا پیر ہے۔ بادشاہ مہینے میں دو چار بار اس کے گھر ضرور جاتا ہے اور یہ بھی کبھی کبھی بادشاہ کے پاس آتا ہے۔ دنیا میں اس کے برابر کا کوئی درویش نہیں۔ نہایت متقی اور پرہیزگار ہے۔ حسن بانو نے اجازت چاہی کہ اس درویش کو مہمان کیا جائے۔ دائی نے اجازت دی اور آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈے کی مثال کہی یعنی نیک کام میں دیر کیسی اس سے سکھ ہی سکھ حاصل ہونا یقینی ہے۔

پیر صاحب نے پیغام دعوت سنت نبوی کہہ کر قبول کیا اور دوسرے دن صبح کو آنے کے لیے کہلا بھیجا۔ پیر صاحب کے لیے سامان ہونے لگا۔ اور قسم قسم کے کھانے اور میوے شاہی کے خوان تیار کیے اور نذر کے لیے زروجواہر اور ابریشم وزربفت کی کشتیاں درست کر کے رکھی گئیں۔ پیر نما شیطان اپنی روایتی شان سے آیا اور مسند شاہانہ پر آ بیٹھا۔ اور زروجواہر کی کشتیوں کو یہ کہہ کر قبول نہ کیا کہ یہ ہمارے کس کام کی ہیں؟ شیرینی اور میوے کے خوان لائے گئے اور دسترخوان پر چنے گئے۔ تناول کے لیے دست بستہ استدعا کی گئی۔ کھانا کھاتا جاتا تھا اور سونے چاندی کے اسباب کو بھانپتا جاتا تھا۔ اور ہر نوالے پر جی ہی میں کہتا تھا کہ اس سب کو آج ہی رات کس طرح اپنے گھر لے جاؤں۔ اس فکر میں تھوڑا کھانا کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ خواص عطردان لے آئے۔ عطر داڑھی میں لگایا اور دعائیں دے کر رخصت ہو گئے۔

ہندوؤں میں روحانی پیشوا کی بہت آؤ بھگت ہوتی تھی اور بڑے شاہانہ انداز سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آنے والے مہمان کو نذرانۂ عقیدت کے طور پر بہتر سے بہتر چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ زروجواہر۔ سونے چاندی اور بیش قیمت کپڑوں کے تھان ان چیزوں میں شامل رہتے ہیں جن کو نذر کیا جاتا تھا۔ امرا، بادشاہ اور بیش تر فقرا، ان کو صرف ہاتھ لگا کر گویا برکت دے کر واپس کر دیتے تھے۔ یہاں فقیر نے ایسا ہی کیا۔ شیرینی، میوے کے خوان گویا ایسی چیزیں تھیں جن کو امرا کے

علاوہ فقرا بھی پسند کر سکتے تھے۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بزرگوں کے مزار پر مٹھائیاں اور الائچی دانے وغیرہ چڑھائے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بادشاہ کے جس پیر کے نقش قدم پر سونے چاندی کی اینٹیں بچھائی جاتی تھیں وہ سونے چاندی کا اس قدر شیدائی کیوں نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ تو اسے حاصل تھا ہی۔ شاید یہاں مصنف پیروں اور فقیروں کے ادارے کی بد دیانتی کو ارادتاً بیان کرنا چاہتا ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں کے پیر ہوتے تھے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کے بھی پیر ہوا کرتے تھے۔ اکبر کی شاہ سلیم چشتی سے عقیدت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ شاہجہاں حضرت میاں عبد اللطیف کا مرید تھا۔ دارا شکوہ مُلّا شاہ بدخشی سے عقیدت رکھتا تھا۔ اور خود اورنگ زیب پیر شاہ محمد سے ارادت رکھتا تھا۔ اس اعتبار سے کتاب میں بادشاہ کے پیر کا آنا ایک تہذیبی قدر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کا ثبوت ہمیں تاریخ سے بھی ملتا ہے

ابھی تک یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جینی فرقے کا جب کوئی بڑا منی کسی جگہ براجمان ہوتا ہے تو اس کی باقاعدہ دعوت کرنے کی جرأت تو کوئی نہیں کرتا مگر جہاں سے وہ گزرتا ہے وہاں راستے میں نشانات لگا دیئے جاتے ہیں جس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہاں ان کے بھوجن کا انتظام ہے۔ اور ان نشانات کے پاس کنواری لڑکیاں دودھ کا برتن اور ناریل اور ایسی ہی کوئی پاکیزہ چیزیں لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اگر گرو پسند کریں تو ان میں سے کسی بھی گھر میں وہ کھانا کھا سکتے ہیں اور ایسا روز کیا جاتا ہے۔

آنکھیں بچھانا ایسے ہی موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں گویا قیمتی سے قیمتی چیز آنے والے کے لیے استقبال میں بچھا دی جاتی ہے۔

دعوت کے خاتمہ پر پان آج بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کچھ دنوں پہلے تک تو یہ دستور تھا) بعض خاندانوں میں آج بھی یہ دستور ہو کہ پان کے ساتھ عطر بھی پیش کیا جاتا ہو۔

حسن بانو کے لوگ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے پاؤں پھیلا کر بے خبر سو گئے اور دروازے بھی نہیں بند کیے۔ نہ اسباب ٹھکانے لگایا۔ پہر رات گزرنے پر وہ

چالیس چوروں کو لیے آ پہنچا۔ یہ چالیس چور اور چالیس خادموں کی گنتی یہاں پھر آئی ہے، جو جاگ اٹھے وہ ان کے ہاتھوں مارے گئے۔ یا زخمی ہوئے۔ حسن بانو سب کچھ کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ اور دست تاسف ملتی رہی۔

اس فقیر کے ساتھ چالیس فقیروں کا آنا الف لیلہ کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس صورت حال میں اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ قصہ نگار کے ذہن میں یہ بات ہے کہ اس ادارے کے تمام لوگ بد دیانت ہیں۔ اور کیونکہ وہ قصہ کو اس انجام پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اس میں یہ گنجائش رکھی ہے کہ دعوت کے بعد کیونکہ سب ملازمین تھکے ہوئے تھے اس لیے حویلی کے دروازے بند نہیں کیے تھے۔

صبح ہوئی تو مُردوں اور زخمیوں کو بادشاہ کے دربار میں لے گئی اور سارا قصہ رات کا کہہ سنایا اور حسن بانو نے اس پیر کو شیطان سے زیادہ قرار دیا اس پر بادشاہ کو غصہ آیا اور اس کو مار ڈالنے کا حکم دیا مگر وزیر نے یہ بتایا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا باپ مرتے وقت آپ کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے کر مرا تھا۔ یہ بات سن کر بادشاہ نے شہر سے دور چلے جانے کا حکم دیا اور حسن بانو اپنی دائی کے ہمراہ کسی جنگل میں آ پڑی۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پیروں کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا اور ان کے بارے میں کس قدر خوش گمان ہوتے تھے۔ اور کس قدر بے خبر ہوتے تھے ان کو اپنے پیر و مرشد کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ لہذا ان کا محکمہ سراغ رسانی کس حد تک کمزور ہو چکا تھا کہ وہ اس طرح کے کرداروں کے دام فریب میں آ جاتے تھے۔ بلکہ مسلسل شکار رہتے تھے۔

بن باس دنیا کی ایک قدیم روایت ہے اس سے قبل بھی ہم کو ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں بن باس کا ذکر ملتا ہے۔

درویش نما شیطان کے کردار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس خدا ترس معاشرے میں اس قسم کے بھیدی لوگ بھی موجود تھے جو درویش کا بھیس بدل کر لوگوں کو لوٹتے تھے۔

ایک سایہ دار درخت کے نیچے حسن بانو کو نیند آ گئی خواب میں دیکھتی ہے کہ ایک بزرگ سرہانے کھڑے کہہ رہے ہیں۔

"بابا غم نہ کھا اور اندیشہ نہ کر وہ کریم کارساز ہے اس سے کچھ عجب نہیں جو تجھے پھر اس رتبے کو پہنچا دے۔ چنانچہ اس درخت کے نیچے سات بادشاہت کی دولت گڑی ہے۔ جو حق تعالیٰ نے تیرے ہی واسطے یہاں چھپا کر رکھی ہے اب تو اٹھ اور اس خزانے کو اپنے تصرف میں لا۔ اور دل کو یادِ خدا میں لگا۔"

ہر مصیبت اور پریشانی کے دور میں غیبی امداد پر یقین معاشرے کی ایک عام بات اور عقیدتمندانہ روایت ہے۔ ایسی مصیبت کے وقت پیر اور مرشد بھی غیب سے آ کر مدد کرتے تھے۔ بہت سے قصے اور کہانیوں میں حضرت علی کی طرف سے دستگیری اور مشکل کشائی کی حکایتیں ملتی ہیں۔ اور خضر بھی بھولے بھٹکوں کو صحیح راستہ دکھلاتے تھے۔ اور وہ تو گویا اپنے اس کردار کے ساتھ زندہ جاوید ہیں۔

اب تک ہماری عقیدت کا یہ جزو رہا ہے کہ ویرانوں میں خزانے بھی ہوتے ہیں ایسا کبھی کبھی ٹوٹے پھوٹے گھروں میں جو کسی زمانے میں حویلیاں رہی ہوں گی ایسی چیزیں نکل بھی آتی تھیں زمین کے نیچے بڑے بڑے خزانوں کا مدفون ہونا پرانے قصے کہانیوں اور داستانوں میں عام طور پر مل جاتا ہے۔

بزرگ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حسن بانو اور دائی نے اس درخت کی جڑ اپنے زور کے مطابق ہلائی اور قدرے ایک لکڑی سے کھودی تو سات کنویں اشرفیوں سے بھرے اور صندوق ہر طرح کے جواہرات سے معمور اس موتی سمیت جو مرغابی کے انڈے کے برابر تھا دکھائی دیئے۔"

اس دور کے معاشرتی اندازوں نے گویا بادشاہ کے لیے ایک معیار کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور سات ملکوں کے ساتھ سات خزانوں کی موجودگی بھی شاہی شان و شوکت کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خسرو پرویز کے پاس سات خزانے موجود تھے۔

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ انہیں خزانوں میں مرغابی کے انڈے کے برابر موتی بھی موجود ہے اس موقع پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پورا معاشرہ تقدیر پرستی اور غیبی امداد پر یقین رکھتا تھا۔ اور جو کچھ ہوتا تھا وہ اتفاقات کا حصہ ہی ہوتا تھا۔

یہ دولت پا کر حسن بانو نے دائی کو شہر بھیجا کہ وہ کنبے قبیلے کے لیے کسی قدر کھانے پینے کی چیزیں لے آئے۔ لیکن دائی اسے اکیلے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ ہوئی اور حسن بانو کے رشتہ کا بھائی فقیری بھیس میں آنکلا اس نے حسن بانو کو دلاسہ دیا اور شہر سے سب اقربا کو لے آنے کو کہا اور ساتھ ہی مزدور اور معمار بھی ایک عالی شان عمارت تیار کرنے کے لیے لانے کی تاکید کی۔ لیکن اس حال کو راز رکھنے کے لیے کہا۔

حسن بانو کے بھائی کا آنکلنا بھی غیبی امداد کی ذیل میں آتا ہے۔ قصے کا یہ حصہ باغ و بہار کے چوتھے درویش کی داستان کے ایک قصے سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

غرض حسن بانو نے تمام اقربا اور معماروں کے سردار آئے اور انہوں نے اپنے عملے کو لے کر چند مہینے میں حویلی مکمل کر دی اور اس جنگل میں ایک نئے شہر کی بنیاد پڑی مگر حسن بانو نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر شہر کی بنیاد ڈالنا مناسب نہیں سمجھا لہٰذا بھیس بدل کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئی اور ایک سوداگر بچہ کی حیثیت سے بعد تسلیمات کے مدعا عرض کیا پھر حکم ہو تو فلانے جنگل میں چند روز رہوں اور ایک شہر آباد کر کے اس کا نام شاہ آباد رکھوں بادشاہ نے فرزندی کے ساتھ شرف دیتے ہوئے اجازت دے دی۔ جو چاہے سو کر، جہاں چاہے وہاں رہ کچھ اندیشہ خاطر میں نہ لا جو چاہے سو لے جا۔"

شہزادی اور وزیرزادی کا مردانہ بھیس بدل کر کسی دربار میں پہنچنا عام طور پر کہانیوں میں مل جاتا ہے۔ جہاں تک سوداگروں کی طرف سے شہر بسانے کی بات ہے تو تاریخ اس کا بھی ثبوت مہیا کرتی ہے کہ بادشاہ کی طرف سے سوداگروں۔ امیروں اور وزیروں کو زمین دی جاتی تھی کہ وہ وہاں اپنے لیے کوٹھیاں اور محل بنائیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو راجہ بھی یہ سلوک کیا کرتے تھے۔ اور ہندوستان میں مغلوں نے انگریزوں کو یہ اجازت دی تھی۔

حسن بانو نے بادشاہ سے شہزادوں میں شمار کے بعد کسی عمدہ خطاب کی طلب نہیں کی بادشاہ نے اس کا نام ماہ روشاد رکھا اور شہر کے قریب شہر بسانے کی آرزو کا اظہار کیا پر ماہر وشاد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا اور گزارش کی۔" وہ صحرا نہایت دلچسپ ہے اس کے سوا نزدیک دارالسلطنت کے دوسرا شہر آباد کرنا ترک آداب ہے۔" امیدوار فضل وکرم کا ہوں ارشاد ہو تو اس جنگل میں شہر بسائیں۔"

دو سال بعد شہر تیار ہوا اس درمیان حسن بانو برابر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوتی رہی۔ ایک دن بادشاہ نے حسن بانو کو اپنے ساتھ درویش کے پاس لے جانا چاہا وہ راضی ہوگئی۔ رخصت کے وقت رسماً حسن بانو نے کہا۔

اگر پیر و مرشد اس کمترین کے گھر قدم رنجہ فرمائیں سرفرازی و بندہ نوازی ہے اور یہ بات بزرگوں کی خصلت سے بعید نہیں۔" اس پیر نے کہا۔

" بابا البتہ میں آؤں گا۔"

اس پر حسن بانو نے کہا۔" صلاح یہ ہے کہ یہاں ایک حویلی برزخ سوداگر کی قابل بادشاہوں کے ہے۔ بالفعل خالی پڑی ہے۔ اگر خداوند دو چار دن کے لیے عنایت کریں تو یہ غلام ایسے ولی کی خدمت قرار واقعی کرے اور دولت کے زوال سے بہرہ مند ہو۔" بادشاہ کا ماتھا ٹھنکا اور کہا " تو نے اس کی خبر کہاں پائی"؟ حسن بانو نے کہا۔" اکثر اس شہر کے رہنے والے اس کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا نام بخوبی لیتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔" اے ماھرو یہ حویلی ہم نے تجھ کو بخشی۔"

حویلی کی درستی کروائی اور ایک مہینے بعد ضیافت کا سامان حویلی میں بھجوایا۔ پہلے سامان سے کہیں بڑھ چڑھ کر۔ جب ضیافت کی پوری تیاری ہوگئی تو پیر شاہ کو کہلا بھیجا۔ اگلے دن صبح اس معمول کے مطابق سونے چاندی کی اینٹوں پر پاؤں رکھتا ہوا آگیا اور مسند شاہانہ پر آکر بیٹھ گیا۔ خوان زر و جواہر مع طاؤس و مرصع کے نذر کئے مگر اس نے قبول نہ کیے۔ حسن بانو نے سب زر و جواہر طاقوں میں رکھ دیئے۔ اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا اور پیر و مرشد نے اپنے چالیس فقیروں کے ساتھ کھانا کھایا۔ دو چار لقمے کھا کر کہا۔" بس فقیر کو پیٹ بھر

کھانا اچھا نہیں لگتا۔" کیونکہ اگر پیٹ بھر کھائیں گے تو عبادت الٰہی نہ کر سکیں گے۔" پھر عطردان سے عطر ملا اور پاندان سے پان لیا دو گھڑی بعد رخصت ہوا۔ اور ان چوروں سے کہا آج رات سارا سامان چرا کر اپنے گھر لے آؤ۔ اور آدھی رات کو حسن بانو کے گھر آپہنچا۔ حسن بانو پہلے ہی سے تیار تھی۔ غرض کہ گھر کا تمام مال و اسباب چرا کر گھر سے باہر نکلے۔ ایک دم کوتوال نے گھیر لیا اور وہ سب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بادشاہ کو جب علم ہوا تو بادشاہ نے سب کو پھانسی دی اور اپنے درویش اور پیر و مرشد کے کئے پر نہایت شرمندہ ہوئے۔ اس کے بعد حسن بانو نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی یہ لونڈی موروثی برزخ سوداگر کی بیٹی ہے۔" ارزق کا گھر بادشاہ کے حکم سے کھدوا گیا۔ اور برزخ کا سارا سامان وہاں سے برآمد ہوا۔ حسن بانو نے بادشاہ کو نذر کیا اور اپنے یہاں آنے کو کہا۔ تاکہ اپنی حقیقت ظاہر کردے۔ اور جو کچھ تھی سب کا سب حضور عالی میں نذر گزرائے۔

دو دن کے بعد بادشاہ حسن بانو کے شہر شاد باد گیا۔ وہ شہر سے باہر استقبال کو پہنچی۔ اور بڑے تزک و احتشام سے محل میں لے گئی۔ مسند پر بٹھایا دوسرا طاؤس مرصع اور کئی خوان زر و جواہر کے لا کے رکھے اور پھر بادشاہ کو ساتوں کنویں زر سرخ سے بھرے ہوئے دکھلائے اور دست بستہ ہو کر کہا۔" اہلکاروں کو حکم فرمائیں کہ اس مال و اسباب کو چھکڑوں میں لاد کر خزانہ شاہی میں داخل کریں۔

چھکڑوں میں دولت کا بھر کے جانا اس بات کی علامت ہے کہ بادشاہ تو بادشاہ رعایا کے لوگ بھی کس قدر دولت مند اور خوش حال تھے۔

زر سرخ کے کنوؤں میں سے چاہا کہ ان کو نکال لیں مگر وہ زر سانپ بچھو کی صورت ہو گیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بادشاہ حیران ہوا اور حسن بانو کا چہرہ زرد ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ کچھ اندیشہ نہ کر حق تعالیٰ نے یہ سب مال و اسباب تیری ہی قسمت میں لکھا ہے تو مختار ہے دوسرا اس کو کوئی نہ نکال سکے گا۔

خزانے سے متعلق یہ روایت قدیم زمانے سے رواج پائے ہوئے اور حقداری کو ملنے کا ثبوت ملتا ہے۔ ورنہ اشرفیاں کوئلہ ہو جاتی رہی ہیں اور سانپ بچھو خزانے کے

ساتھ لازم وملزوم رہے ہیں اور معاشرے کا ایک پہلو. ایسے درویشوں سے متعلق رہا ہے اور بادشاہ بھی ایسے ہی گزرے ہیں. خوش عقیدہ اور پیر پرست. ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا مان لیتے تھے اور اَن ہونی ہونی بنتی رہی ہے. مگر یہ سب کچھ جب سے بادشاہت یا اقتدار اعلیٰ کا رواج ہوا معاشرہ کا حصہ رہے ہیں. حسن بانو جیسی ہستیوں کے ہاتھوں تائید غیبی سے یہ طلسم ٹوٹتے رہے ہیں. اور طلسم کاروں کی عقل پر پردے پڑے ہوئے رہے ہیں. لیکن وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتے رہے ہیں.

بادشاہ نے حسن بانو کو سات کنوؤں کا زر سرخ راہ خدا میں صرف کرنے کی اجازت دے دی حسن بانو نے ایک عالی شان مسافر خانہ بنوایا اور ہر مسافر کو کھانا کپڑا اور جنس دے کر رخصت کرنے کا اہتمام کیا. ہوتے ہوتے اس کا مسافروں سے یہ سلوک ہر طرف مشہور ہو گیا.

یہ خبر شہر خوارزم میں پہونچی تو وہاں کا بادشاہ بھی وسیع ملک اور بڑی فوج کا حامل تھا. منیر شامی اس کا چودہ برس کا نوجوان اور خوبصورت بیٹا تھا. اس نے حسن بانو کی خوبصورتی اور سخاوت کی شہرت سنی اور اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا. اس نے ایک مصور کو حسن بانو کی تصویر بنا لانے پر متعین کیا وہ مصور شاہ آباد پہنچا گئی نوکر اسے اپنے اپنے گھر لے گئے اور خاطر تواضع کی رخصت کے وقت حسن بانو کے پاس پہنچایا اس نے باقی عمر حسن بانو کے سایہ دولت میں بسر کرنے کی آرزو کی اور بتایا وہ مصور ہے اور جس کی چاہے تصویر پس پردہ کھینچ سکتا ہے. اس کو ملازمت میں رکھ لیا. اور تھوڑے دن کے بعد اس کو بلوایا اور کہا " اے مصور میری تصویر بے دیکھے کھینچ ". مصور نے کہا آپ کوٹھے پر چڑھ جئیں اور ایک لگن پانی کی بھروا کر زیر دیوار رکھوا دیں. میں پانی سے ذرا عکس دیکھوں تو تمہاری تصویر ہو بہو کھینچوں.

پانی سے بھری طشت میں اس کی پرچھائیں دیکھ کر مصور نے گھر آکر دو تصویریں بنائیں جو تصویر اصلی تھی وہ اپنے پاس رکھی اور دوسری تصویر حسن بانو کو دے دی اس پر حسن بانو نے مصور کو انعام دے کر رخصت کیا.

بغیر دیکھے کسی پر عاشق ہو جانا یا کسی کے حسن کی تعریف کسی سے سُن کر اس پر عاشق ہو جانا بھی ایک بہت پرانی روایت ہے جو ہماری داستانوں میں اکثر و بیشتر نظر آتی ہے.

جب مصور وہ تصویر لئے منیر شامی کے پاس پہنچا تو دیکھتے ہی اس کے ہوش و حواس جاتے رہے جب ہوش آیا تو سرد آہیں بھرنے لگا. اور نکل چلنے کا ارادہ کیا اور فقیروں کا بھیس بدل کر حسن بانو کے شہر شاہ آباد جا پہنچا. تو لوگوں نے حسن بانو کو اطلاع دی کہ ایک ایسا فقیر آیا ہے. جو کچھ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے. اس پر اس کو بلوایا گیا تو معلوم ہوا وہ زر و جواہر کا محتاج نہیں. شہر خوارزم کا شہزادہ ہے اور حسن بانو کی تصویر دیکھ کر شہزادگی پر خاک ڈال کر یہاں آپہنچا ہے. آرزو وصل چاہتا ہے. اس پر حسن بانو نے کہا." اے نوجوان اس خیال کو اپنے دل سے دور کر. کیونکہ اگر خاک ہو کر بھی اُڑے گا تب بھی ایک رونگٹے تک نہ پہونچے گا. منہ دیکھنا تو کیا ذکر ہے. کیونکہ جو شخص ہماری یہ ساتوں شرطیں پوری کرے گا. ہم اس سے شادی کریں گے. اور پھر اپنا پہلا سوال بنایا." ایک بار دیکھا دوبارہ دیکھنے کی تمنا ہے."

اس سوال پر وہ سراسیمہ ہو گیا اور آخر ایک برس کا وعدہ کر کے چلنے کا ارادہ کیا. حسن بانو نے تھوڑے روپے خرچ راہ دیئے اور نام پوچھا. پھر وہ سر بصحرا چلا ایسے کئی اور شہزادے اور وزیر زادے آئے لیکن کوئی اس کے ایک سوال کو بھی پورا نہ کر سکا.

اس معاشرے میں حاتم جیسے بہادر اور منیر شامی جیسے بزدل لوگ بھی موجود تھے. جو ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور ایک لمحہ میں سرد آہیں بھرنے لگے تھے. یہ وہی زوال پذیر معاشرے کی علامت ہے جو مغلوں کے آخری دور کا حال بیان کرتی ہے.

ایک دن منیر شامی یمن کے قریب جنگل میں جا نکلا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر زار زار رونے لگا. حاتم شکار کھیلتا ہوا اس کے رونے کی آواز سن کر بے چین ہو گیا اور اپنے آدمیوں سے کہا اس کا پتہ لگاؤ. انھوں نے واپس آکر بتایا. ایک خوبصورت نوجوان فقیروں کے حال میں وہاں کے درخت کے نیچے بیٹھا روتا ہے. نہ آنکھیں کھولتا ہے. نہ کسی سے بولتا ہے. حاتم اس طرف گیا اور دور ہی سے تماشا دیکھتا رہا. نہ رہا گیا تو

اپنے گھوڑے سے اتر کر اس کے سرہانے جا کر کھڑا ہوا اور پوچھا۔ تجھ پر ایسی کیا مصیبت پڑی جو تیری یہ حالت ہے۔" حاتم کو دیکھ کر منیر شامی بولا۔" اے بھائی کیا کہوں نہ طاقت تقریر ہے نہ قدرت تحریر ہے۔ اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جو میرا درد دل سنے اور اس کا علاج کرے۔"

حاتم نے کہا۔" تو خاطر جمع رکھ اور مجھ سے کہہ۔ کیونکہ میں نے خدا کی راہ میں کمر باندھی ہے تیرا کام بھی میں کروں گا اگر دولت دنیا درکار ہے تو ابھی لے اور کسی دشمن نے ستایا ہے تو اس کو تیرے سامنے کر دے یا ماروں گا یا آپ ہی مر جاؤں گا۔ اگر معشوق کے ملنے کی آرزو رکھتا ہے تو وہ بے سعی نہیں مل سکتا اس کی تدبیریں کروں گا۔ خدا کے فضل سے اس کو بھی تجھ سے ملا دوں گا۔ اگر سر کا طالب ہے تو یہ بھی حاضر ہے۔

اس جواب میں حاتم کا کردار اور اس کی زندگی کا نصب العین سمٹ آتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو داستان حاتم طائی اور اس کے سب قصے اس محور کے گرد گھومتے ہیں اور ممکن طور پر اس قسم کے معاشرے کی آرزو کی گئی ہے جس میں خدا کی راہ میں کمریں باندھے ہوئے لوگ ہوں۔ مظلوم کے مقابلے میں تحفظ دینے والوں اور اس میں اپنی جان کی بھی بازی لگا دیں کسی کے دل کی تمنا پوری کرنا ہو تو اس کی سعی اور تدبیر کریں اور اگر کوئی جان کی ضرورت بھی رکھے تو اسے وہ بھی حاضر کر دیں۔ منیر شامی کو حاتم کی صورت میں غیبی تائید حاصل ہو گئی۔

حاتم اسے تسلی دے کر اور اس کی ڈھارس بندھا کر اپنے ساتھ یمن لے گیا اور کئی روز اس کا دل بہلاتا رہا لیکن ایک دن اسے اداس پا کر کہا۔" میں تجھے ٹالتا نہیں اب تیرے مطلب کی تلاش کرتا ہوں اور کوشش کی کمر باندھتا ہوں۔ اور اپنے ارکانِ دولت کو یہ تاکید کر کے اس مہم پر کمر باندھی۔ جس صورت سے مسافروں کو مکان۔ بھوکوں کو کھانا۔ ننگوں کو کپڑا مفلسوں کو خرچ۔ میرے سامنے ملتا ہے اس طرح میرے آنے تک ملے جائے۔ یہ کوئی نہ کہے کہ حاتم اس شہر میں نہیں اب کون کس کو دے اس امر میں تجاہل اور تغافل نہ کرنا بلکہ یہ کاروبار بخوبی جاری رکھنا۔"

پہلے منیر شامی کے ساتھ شاہ آباد پہنچا اور حسن بانو کو اطلاع ہوئی۔" حاتم نام کا ایک

شخص تازہ وارد تمہارے سوالوں کے جواب دینے پر مستعد ہے لیکن منیر شامی بھی اس کے ساتھ ہے۔" حسن بانو نے دونوں کو بلوایا حاتم نے منیر شامی کو صورت دکھانے کے لیے اور اس کے دل کو کچھ تسکین دینے اور اس کو زندگی کا پھل پانے کے لیے۔ حسن بانو کو کہا۔ وہ بولی میں نامحرم کے سامنے کیوں کر آؤں[۱]۔۔۔ جو کوئی ساتوں سوال پورے کرے گا وہی عقد کے بعد گلستان عیش سے گل راحت چنے گا اور شراب وصل پئے گا۔" حسن بانو نے حاتم کی یہ بات مانی کہ اگر وہ ان سوالوں کو پورا کرے تو وہ جسے چاہے حسن بانو کو بخش دے اور منیر شامی کو یہ قول بھی دیا کھانے کے بعد پہلے سوال کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد حاتم نے کہا۔" یہ میرا بھائی ہے جب تک میں یہاں نہ آؤں تب تک اس کو اپنی مہمانی میں رکھنا اور خاطر داری کیا کرنا۔"

---

[۱] پردے کا رواج اس معاشرے میں عام تھا۔ مسلمان عورتیں تو پردہ کرتی ہی تھیں بلکہ ہندو خواتین بھی پردے کی پابند نظر آتی تھیں۔

پہلا سوال

جاتے جاتے حاتم سوچ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں کس سے کہوں بے دیکھے بھالے کدھر جاؤں اور اس عقدہ کی گرہ کیونکر کھولوں مگر برائے خدا یہ مشکل اپنے اوپر لی ہے اور آسان کرے گا۔ مجھ سے تو کچھ ہو نہیں سکتا۔

یہ دہی فلسفہ ہے۔

السعی منی والاتمام من اللہ۔

یعنی انسان کا کام کوشش کرنا ہے نتیجہ خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے اور اس کو تقدیر پرستی کی بنا بنا لینا غیر ضروری تقسیم کی مثال ہے۔ مگر اس سے ذہن تقدیر پرستی کی طرف مائل ضرور ہوتا ہے اور نتیجہ کی توقع سے عمل بھی غائب ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل کرنا اور عمل کے لیے صحیح طریقہ کار اختیار کرنا انسانی فرائض کا حصہ ہے۔ اور نتیجہ کے لیے خدا پر بھروسہ ہی توکل ہے۔

حاتم نے ایک بھیڑیئے کو دیکھا کہ ایک ہرنی کو چیر پھاڑ کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ پکار کر بولا کہ اے نابکار۔ خبردار کیا کرتا ہے۔ یہ غریب بچے والی ہے۔ دودھ اس کی چھاتیوں سے بہا جاتا ہے۔ یہ ہرنی جو بچے والی ہے اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

یہ احساس کہ دودھ پلانے والے جانوروں کو قتل اور ذبح نہ کیا جائے۔ مذہب کی اخلاقی روح سے بہت قریب ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات کہ جو باہمت اور باحوصلہ

اشخاص ہوتے ہیں معاشرۂ انسانی کے لیے ہی نہیں بلکہ عالم حیوانیت کے لیے کمزور جانوروں کی حفاظت بھی ان کی اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بادشاہ اور جاگیر دار خود کو اپنی رعایا کا محافظ خیال کیا کرتا تھا اور اس کی نسبت سے اس کو زمین پر اللہ کا سایہ۔ یا ظل اللہ کہا جاتا تھا۔

بھیڑیا ڈر کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید تو حاتم ہے جو ایسے وقت میں اس کے آڑے آیا ہے۔ حاتم نے کہا تو نے مجھے کیسے پہچانا بھیڑیا بولا تمام ملک اسے پہچانتا ہے وہ "ہر مخلوق کے حق میں احسان کرتا ہے۔"

حاتم کی صحیح پہچان کو ایک وحشی جانور کی زبان سے نمایاں کرایا گیا ہے اور وہ معاشرہ عملاً گویا اس پر یقین رکھتا تھا کہ جانور بے تکلف آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں وہ انسان کی بات سمجھتے ہیں اور انسان کو بھی اس زبان میں بات سمجھا سکتے ہیں یہی وجہ ہے ہماری اکثر داستانوں میں جانور آپس میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

بھیڑیئے کے یہ کہنے پر کہ تو نے میرا شکار آج میرے منہ سے کیوں چھڑایا۔" حاتم نے کہا۔ جہاں کا گوشت چاہیئے وہاں کا میرے بدن سے کاٹ کر کھا اور اپنا پیٹ بھر کر چلا جا۔ اور بھیڑیئے کے مانگنے پر ساقین کا گوشت خنجر سے کاٹ کر اس کے آگے ڈال دیا۔

بھیڑیئے نے پیٹ بھر لیا تو پوچھا ایسی کیا مصیبت آپڑی کہ جو تو اس خونخوار جنگل میں آپڑا۔ حاتم نے منیر شامی کا حال کہہ سنایا اور اس پر خاتمہ کلام کیا۔ خدا کی طرف لَو لگائے سر بصحرا چلا جاتا ہوں لیکن جو کچھ کھوج ملے گا اس کا پاؤں گا۔" بھیڑیئے نے کہا۔ میں اس مکان کو جانتا ہوں اکثر بزرگوں کی زبانی اس کا پتہ پایا ہے۔ اس کا نام دشت ہویدا ہے وہاں جو جاتا ہے یہی آواز سنتا ہے۔ حاتم کے پوچھنے پر بھیڑیئے نے اس صحرا کی نشاندھی کی۔" یہاں سے تھوڑی دور جا کر دو راستے ملیں گے تو بائیں ہاتھ کی راہ چھوڑ کر داہنے راستے پر ہو لینا یقین ہے کہ وہیں پہنچے گا اور اپنا مدعا حاصل کرے گا۔"

قربانی کا گوشت تو دوسروں کو پیش کیا ہی جاتا تھا اور آج تک تقسیم کیا جاتا ہے مگر اس سے بڑا ایثار اور قربانی یہ تھی کہ اپنا گوشت کاٹ کر دوسروں کو کھلایا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام نہ آسان ہے اور نہ قابل عمل۔ مگر وہ معاشرہ ایسی باتوں پر یقین رکھتا تھا اور ان کی آئیڈیل ازم کی تسکین اس طرح کے غیر معمولی کارناموں سے ہوتی تھی۔ یہ گویا ایک بڑے امتحان سے گزرنا ہوتا ہے۔ بعد میں گویا کامیابی کی بڑی منزل سامنے آتی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بھیڑیا حاتم کے گوشت سے پیٹ بھر کر اس کی رہنمائی دشت ہویدا کی طرف کرتا ہے۔

حاتم وہاں سے رخصت ہوا لیکن تکلیف سے اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک درخت کے نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ قریب ہی ایک گیدڑ کا بھٹ تھا۔ اور وہ گیدڑنی کے ساتھ خوراک کے لیے گیا ہوا تھا۔ واپس آنے پر حاتم کو تڑپتا ہوا پایا مادہ بولی۔ "یہ آدمی زاد کہاں سے آیا ہے۔ اب اس مکان کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ غیر جنس سے موافقت کس طرح ہو اور محبت کب تک نبھے۔" گیدڑ نے جواب میں کہا "شاید یہ نوجوان حاتم ہے اور دشت ہویدا کو جانا چاہتا ہے۔ مادہ نے کہا "تو نے کیوں کر دریافت کیا۔ اس نے کہا میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا تھا کہ فلاں تاریخ کو فلانے روز اس جگہ حاتم کا گزر ہوگا اور وہ اس درخت کے نیچے اذیتیں اٹھائے گا وہ تاریخ یہی ہے اور دن بھی وہی ہے۔

بھیڑیئے نے بھی بزرگوں سے دشت ہویدا کا پتہ پایا گیدڑ نے بھی بزرگوں کی زبانی پیش آنے والی بات جانی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں بزرگوں کی نظر دوررس ہوتی تھی۔ انسانوں ہی میں نہیں حیوانی دنیا میں بھی ایسی باتوں پر یقین کیا جاتا ہے جو وہ مستقبل کے لیے پیشنگوئیوں کے طور پر بیان کیا کرتے تھے۔ اور بزرگوں کی باتوں کو قابل یقین جانا جاتا تھا۔ یعنی بزرگوں کا بڑا احترام اور ادب ضروری تھا اور بزرگ اس احترام اور ادب کے لائق بھی تھے۔

یہاں حیرت اس پر ہے کہ گیدڑ کو صحیح تاریخ اور وقت بھی یاد تھا اور وہ اس شخص کے کردار کو بھی جانتا تھا جو اس وقت پر آنے والا تھا۔ مذاہب میں آنے والے وقت کے لیے اس طرح کی پیشن گوئیوں کا تصور کافی عام رہا ہے اور بزرگان دین کے ساتھ اس طرح کے متعدد روایتیں اور حکایتیں وابستہ کی گئی ہیں جس میں آنے والے زمانے کے بارے میں بہت سی باتیں تفصیل کے ساتھ کہی گئی تھیں۔

اس طرح کی بہت سی حکایتیں ہمیں جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بزرگوں کی محفل میں انسانوں کے علاوہ حیوانات اور غیبیات بھی شریک ہوتے تھے۔

پھر گیدڑ نے حاتم کی سرگزشت سنائی۔ تو مادہ کو تشویش ہوئی۔ کہ اس زخم کے ساتھ کس طرح اتنی دور جائے گا۔ گیدڑ نے کہا ایک جانور دشت مازندران میں ہے جسم مور کا سر آدمی کا ہے اس کا بھیجا اگر زخم پر لگے فوراً اچھا ہو جائے گا۔ کوئی اس کے پاس جاتا ہے تو وہ شربت پلاتا ہے تو مست ہو کر ناچنے لگتا ہے اور تماشا دکھاتا ہے۔ بعض آدمی محبت اس سے ایسی رکھتے ہیں جیسی عورتوں سے۔ اور مادہ سے کہا۔ اگر تو حاتم کی دن رات خبرگیری کرے تو میں اس کا سر کاٹ لاؤں اور انسان پر حیوان کا احسان ہو۔

لا علاج امراض بلکہ موت کا بھی مداوہ بعض خاص چیزوں کے ذریعہ ممکن ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ضحاک کے کندھوں پر پیدا ہو جانے والے سانپ آدمی کا مغز کھاتے تھے۔ یہاں بھی ایک خاص طرح کا پرندہ ہے جس کی شکل آدمی جیسی ہے اور اس کا بھیجا اس کے مرض کا علاج تھا۔

احسان ایک بڑی قدر جانی جاتی ہے مگر ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنے سے کم درجہ کا احسان نہ لینا چاہیئے۔ غیر کا احسان نہ لینا بھی اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔ اس لیے یہاں یہ بات کہی گئی کہ انسان پر حیوان کا احسان رہے گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جانوروں میں بھی احسان کا جذبہ موجود ہے۔

وہ گیدڑ جاتا ہے اور اسے کسی درخت کے نیچے سویا پاتا ہے اور اس کے سر کو زور سے کھینچ کر بدن سے جدا کر لیتا ہے لا کر اس کا بھیجا حاتم کے زخم پر رکھ دیتا ہے وہ ویسے ہی بھر آتا ہے اور درد جاتا رہتا ہے۔ حاتم نے کہا "یہ مجھ پر بڑا احسان کیا مگر میرے واسطے ایک جانور کی جان لی اس کا عذاب اب مجھ پر ہوگا۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا"

یقیناً اس معاشرے میں ایسے بھی انسان ہوں گے جو اپنا گوشت دے کر دوسروں کو بچائیں اور اچھا ہونے کے لیے کسی جانور کی جان کا عذاب نہ لینا چاہیں۔ اس لیے کہ

انہیں یہ خوف رہتا ہوگا کہ وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ یعنی قیامت کا تصور اس معاشرے میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی مخلوق میں سے کسی مخلوق پر ہمارا یہ حق نہیں کہ ہم اس کی جان لے لیں۔ آخر ہمیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

گیدڑ نے جواب دیا۔ "گناہ میری گردن پر ہے تو کچھ اندیشہ نہ کر ہم بھی اپنے خالق کو جانتے ہیں۔"

ہم دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک جو کرتے ہیں اس کی سب سے بہتر مثال یہ ہو سکتی تھی کہ ہم اس کے گناہ اپنے ذمے لے لیں وفاداری، صدق و خلوص کی ایسی مثالیں تاریخ اور روایت میں مل جاتی ہیں۔ یہاں ہم یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گیدڑ بھی جو ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہے اعلیٰ درجے کے اخلاق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اس میں وہی تمام صفات پائی جاتی ہیں جو نہایت عمدہ انسانوں میں ہو سکتی ہیں۔

گیدڑ کو ہندوستانی قصے کہانیوں میں بہت چالاک بنایا گیا ہے۔ اور شکاری اس کے کردار کا بہت نمایاں پہلو ہے۔ لیکن یہاں وہ مکر و فریب نہیں کرتا بلکہ نہایت رحمدل ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ گویا حیوانی اخلاقیات کے دائرۂ روایت میں نئی تعبیرات کو ظاہر کرتا ہے۔

حاتم کی کوئی خدمت پوچھنے پر گیدڑ بولا۔ اس جنگل کے قریب کفتار رہتی ہیں اور میرے بچے ہر سال کھا جاتی ہیں ہمارا اتنا قابو نہیں چلتا کہ ان کو مار کر اپنے بچے بچائیں اگر تو ان کو مارے اور ہمارے سر سے یہ آفت ہٹائے تو بڑا احسان کرے بلکہ بے داموں خرید لے۔"

گیدڑ حاتم کو ان کے مکان پر لے گیا۔ اور خود ایک جھاڑ میں چھپ رہا حاتم مکان خالی پا کر اس میں بیٹھ گیا۔ کفتاروں کا جوڑا آیا اور اس سے بولا۔ اے شخص یہ جگہ تیری نہیں۔ اگر تو اپنا بھلا چاہتا ہے تو اُلٹے پاؤں لوٹ جا نہیں تو ابھی تیرا تکا بوٹی کر لیتے ہیں۔ حاتم نے جواب دیا میں مردم آزار نہیں اگر یہ مکان تمہارا ہے تو تمہیں مبارک رہے۔ کفتاروں نے کہا آدمی کو مروت سے کیا کام۔ ہم کو فریب نہ دے چلا جا۔ حاتم نے کہا۔ اے حیوانو!

برائے خدا جیسی اپنی جان جانتے ہو ویسی ہی غیر کی بھی جانو یہ کیا نا انصافی ہے جو گیدڑ کے بچے کو مارو اور آپ کو پالو۔" اس کے بچوں کے کھانے سے توبہ کرو۔ اور غضب خدا سے ڈرو۔" بولے "کوئی دم میں وہی حال تیرا بھی ہوتا ہے۔"

حاتم نے جواب دیا اس کے بدلے مجھے کھاؤ۔ مگر ان بچوں کو کھانے سے ہاتھ اٹھاؤ اور جب حاتم نے دیکھا یہ خدا کی قسم بھی نہیں مانتے ان کو مارنا چاہیے اچھل کر دونوں کی گردن پکڑ کر زمین پر دے پٹکا اور سوچنے لگا انھیں کس طرح مارے کیونکہ انہوں نے خدا کی قسم سے انکار کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کو کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی چاہیے اور خنجر اٹھا کر ان کے دانت توڑ دیے۔ اور ناخن کاٹ ڈالے پھر دعا مانگی۔ الہٰی ان حیوانوں کا درد دور کر..... آخر وہ رو رو کر کہنے لگے۔ اب ہم کو رزق کیونکر ملے گا۔ اور ہم کیونکر جئیں گے۔ حاتم نے کہا خدا رزاق ہے۔ وہ کسی نہ کسی ڈھب سے پہنچائے گا۔ گیدڑ اپنی جگہ سے آکر بولا۔ "آج کے دن سے ان کا کھانا پینا ہمارے ذمہ ہوا۔" اس مرحلے کے بعد حاتم رخصت ہوا اور مادہ گیدڑ نے کہا کہ یہ مروت سے دور ہے۔ کہ یہ دشت ہویدا کو تنہا جائے اور اس کا ساتھ دے اور وہ کہ اس کے ساتھ آملا حاتم نے کہا ایک احسان تو اپنی گردن پر اٹھا نہیں سکتا دوسرا کیسے مول لوں۔ یہی احسان بہت ہے کہ مجھے راہ راست کا پتہ بتا دے۔"

گیدڑ نے نزدیک کے دور کے دو راستے بتائے۔ حاتم نے نزدیک کا راستہ اختیار کیا۔ اس پیراگراف سے دو تین باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے یہ کہ قسم کی بڑی اہمیت ہے اور اگر کوئی شخص قسم کو نہیں مانتا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ خدا کو نہیں جانتا۔ سچائی کا احترام نہیں کرتا ایسے شخص واجب قتل ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس زمانے میں ان سے انکار کرنے والوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ ایک طرح کی نیکی تھی۔

اس کے ساتھ دوسروں کی جان لینا بھی بہت برا خیال کیا جاتا تھا جیو ہتّیا کو آج کو بھی ہندوؤں میں بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ بلکہ مہا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے حاتم نے صرف ان کے دانت توڑ دیے اور ناخن کاٹ دیے۔ لیکن یہ سزا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت تھی۔ اس لیے کہ یہی تو ان کا وسیلۂ رزق تھا۔ اس موقع پر گیدڑ کی طرف سے

پیش کش ہوئی ہے۔ اس میں غربا۔ فقرا۔ اور مساکین کی مدد کا جذبہ نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس معاشرہ میں کسی کا احسان لینا بہت بڑی بات تھی۔ جس کو شریف النفس لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔

کچھ مدت بعد ایک چوراہے پر کھڑا سوچنے لگا کہ کدھر جاؤں یہ جنگل ریچھوں کا تھا۔ ریچھ اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ریچھ بادشاہ نے خوش ہو کر اپنے پاس بٹھایا اور حال دریافت کیا اور انداز سے کہا تم یمن کے بادشاہ ہو تمہارا نام حاتم ہے۔ اور ریچھ بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرنے کا اظہار کیا۔ حاتم نے سنتے ہی سر جھکا دیا۔ ریچھ بادشاہ بولا کیا میں تیرا خسر بننے کے لائق نہیں ہوں۔ حاتم نے کہا۔ میں انسان اور وہ حیوان موافقت کیوں کر ہو۔ ریچھ بولا۔ کچھ اندیشہ نہ کر میری لڑکی تجھ جیسی ہی ہے۔ حاتم نے شادی سے انکار کیا تو اس نے حاتم کو ایک غار کے اندر بند کر دیا اور غار کے منہ پر بھاری پتھر رکھدیا گیا۔ سات دن کے بعد پھر ریچھ بادشاہ نے بلوایا۔ اس نے پھر انکار کیا تو اس کو دوبارہ غار میں بند کروا دیا اور ایک رات خواب میں ایک پیر مرد کو دیکھا۔ "اے حاتم جب تک اس لڑکی کو قبول نہ کرے گا تب تک۔ اس قید سے نجات نہ پائے گا۔ حاتم نے کہا وہ مجھے کب فرصت دے گی۔"

پیر مرد نے جواب دیا اس کی بیٹی تجھ کو بخوبی رخصت دے گی اس کو راضی اور خوش کر جب ریچھ بادشاہ نے پھر بلوایا اور کہا تو حاتم اس شرط پر مان گیا جب میں اس سے اپنا بیاہ کروں تو کوئی ریچھ میرے گھر نہ آوے۔ کئی دنوں بعد اپنے خسر کے پاس گیا اور کہا جیوے کھاتے کھاتے گھبرا گیا ہوں اگر کچھ اناج کی قسم سے عنایت ہو تو جی بھرے اور طبیعت لگے۔

ریچھوں نے بادشاہ کا حکم ہوتے ہی سب سامان فراہم کر دیا جب کھاتے پیتے اور رہتے تین مہینے گزر گئے تو عین سرخوشی کے عالم میں حاتم نے بادشاہ سے اجازت حاصل کرنے کو کہا اور ریچھ کی بیٹی کے کہنے پر اس کو اجازت مل گئی اور ریچھ کی بیٹی نے ایک مہرہ حاتم کی پگڑی میں باندھ دیا۔

ہر معاشرے میں عام طور پر خوابوں پر بھروسہ کیا جاتا تھا۔ خاص طور پر ایسے

خوابوں میں جن میں کوئی پیر مرد آ کر پریشانیوں میں گھرے ہوئے کسی انسان کو ان پریشانیوں سے نکلنے کی راہ دکھلاتا ہے۔ اور آئندہ کے لیے خوش خبری دیتا ہے۔

پیروں فقیروں کے اثر نے خیال واعتماد کی اس دنیا میں بڑی رنگا رنگی پیدا کر دی تھی آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو بابا پیر بادشاہ کو اپنے دل کا دیوتا سمجھتے تھے۔ بادشاہ کا کسی پر سب سے بڑا احسان یہ ہوا کرتا تھا کہ اسے اپنی دامادی کا شرف بخشے مگر یہاں ایک عجب بات یہ بھی ہے کہ بادشاہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اس کی بات سے انکار کرے اور اس سے انکار کی سزا سوائے موت کے کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی۔ یہاں حاتم موت کے گھاٹ نہیں اتارا جاتا لیکن اس کو اندھے غار میں یا اندھے کنوئیں میں بند ضرور کر دیا جاتا ہے اور اس کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جو ایسے انسانوں کو دی جاتی تھیں جنھیں زندہ رکھنا مقصود ہوتا تھا۔

انگوٹھی دینا تصویر دینا اپنا بال سر سے توڑ کر دے دینا ایسے طلسمی تحفہ جات میں سے تھا جن سے وقت پڑنے پر بڑے سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا۔ یہاں حاتم کو ریچھ کی بیٹی نے ایک مہرہ دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مہرہ مصیبت پڑنے پر حاتم کے کام آئے گا۔ (پتھروں اور مہروں پر یقین سماج کے اکثر لوگوں میں پایا جاتا رہا ہے۔)

چند روز بعد ریگستان آیا نہ دانہ نہ پانی مگر برقع پوش شام کو دو روٹیاں ایک آبخورہ پانی کا دے جاتا۔ حاتم رات دن سفر جاری رکھتا کئی دنوں کے بعد پہاڑ سا ایک اژدھا نظر آیا مگر وہ چلتا رہا پاس پہونچا تو اژدھے کے سانس لینے سے ہی اس کے منہ میں چلا گیا وہاں بھی خدا کا شکر بجا لایا خدا پر بھروسہ کیے تین روز گزر گئے پر زہر نے کچھ اثر نہ کیا کیونکہ مہرہ اس کی پگڑی میں تھا۔ آخر اژدھے نے اپنا پیٹ دکھنے کی وجہ سے قے کی اور حاتم باہر آ کر اپنے کپڑے سکھانے لگا۔

اژدھے کے پیٹ میں جانے اور واپس آنے کی حکایت حضرت یونس علیہ السلام سے ماخوذ ہے جن کو مچھلی نگل گئی تھی۔ اور وہ دوبارہ زندہ واپس آ گئے تھے۔

تالاب کچھ دور پر تھا کپڑے دھونے کی غرض سے وہاں پہنچا ایک مچھلی جس کی

اس کے سامنے گیا اور سلام کیا۔ اس نے علیکم السلام کے بعد کہا۔ کہاں سے آیا ہے۔ اور اس جنگل میں کیا کام رکھتا ہے۔ حاتم نے کہا یہ معلوم کرنے کے لیے کہ تم نے ایسا کیا دیکھا جس کے دیکھنے کی دوبارہ آرزو رکھتے ہو۔ اس کے بیٹھنے کو کہنے پر حاتم بیٹھ گیا۔ رات کو دو روٹیاں اور دو آبخورے پانی کے آئے کھا پی لینے کے بعد وہ کہنے لگا۔

پانی میں جل پری کا نکلنا اس عہد معاشرت کے اس خیال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ پانی کے اندر بھی ایک دوسری دنیا موجود ہے۔ خوبصورت محل اور حسین عورتیں ہیں جن کے چہرے اور جسم ہماری دنیا کے طلسماتی سے زیادہ پرکشش ہے۔ ایک ہی محل میں بہت سی عورتوں کا جمع ہونا راجاؤں کے ان راس اور بادشاہوں کے محل میں حرم سراؤں کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے

تخت کا ہونا اور اس پر حاتم کا بیٹھنا شادی بیاہ کے موقع پر ادا کی جانیوالی بعض رسموں کا عکس ہے ایک حسین عورت کا تخت کے نیچے موجود ہونا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عالم خلوت میں بھی بادشاہ کسی حرم کے ساتھ تنہا نہیں ہوتا تھا بلکہ حفاظت کے خیال سے دوسری کوئی عورت پردے کے پیچھے موجود ہوتی تھی۔

جنگل میں سیر کرتا ہوا ایک تالاب خوش قطع پر جا نکلا کنارے بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا کہ ایک عورت سر سے پاؤں تک ننگی تالاب سے نکلی اور اندر لے گئی۔ اور ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا میں تماشا دیکھنے لگا تو ایک نازنین منہ پر نقاب ڈالے تخت کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی غش آ گیا نقاب اٹھا کر جو اس کا منہ دیکھا تو خدا کی قدرت کی داد دینی پڑی اس کو ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ویسے ہی ایک عورت تخت کے نیچے سے نکلی اور ایک لات ایسی ماری کہ اس جنگل میں آ پڑا۔

بعض ہندوؤں کے مندروں کی مورتیوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ رانیاں شہزادیاں ایک خاص طرح کا جھالر دار لباس پہنے ہوتی تھیں لیکن ان کی جوان خادمائیں اور کنیزیں برہنہ بھی رہتی تھیں جس کا مقصد غالباً خلوتوں میں باریاب ہونے کی جنسی خواہش پر برانگیختہ کرنا ہوتا تھا موہن جداڑو کی مورتیوں میں رقاصہ کی جو تصویر ملتی ہے وہ بھی بالکل برہنہ ہے۔

حاتم نے کہا تم اس تماشے کو دوبارہ دیکھنا چاہتے ہو تو اس پیر مرد نے کہا کہ یہ بات بہت محال ہے۔ حاتم نے کہا چل میرے ساتھ یہ جلسہ میں تجھے دکھاؤں گا۔ کبھی ان کو ہاتھ نہ لگانا میں بھی ایک بزرگ کی دستگیری سے یہاں آیا ہوں۔ ورنہ یہاں آنا ممکن نہ تھا۔

یہ کہہ کر حاتم شاہ آباد کی طرف روانہ ہوا اور سب وعدے پورے کرتا ہوا شاہ آباد پہنچا حاتم کو حسن بانو کے آدمی اس کے پاس لے گئے اور حاتم نے سب داستان کہہ سنائی۔

یہاں جو آدمی حاتم کی دشت نوردی کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی تمنا ہے اس کے کردار میں ہمیں مجنوں کے کردار کا عکس ملتا ہے۔ جو لیلےٰ کے عشق میں گرفتار ہو کر زندگی بھر صحرا نوردی کرتا رہا اور لیلیٰ لیلیٰ پکارتا رہا۔

حاتم آٹھ دن کارواں سرائے میں منیر شامی کے ساتھ رہا اور نویں دن حسن بانو سے دوسرا سوال معلوم کیا اور چل پڑا۔

دوسرا سوال

"نیکی کر دریا میں ڈال"

نیکی کر دریا میں ڈال. کیا بھید ہے کون سی نیکی اس شخص نے کی ہے جس نے اپنے دروازے پر یہ نوشتہ لگایا ہے۔

حاتم کے پوچھنے پر حسن بانو نے بتایا کہ اس کی دائی نے بتایا تھا کہ اس کی جگہ اُتر کی طرف ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ چل پڑا۔ کئی دنوں بعد ایک ہیبتناک جنگل میں پہنچا اور شام کے وقت ایک درخت کے نیچے چپ چاپ بیٹھ رہا کہ درد بھری آہ وزاری کی آواز ایک طرف سے آئی۔ حاتم سے نہ رہا گیا وہ اس طرف کو چلا۔ وہاں پہنچا تو دیکھتا ہے کہ ایک خوبصورت جوان زمین پر بیٹھا آنسو بہائے جا رہا تھا اور آہیں بھر رہا ہے۔ حاتم کے پوچھنے پر اس نے کہا: "میں سوداگر ہوں یہاں سے بارہ کوس پر ایک شہر ہے حارس نام کا ایک مالدار سوداگر ہے۔ رشک قمر اس کی بیٹی ہے۔ اتفاق سے پھرتا پھراتا سوداگری کا مال لیے ہوئے اس شہر میں جا نکلا۔ حارس کی حویلی کے نیچے دھوپ کے مارے بیٹھ گیا۔ نظر کوٹھے کی طرف جو گئی تو وہ نازنین نظر آئی۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ اس کا باپ اس کا بیاہ نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی تین سوال رکھتی ہے۔ جو پورے کرے اس کی ہو جائے۔ اس کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور اس نے اندر بلوا کر تینوں سوال بتائے۔ (۱) اس شہر کے قریب ایک غار ہے وہاں آج تک کوئی نہیں گیا۔ اور معلوم نہیں کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے۔

(۲) شب جمعہ کو ایک آواز جنگل سے آتی ہے کہ میں نے وہ کام نہ کیا جو آج کی شب میرے کام آتا۔ (۳) وہ مہرہ جو سانپ کے پیٹ میں ہے اس کو مجھے لا دے۔

رہے سہے ہوش و حواس بھی نہ رہے میں نے ذرا پاؤں کھینچا اس نے دست ظلم سے میرا مال و اسباب زر و جواہر لوٹ لیا۔ اور مجھ کو اپنے شہر سے نکال دیا میں اس جنگل میں آ پڑا۔

حاتم نے دلاسہ دیا شہر اپنے ساتھ چلنے کو کہا اسباب دلوانے اور معشوقہ سے ملوانے کا وعدہ کیا۔ سوداگر کو لے کر شہر گیا۔ اسے کاروان سرائے میں ٹھہرایا خود سوداگر زادی (حارس کی بیٹی) کی حویلی پر گیا اور کہلا بھیجا میں بیاہ کرنے کو آیا ہوں۔ اندر بلوایا اور عہد و پیمان جو لینے تھے سو لیے۔ اس کے بعد حاتم نے کہا " تو حارس سوداگر کی بیٹی ہے اگر وہ اس بات پہ ہاتھ مارے اور اقرار کرے تو میں اس کی سعی میں کمر باندھوں۔

اس میں کہانی کی پراسرار فضا کے علاوہ اس وقت کے ذہن کی عجوبہ کاری بھی موجود ہے۔ غار ایک زمانے سے انسانی تہذیب میں ایک خاص کردار ادا کرتے رہتے ہیں اسی طرح آوازیں بھی۔ یہاں ایک کہانی دوسری کہانی کو جنم دے رہی ہے۔ ایک سوال سے دوسرا سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس عہد میں اسی طرح کے سوال اور اسی نوع کے مطالبے اور آزمائشیں ضروری خیال کی جاتی تھیں ہم مختلف قصوں اور کہانیوں میں بھی اس طرح کے سوالوں اور آزمائشوں کی صدائے بازگشت سنتے ہیں۔

اس کہانی میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کا خوف دیوؤں اور پریوں کو بھی ہوتا تھا یعنی اس معاشرے میں ایسا ہی جانا جاتا تھا اور پھر یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہ کو ہر بات کی خبر کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جائے گی۔ اس لیے وہ لوگ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کے جاسوس ہر روپ میں جگہ جگہ موجود رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انسان تو انسان حیوان اور جنات دیو وغیرہ بھی بادشاہ کی خلاف ورزی سے ڈرتے تھے۔

اسے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ یہ کہنے پر کہ بادشاہ سے کون کہے گا وہ بولا انہی کی صورتوں میں مدعی بہت سے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم سب کے سب اس سے دست بردار ہو جاؤ۔ آگے گیا تو بہت سے دیوؤں نے ہر طرف سے گھیر لیا اور کھانے کا ارادہ کیا۔ ان میں سے

بھی ایک نے کہا بادشاہ کو پہنچاؤ۔ اس کی بیٹی بیمار ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کے علاوہ ایک اور موقع میں آئے جو لوگ پکڑے ہیں۔ وہ اس کو اپنے رئیس جاگیردار کے پاس لے جاتے ہیں جس کی بیوی کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اور جن سے آنکھوں پہر پانی بہتا ہے۔

جب ہم اس طرح کی حکایتیں پڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود اس دور میں سفر کر رہے ہیں

حاتم نے ایک مہرہ اپنی پگڑی سے کھولا اور پانی میں رگڑ اس کی آنکھوں میں لگا دیا۔ اس نے اسی وقت درد سے نجات پائی۔ اور دو تین بار لگانے سے آنکھوں سے پانی گرنا بند ہوگیا۔ سردار نے بہت خدمت کی اور چند روز بعد بادشاہ کے پاس لے گیا اور اس کی حکمت کی تعریف کی۔ بادشاہ نے اپنے آزار شکم کا علاج چاہا۔

دستر خوان پر کھانے چنے گئے۔ بادشاہ کھانا شروع کرنا چاہتا تھا کہ حاتم نے ذرا توقف کرنے کو کہا۔ اور ایک قاب سے سرپوش اٹھایا اور اسے سب کو دکھایا پھر اسی طرح ڈھانپ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کو کھول کر دیکھنے کو کہا کھولا تو تمام قاب کیڑوں سے بھری تھی۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ "یہ سب ان دیووں کی نظر کے سبب سے ہے۔ آپ کو لازم ہے کہ نعمت خانے میں اکیلے کھانا نوش جان کیا کریں تاکہ یہ اس کو نہ دیکھیں"

یہ نظر لگنا بہت سے لوگوں کے خیال میں محض واہمہ ہے لیکن شواہد اور نتائج اسے اکثر و بیشتر حقیقت مان لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ بادشاہوں اور امیروں کے دستر خوان پر بہت سے لوگ نہ جانے کس زمانے سے موجود رہتے آئے ہیں۔

بادشاہ رئیس اور جاگیردار اپنے دستر خوان پر بہت لوگ مدعو کرتے تھے لیکن خاص ان کے لیے جو قاب یا ڈش تیار ہوتی تھی اس میں سب شامل نہیں ہوتے تھے ظاہر ہے کہ دوسرے کھانے والوں کے ذہن میں یہ بات تو رہتی ہی ہوگی۔ علاوہ بریں محلات اور درباروں کی سازشوں کے باعث جاگیردار یا بادشاہ کے کھانے میں زہر بھی ملا دیا جاتا تھا۔ اسی لیے بادشاہوں اور امیروں کے معاملے میں یہ بھی سنا ہے کہ

اور ہوتا رہا ہے۔ وہ خاص طرح کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں: یشب کے برتن میں اگر کوئی زہرناک چیز اتار دی جائے تو پتھر کا رنگ فوراً بدل جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے برتن میں زہر ملا ہوا ہے۔

بادشاہ کے علاج کے علاوہ حاتم اس کی بیٹی کا بھی علاج کرتا ہے اور اُسے وہ مہرہ گھس کر پلاتا ہے جو ریچھ کی بیٹی نے اسے دیا تھا۔ جس سے اس کو تمام رات متلی ہوتی اور دست آئے اور بُرا حال ہوجاتا ہے لیکن حاتم اسے تسلی دیتا ہے اور صبح ہوتے ہوتے لڑکی کی حالت درست ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خاصا کھانے کے لائق نظر آتی ہے اس واقعہ میں کوئی ندرت تو نہیں ہے لیکن اس سے اس زمانے کی طب اور اس کے ماہروں کے فنی کمالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بڑے بڑے ماہر طبیب اپنے پاس بھی کچھ دوائیں رکھتے تھے جو عام نسخوں میں لکھی جانے والی دواؤں سے الگ ہوتی تھیں۔ اسی کے ساتھ زہر مہرہ بہت سی دواؤں میں کام کرتا تھا۔ اسی کے نتیجہ میں بادشاہ نے حاتم کی مدد کی۔ اور وہ دیووں کی مدد سے اس کے قریب پہنچا اور اس کی گہرائیوں کی خبر لایا۔ ہم دیکھتے ہیں اس دور میں سرنگیں ہوتی ہیں اور ایک سرنگ ایک شہر سے دوسرے شہر بغیر کسی کے علم و اطلاع کے آدمی پہنچ سکتا ہے۔ جس کا استعمال صرف بادشاہ کرتے تھے۔

دوسری شرط کے لیے حاتم روانہ ہوا چند روز کے بعد اس نے وہ آواز سنی جو حارث کی بیٹی جمعہ کی رات کو سنتی تھی۔ اس کی تلاش میں گیا یکا یک ایک گاؤں دکھائی دیا وہاں کے لوگ رو پیٹ رہے تھے۔ حاتم نے خلقت سے اس گریہ وزاری کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ ساتویں تاریخ پنجشنبہ کے دن ایک بڑی بلا آتی ہے اور ایک آدمی کو کھا جاتی ہے اگر کسی کو اس وقت نہ پائے تو شہر ہی اجاڑ دے اب کے رئیس کے لڑکے کی باری ہے۔ یہ سن کر حاتم رئیس کے پاس گیا اور کہا: "تیرے بیٹے کے بدلے میں جاؤں گا۔ حاتم نے اس کی صورت معلوم کرنا چاہی۔ رئیس نے اس کی صورت زمین پر کھینچ کر دکھلا دی۔ حاتم نے اس کا نام خلوقہ بتایا۔ اور کہا۔ یہ تمہارے مارنے سے نہ مرے گی نہ چوٹ ہی کھائے گی۔ میرا کہنا مانو تو میں اس بلا کو ٹالوں اور جیسے بھی بنے ماروں۔" کوئی شیشہ گر بھی ہے؟" رئیس نے

کہا۔ جتنے چاہو۔"

دونوں شیشہ گر کی دوکان پر گئے اور کہا ایک آئینہ دو سو گز لمبا اور سو گز چوڑا تیار کرو۔ آج سمیت چار روز میں۔ انہوں نے تین روز میں آئینہ تیار کر دیا اور بلا آنے کی جگہ پربستی کے لوگوں کے ہاتھوں پہنچا دیا۔ ایک چادر لائی گئی جس سے آئینہ ڈھانپ دیا گیا۔ اور سب سے اپنے اپنے گھر جا بیٹھنے کو کہا۔ اگر کوئی تماشا دیکھنا چاہے تو میرے ساتھ رہے۔" اور کوئی نہ بولا۔ رئیس کا لڑکا کہہ اٹھا۔" میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

وباؤں کا آنا اور شہر کے شہر خالی ہو جانا یہ تو ہوتا ہی تھا کبھی کبھی اس میں عجب صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی، بلا آکر کسی خاص شخص کو لے جاتی تھی۔ یہ اس دور کی کہانیوں میں بہت ہے۔ اور غالباً اس عقیدے کی پیداوار ہے کہ جس کی آتی ہے وہی جاتا ہے۔

بلاؤں کو روکنا یا ہلاک کرنا تدبر اور تدبیر کی غیر معمولی صورتوں کے ساتھ ہی ممکن تھا۔ اور یہاں ہم وہی دیکھتے ہیں۔ اتنے بڑے آئینے کا تعمیر کرنا اور بنانا اساطیری روایت کا عکس ہے اور بہت خوبصورت ہے اس تدبیر کا انجام کیا ہوا اس دلچسپ حکایت کو یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد جب قصہ آگے بڑھتا ہے تو ہم ایک دوسری طلسمی دنیا میں پہنچتے ہیں اور پراسرار آوازوں کو کچھ اس طرح سنتے ہیں جیسے یہ آوازیں صدیوں سے گزرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی ہوں۔

آواز آنے پر سب سہم گئے اور خلوقہ (بلا) نو ہاتھ۔ نو پاؤں۔ نو منھ۔ گیند کی مانند دوڑا چلا آیا۔ دھواں اور شعلے اس کے نووں منھ سے نکلتا تھا۔ حاتم نے اُسے آ پہنچا دیکھا تو آئینے سے چادر اوپر اٹھا دی۔ اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو ایسا نعرہ لگایا کہ گاؤں اور جنگل کی زمین ہل گئی۔ خلقت بے ہوش ہو گئی۔ اور اس حد تک کھنچا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا۔

پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ آج بروز جمعہ ہے اور سنا ہے کہ ایک آواز اس جنگل کی طرف سے آتی ہے اس کی تحقیق کے لیے نکلا ہوں۔ رئیس نے بھی تصدیق کی کہ وہ بھی ایک مدت سے اس آواز کو سنتا ہے لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے آتی ہے اور کس کی آواز ہے۔

رات ہوئی تو وہی آواز آئی۔ وہ اس طرف روانہ ہوا اور کئی دن میں ایک ٹیلہ نظر آیا۔ اس کے نیچے پانچ چھ سو سوار اور پیادے ہیں غور سے دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ ایک قبرستان تھا حاتم نے دل میں کہا یہ مزار صاحب کمالوں کے ہیں یہ آواز یہیں سے آتی ہے۔ وہیں بیٹھا۔ آواز پھر آئی۔ حاتم خدا کی یاد میں مشغول تھا۔

آخری جملہ بتا رہا ہے کہ بعض کلمات دافع بلا کے لیے بے حد مقدس اور متاثر خیال کیے جاتے تھے۔

پھر رات جا چکی تو ہر ایک قبر سے ایک شخص بزرگ صورت نکلا۔ فرش بچھا کر نورانی حلے پہن کر اپنی اپنی مسند پر بیٹھے کہ ایک ٹوٹی قبر سے ایک شخص بہ حال تباہ نکلا اور خاک پر بیٹھ گیا۔ مسند نشینوں میں سے کسی نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ اور قہوہ پیتے رہے۔ کسی نے قہوہ نہ دیا۔ اس نے سرد آہ کھینچ کر وہی آواز کی۔ تھوڑی دیر میں خوان غیب سے آ گئے۔ ہر ایک خوان میں ایک ایک پیالہ کھیر کا اور ایک کٹورا پانی کا تھا۔ ایک ان میں سب سے جدا تھا۔ انہوں نے کھاتے ہوئے کہا۔" اے عزیزو۔ آج کی رات ایک مسافر ہمارے یہاں مہمان آیا ہے۔ اس کو لے آؤ کہ یہ خوان علیحدہ اس شخص کا حصہ ہے۔ ایک شخص اٹھا اور حاتم کو لا کر مسند پر بٹھایا اس میلے کچیلے آدمی کے سامنے بھی ایک خوان تھا۔ مگر اس میں ایک پیالہ تھوہر کے دودھ اور سنگریزوں سے بھرا ہوا تھا اور کوزے میں پانی کی جگہ پیپ اور لہو۔

انہوں نے حاتم کے پوچھنے پر کہ یہ کیا راز ہے؛ کہا "یہ اس سے پوچھ ہم آگاہ نہیں۔" حاتم اٹھ کر اس کے پاس گیا اور معلوم کیا۔ وہ آنسو بھر کر بولا "میں ان لوگوں کا سردار ہوں اور میرا نام یوسف سوداگر ہے۔ کبھی خدا کی راہ میں کوڑی پیسہ دانہ پانی کپڑا لتا آپ دیتا نہ کسی کو دینے دیتا۔ اکثر غلاموں کو خیرات کرنے پر مارتا بھی۔ وہ کہتے کہ ہم خدا کے واسطے دیتے ہیں کہ ہماری عاقبت میں کام آئے گا میں ان پر ہنستا.... ایک دن چور آ پڑے ہم سبھوں کو لوٹا مارا یہیں گاڑ دیا۔ انہوں نے اپنی سخاوت کے سبب ایسا مرتبہ پایا اور میں اپنی بخیلی کے باعث اس بلا میں مبتلا ہوں.... اولاد میری خراب حال

ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج بھیک مانگتی پھرتی ہے۔

حاتم نے پوچھا کوئی طریقہ تیری نجات کا ہے۔ اس نے کہا۔ "کوئی میری داد کو نہیں پہنچتا۔ مگر آج کی رات تو آیا ہے اگر تجھ کو خدا توفیق دے تو شہر چین میں میری حویلی سوداگروں کے محلے میں ہے اور یوسف سوداگر نام مشہور۔ وہاں جاکر محلے والوں سے میرا حال کہہ ..... اور فلاں جگہ میرا مال و جواہر ہے ... اور بے قیاس گڑا ہے۔ اس کو نکال کر چار حصّہ کرکے ایک حصہ ان میں سے میرے فرزندوں کو دے اور تین حصے خدا کی راہ میں خرچ کر۔

عاقبت کا خیال اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور اس کا عاقبت میں کام آنے کا عقیدہ نیز عاقبت میں عذاب سے نجات پانے کا یقین اگر عزیز و اقارب اس کی نجات کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کریں، بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ ننگوں کو کپڑا پہنائیں۔ مسافروں کو خرچ دیں یا اس کے مال میں سے زیادہ حصّہ محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ نظریے اس دور کے معاشرے کے اہم ارکین میں شمار کیے جاتے تھے اور آج بھی بہت سے لوگ ان کے معتقد اور عامل ہیں۔

حاتم ایک مدت میں ایک مکان پر پہنچا دیکھا ایک شخص کنوئیں پر کھڑا پانی بھرتا ہے حاتم نے چاہا کہ اس کے ہاتھ سے ڈول لے کر پانی پیے کہ ایک سانپ نے ہاتھی کی سونڈ کے مانند منہ نکالا اور اس شخص کی کمر پکڑ کر کنوئیں میں کھینچ لیا۔ حاتم دل میں کہنے لگا۔ "اے موذی یہ کیا کیا تو نے۔" اور کنوئیں میں کود پڑا۔ جب زمین پر اس کا پانوں لگا تب دیکھا نہ وہ چاہ ہے نہ وہ پانی۔ ایک میدان وسیع ہرے بھرے درختوں سے بھرا اور ان درختوں میں سے نمایاں ایک محل ہے۔ حاتم اس طرف کو چلا۔ حویلی کے پاس پہنچا تو ایوان اور بیٹھکیں تیار پائیں۔ ایک مکان میں بلّور کا تخت اس کے نیچے ایک مرد دراز قد سوتا ہے وہاں گیا اور ذرا آگے ہو کر دیکھنا چاہا اور سرہانے کھڑا کر جی میں کہنے لگا۔ جب یہ اٹھے گا تب اس سے حال پوچھوں گا۔ کہ وہی سانپ مسافر کو باغ میں کہیں چھوڑ کر حاتم پر لپکا غصے میں وہ پہلے ہی تھا دونوں ہاتھوں سے سانپ کو پکڑ لیا اور اتنی زور سے دبایا کہ وہ چلانے لگا۔ اس سے دیو چونک پڑا اور پکار کر کہا۔ "اے عزیز کیا کرتا ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے چھوڑ دے۔" حاتم نے کہا۔

جب تک یہ مسافر کو نہ چھوڑے گا تب تک میں اسے نہ چھوڑوں گا۔"

دیو نے سانپ سے کہا۔ "خبردار یہ کوئی بڑا ہی زبردست معلوم ہوتا ہے۔ غالب ہے کہ یہیں ہمارے طلسم کو توڑ دے اور تیرے منہ میں بیٹھے۔

یہ کہانی کسی طلسمی داستان کا ایک حصّہ معلوم ہوتی ہے اور اس پر دیو مالائی کہانیوں کا گہرا اثر ہے۔ کنواں۔ سانپ۔ مسافر۔ باغیچہ۔ مرد دراز قد۔ اور پھر سانپ کا۔ قاصد کے طور پر ہونا اور حاتم کا اس کے منہ میں بیٹھ جانا۔ یہ سب ہی بڑی علامتوں کا درجہ رکھتے ہیں اور اس کی طرف اشارہ سیج ہیں کہ اُردو قصّوں اور داستانوں نے اساطیری روایات کا کتنا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اور اسی طرح ہند ایرانی روایت کی یہاں یک جائی اور توسیع ہوتی ہے۔

اس کے بعد کا حصّہ اسی سلسلۂ فکر و خیال کا ایک اہم حصّہ ہے۔ جہاں پہنچ کر یہ کہانی ایک طلسمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حاتم سانپ کے پیٹ میں گھس گیا۔ دیکھا اندھیرا گھر ہے۔ ادھر ادھر حیوان پھر رہا تھا کہ آواز کان میں آئی۔ "اے حاتم اس اندھیرے گھر میں چیز تیرے ہاتھ لگے تو اس کو بے کھٹکے منہ سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈال تو اس طلسمات سے نکلے نہیں تو تاقیامت یہیں تیرا گھر ہے۔"

حاتم نے ادھر ادھر ہاتھ پھینکا ایک چیز گائے کی دل کی صورت ہاتھ لگی۔ اس نے خنجر سے اس کو چیر پھاڑ ڈالا۔ اور اسی وقت ایک چشمہ دریا سے تیز لہریں لیتا ہوا پیدا ہوا اور حاتم غوطے کھانے لگا۔ دو تین غوطوں کے بعد اس کے پاؤں زمین سے لگے۔ اور اس نے دیکھا ایک وسیع صحرا ہے اس میں ہزاروں آدمی ہیں کچھ قریب مرگ کچھ سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں وہ مسافر بھی ان میں کھڑا ہے حاتم نے پاس جاکر پوچھا۔ "تجھے یہاں کون لایا ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے ایک سانپ لاکر یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اور لوگوں سے بھی یہی کہا لیکن انھوں نے پوچھا۔" آپ کیونکر تشریف لائے۔"

حاتم عدل آباد سے ہوتا ہوا یوسف سوداگر کے پاس پہنچا اور وہاں سے چلا تو ایک جنگل میں ایک پیر سال عورت کو بھیک مانگتے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ حاتم نے اپنے ہاتھ سے الماس کی انگوٹھی اتار کر دے دی۔ اور منزل کی راہ لی۔ بڑھیا نے پکار کر کہا۔" اے دو کے پنچھی پردیس کی راہ باٹ مین خدا حافظ ہے۔ سات مسلح جوان ڈھال تلوار لیے دائیں بائیں سے نکل آئے حاتم کے ساتھ ہو لیے۔ وہ چور تھے اور اس بڑھیا کے بیٹے تھے جڑاؤ انگوٹھی دیکھ کر اس نے انہیں خبر دی کہ سونے کی چڑیا جاتی ہے۔

انہوں نے حاتم کو بتایا کہ اس کے طفیل کسی شہر کے بادشاہ کی نوکری چاہتے ہیں حاتم نے ان کے ساتھ چلنے میں کوئی اندیشہ نہ کیا۔

اس زمانے میں اس طرح کی کہانیاں اور بھی سننے کو ملتی تھیں اس میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ دور معاشرت ٹھگی ڈکیتی اور فریب کاری کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کرتا تھا بڑھیا۔ بہت سی کہانیوں میں ایک بہت ہی پُر فریب کردار ادا کرتی نظر آتی ہے اس کو صرف روایت نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس طرح کی عورتیں کٹنیوں کا ہی ایک روپ ہیں کھانے پینے سے بھی بے فکر رہنے کو کہا۔ لیکن انھوں نے پیچھے سے حاتم کے گلے میں کمند ڈال دی اور ہاتھ باندھ کر خنجر کے دو تین زخم دیئے اور کنویں میں لٹکا دیا اور جو کچھ اس کے پاس تھا لے لیا۔ پگڑی جس میں مہرہ بندھا ہوا تھا اس کے پاس رہی۔ کئی روز تک بے ہوش پڑا رہا۔ ہوش آنے پر پگڑی سے مہرہ نکالا اور خشکی پر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

ان لوگوں نے حاتم کو لوٹ لیا اور اسے ایک اندھے کنویں میں پھینک دیا۔ یہ واقعہ حضرت یوسفؑ کے واقعہ کی یاد دلاتا ہے آگے چل کر اس کی شکل کچھ بدل گئی ہے۔

اس شخص نے خواب ہی میں کہا کل دو شخص یہاں آئیں گے اور تجھے اندھے کنویں سے نکالیں گے تو انہیں اپنا یقین کر کے اس مال کو نکال لے۔" حاتم نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

صبح ہوتے ہی دو شخص وہاں آئے اور پکار کر کہا:" اے حاتم اگر جینا ہے تو جواب دے۔ جواب ملنے پر انہوں نے کہا۔" ہمارے ہاتھ پکڑ کر چڑھ آؤ۔" باہر آنے پر

حاتم نے انھیں گنج عظیم کی خبر دی۔ حاتم کو وہیں ٹھہرایا اور ایک کنویں کے اندر اترا اور دوسرا وہیں اوپر کھڑا رہا۔ اور نیچے سے دیئے جانے والے مال کا ڈھیر لگاتا رہا۔ جب سارا مال نکل آیا وہ حاتم کے حوالے کیا۔

بڑھیا تھوڑی دور چلنے پر ہی سر راہ بیٹھی مل گئی حاتم نے مٹھی بھر روپے اور اشرفیاں جیب سے نکال کر اس کو دیں اور آگے قدم بڑھایا۔ بڑھیا نے اسی طرح آواز لگائی اور وہ ساتوں لیٹرے ادھر اُدھر سے نکلے اور حاتم سے ملے اور حاتم نے انھیں پہچان کر ایک عرض قبول کرنے کو کہا۔ اگر تم مردم آزاری سے توبہ کرو تو اس قدر زر و جواہر دوں کہ تمہاری سات پیڑھی تک کام آئے۔"

اس کے بعد جنگل کا راستہ لیا ایک کتا زبان نکالے دکھائی دیا۔ حاتم نے جان لیا کہ یہ کوئی کارواں اترا ہوا ہے۔ اور کتا اس کارواں کا ہے۔ حاتم نے اس کو گود میں اٹھا لیا اس کے لیے ادھر اُدھر پانی ڈھونڈھا ایک گاؤں دکھائی دیا۔ حاتم نے دیکھا اس گاؤں کے لوگ گیہوں کی روٹیاں اور مٹھا مسافروں کو دیتے تھے۔ حاتم کو بھی دیا۔ اس نے وہ روٹیاں اور چھاچھ کتے کے سامنے رکھ دیا کتا کھانے لگا حاتم اسے دیکھتا تھا اور کہتا تھا خوب خوش ترکیب اور خوبصورت کتا ہے اور شکر خدا کرتا تھا۔ [illegible] نے شفقت سے کتے کے سر پہ ہاتھ پھیرا اس کے ہاتھ میں ایک سخت چیز لگی غور سے دیکھا تو لوہے کی کیل تھی وہ اس کے سر سے نکال لی اور وہ کتا ایک حسین جوان کی صورت میں موجود ہو گیا۔

قدیم قصّوں اور ان کی روایتوں کی طرف یہاں۔ خواب دیکھنے کا عمل بھی اشارہ کرتا ہے۔ حضرت یوسف نے بھی خواب دیکھا تھا اور وہ تعبیر خواب بتلانے میں پیغمبرانہ درک رکھتے تھے۔ ویرانوں میں خزانوں کا ملنا اور سات پشتوں اس کا کام آنا قدیم سے چلی آتی ہوئی روایتوں کا پرتو ہے۔

کتے کو کارواں کی علامت سمجھا جاتا ہوگا اس لیے تو حاتم یہ سمجھتا ہے کہ کوئی کارواں یہاں آیا ہے جو کتا دکھلائی دیتا ہے۔ کتا کیونکہ وفاداری کی نشاندھی کرتا ہے اور اپنے مالک پر کبھی آنچ نہیں آنے دیتا۔

کتا نجس العین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ گلہ بانوں اور خانہ بدوشوں کی زندگی میں کتا حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ اصحاب کہف کے کتے کی روایت تو اس کے گرد ایک پراسرار ہالہ بنا دیتی ہے۔ علاوہ بریں سر میں کیل کا ٹھونکا جانا اور اس کے وسیلے سے جنوں کو تبدیل کرا دینا قدیم قصوں داستانوں اور دیومالائی روایتوں میں خاصا عام رہا ہے۔ تحوّل صورت کی مثالیں ہمارے ادب میں یوں بھی جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ لوگ اس کا یقین رکھتے تھے۔ اور شاید آواگون کی وجہ سے کہ روح قالب تبدیل کرتی رہتی ہے اور بزور سحر روح ایک قالب سے دوسرے قالب میں پہنچائی جا سکتی ہے۔

حارس کی بیٹی کو سب کیفیت بتائی جاکر اور تیسرا سوال معلوم کیا۔ اس نے کہا "ماہرو پری شاہ کا مہرہ لا"۔ تیسری مہم پر روانہ ہوا۔ چند روز سفر کرنے کے بعد ایک درخت کے نیچے بیٹھا سوچنے لگا کہ دیوؤں کے بادشاہ سے ملنا چاہیئے۔

آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ یہی عمل اس بیوی کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جو حبشی غلام سے عشق کرتی ہے اور اپنے شوہر کے سر میں کیل ٹھونک کر کتا بنا کر گھر سے نکال دیتی ہے الف لیلہ میں حبشی غلام سے عشق کرنے کی روایت موجود ہے۔ اس زمانے میں حبشی غلاموں کو عام طور پر گھر کی حفاظت اور کاموں کی انجام دہی کے لیے رکھا جاتا تھا اور یہ ایک عجب بات ہے کہ بیگمات اور خواتین خانہ ان کے عشق میں مبتلا ہو جاتی تھیں۔ اس میں اس دور معاشرت کی جذباتی اور جنسی الجھنوں کا اور طبقاتی رویوں کا عکس ملتا ہے۔

بادشاہ نے کئی دیو ہمراہ گئے بادشاہ کی سرحد میں پہنچا دو۔ اور اس کے آنے تک وہیں رہو۔ ایک مہینے کی مدت میں اس ملک کی سرحد میں پہنچے اور حاتم ان سے رخصت ہوا۔ چند روز بعد بہت ہی اونچا ایک پہاڑ دکھائی دیا۔ اس پر بے شمار میوہ دار درخت پھلے پھولے تھے قریب پہنچا تو پریزادوں نے ہر طرف سے گھیر لیا۔ اور کہا اس آدمی کو چھوڑنا نہ چاہیئے۔ یہ پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہے اور پری زاد پہاڑ سے اترے اور طوق اور زنجیر پہنا کر پوچھا تو کون ہے کس لیے آیا ہے اور کون تجھے یہاں لایا ہے۔ حاتم کا جواب تھا یہاں خدا لایا ہے اور شہر سورت سے آیا ہوں۔" انہوں نے کہا

تو ماہرو پری شاہ کا مہرہ لینے آیا ہے۔ کیوں سچ ہے یا نہیں۔ حاتم مصلحت سے چپ رہا۔ انہوں نے باہمی مشورہ کیا کہ اسے آگ میں ڈالنا چاہیئے۔ اس لیے ہزاروں من لکڑی جمع کرکے آگ جلائی اور حاتم کو اٹھا کر آگ میں ڈال دیا۔ تین روز تک اس آگ میں رہا۔ ایک تار بھی اس کے جامہ کا نہ جلا تھا۔ سب پریزاد حیرت میں تھے۔ وہ ایک طرف چلا تھوڑی دور جانے پر پریزادوں نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا تو وہی ہے یا دوسرا ہے۔ ہم تو ایک شخص کو چار روز پہلے آگ میں ڈال کر خاک اور سیاہ کر دیا تھا۔ حاتم کے یہ کہنے پر۔ "جو آگ میں پڑے وہ کیوں کر جیتا بچے۔"

آگ میں ڈالنا ایک امتحان ہے جو نیک لوگ ہوتے ہیں وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آگ میں ڈالنا ایک قدیم روایت ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تھا اور وہ جلنے سے بچ گئے تھے۔ بالکل اسی طرح ہندوستان کی ایک روایت کے مطابق پرہلاد بھی جلنے سے محفوظ رہا تھا حاتم کوئی پیغمبر تو نہیں تھا لیکن وہ نیک آدمی ضرور تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ احسان کرنے آیا تھا اور قرآن میں یہ صاف صاف لکھا ہے کہ ہم احسان کرنے والوں کو اس طرح بدلہ دیتے ہیں۔ شاید یہ قصہ نگار کے سامنے یہ بات ہو اور اس کو ذہن میں رکھ کر وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ حاتم بھی آگ سے اس لیے محفوظ رہا۔

یہاں ایک اور بات اہم اور خاص ہے اس لیے کہ تین کا عدد تثلیث کو ظاہر کرتا ہے جو تہذیبی اور مذہبی روایات میں تقدیس کا حامل ہے مسلمانوں میں ہاتھ تین مرتبہ پاک کیے جاتے ہیں اور کئی باتیں ایسی ہیں جو تین کی تہذیبی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہاں تک یہ کہا جاتا ہے کہ مردے پر قبر میں تین دن بڑے بھاری ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان میں تو تین کا عدد کئی اعتبار سے مذہب اور تہذیب میں داخل ہے۔ تربھون۔ تیری لوچن تیروینی یہاں تک کہ تیری دندرم۔ ترشول۔ ان سب میں تین کا عدد شریک ہے۔ کہانی میں آگے چل کر بھی تین شرطوں کا ذکر آیا ہے۔

انھوں نے حاتم کو بھاری پتھر سے تین روز دبا کر رکھا چوتھے روز نکل کر اس زور سے

ٹانگ سے گھما کر پھینکا کہ اٹھارہ کوس پر دریائے شور میں جا گرا اور گھڑیال اس کو نگل گیا جب ہوش آیا تو گھڑیال کے پیٹ میں دیکھ کر گھبرایا اور اس کے دل و جگر کو دوڑ دوڑ کر روندنے لگا۔ گھڑیال ہضم نہ کر سکنے پر خشکی میں گیا اور قے کر کے اسے باہر نکال دیا۔ پھر حاتم بھوکا پیاسا ایک طرف کو چلا طاقت نے جواب دے دیا۔ ریت پر گر پڑا۔ اور ہر طرف کو دیکھنے لگا۔ ایک غول پریزادوں کا اٹھکیلیاں کرتا ہوا آنکلا دیکھ کر کہنے لگا اس کی تحقیقات کیا چاہیئے۔ حاتم کے پوچھنے پر بتایا کہ دوسرا دن ہے گھڑیال کے پیٹ سے جیتا نکلا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی ہے تو کچھ کھانے پینے کی خبر لو انہوں نے کہا ہمارے بادشاہ کا حکم ہے آدم زاد کو جہاں پاؤ وہیں ٹھکانے لگاؤ۔

گھڑیال کے نگل جانے میں اگرچہ خطرات کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس کے لیے غالب نے کہا

(ع) دام ہر موج میں حلقۂ صد کام نہنگ

علاوہ بریں اس میں حضرت یونس کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جن کو مچھلی نگل گئی تھی اور وہ معجزے کے ذریعہ اس کے شکم سے زندہ نکل آئے تھے۔ اس طرح کے واقعات بھی اس عہد تہذیب میں نہ صرف دیومالائیت میں ملتے ہیں بلکہ ان سے متاثر ایسے واقعات میں بھی نظر آتے ہیں جن کو بزرگان دین کے کرشمہ و کرامات سے وابستہ کیا گیا۔

اس طرح کے حکم اس زمانے کے تاریخی واقعات میں بہت ملتے ہیں۔ نادر شاہ درانی کا قتل عام تو سبھی کو یاد ہے۔ اور ان داستان نگاروں نے تو اس کے قصے سنے ہوں گے۔ حضرت موسیٰ کے قصے میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے۔

انھوں نے بادشاہ کو خبر ہونے پر مارے جانے کا خوف ظاہر کیا تو حاتم نے کہا اگر میرے مارے جانے سے تمہارا بھلا ہو تو نہ چوکو۔ قتل بھی کرو۔ ان میں مشورہ ہوا کہ سات روز کی مسافت پر بادشاہ ہے ایسا کون ہے جو جائیگا۔ اور اس پر سب متفق ہوئے۔ اور اپنے گھر سے گئے میوے اور کھانے کھلا کر حاتم سیر ہوا اور پریزاد اس کے

گرد بیٹھ کر قیل و قال کرنے لگے۔

ثرافت اور ظاہری خد و خال جو نجابت کا پتہ دیتے ہیں ان سے اس زمانہ زندگی میں آج بھی بہت لوگ متاثر ہو جاتے ہیں اور ایسے واقعات بھی تاریخی اور نیم تاریخی قصوں میں موجود ہیں جب شاہی حکم کے باوجود بادشاہی حکام یا گماشتوں نے کسی شخص کی جان بچا دی۔ یہاں یہ ذکر بھی آیا کہ بادشاہ سات دن کے فاصلے پر ہے اس زمانے میں فاصلوں کو دنوں کے پیمانے میں بھی ناپا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سو برس کی اور ہزاروں برس کی راہ کہا جاتا تھا۔ قصص الانبیاء میں بہت سے ایسے اشارے ملتے ہیں۔

کئی دنوں بعد حاتم نے کہا۔ اب مجھ کو رخصت دو کہ جس کام کے واسطے آیا ہوں۔ اس کی سعی کروں۔" ان کے پوچھنے پر حاتم نے کل کیفیت کہہ سنائی۔ انہوں نے کہا۔ "ماہ رو پری شاہ کا فرمان ہے کوئی آدم زاد اور دیوزاد آنے نہ پائے اگر وہ سنے گا کہ آدم زاد یہاں آیا ہے تو ہم کو جیتا نہ چھوڑے گا۔ اور تجھ کو بھی۔ حاتم نے کہا میری حیات ہے تو کون مجھ کو مار سکتا ہے تم اپنے واسطے ڈرتے ہو تو مجھے بات کرنے کو اس کے پاس لے چلو خدا جو چاہے گا سو کرے گا۔" آخر انہوں نے مشورہ کیا کہ حاتم کو قید کر کے بادشاہ کو خبر پہنچائی جائے تو جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔

اس پیراگراف میں سب سے اہم بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا جو کچھ ہوتا ہے اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ موت سے پہلے کوئی کسی کو مار نہیں سکتا۔ ہر معاشرہ ان اصولوں کا پابند نظر آتا ہے۔ اور مذہب اسلام کی بنیاد بھی کافی حد تک انہیں پر منحصر ہے۔

چالیس کا عدد بہت اہم ہے۔ حضرت نوحؑ کے طوفان سے لیکر اور حضرت موسیٰؑ کے طور پر جانے اور احکام عشرہ لے کر واپس آنے کی مدت تک چالیس دن ہوتے ہیں آنحضرتؐ کو نبوت بھی چالیس برس کی عمر میں ملی تھی۔ چلہ کشی اور چلہ نشی اور چالیس قدم چلنا بھی اس میں شامل ہے یہاں بھی چالیس کے عدد پر زور دیا گیا ہے۔

تھوڑی دور جا کر مجوسیوں سے معلوم کیا " اس کو کیونکر دیکھیں" ایک ہم جولی۔

" دریائے قلزم کے چوکیدار فلانے راستے سے آتے ہوں اگر وہیں چل کر دیکھو تو بہت بہتر ہے۔ اس سمت میں گئیں تو دیکھا عالی شان لشکر پڑا ہے۔ حُسنا پری نے ایک پری سے کہا: جاکر ان سے تحقیق کرکے جلد پھر آ۔ وہ گئی اور حقیقت معلوم ہونے پر کہا ہم بھی دیکھیں۔ وہ کون سا آدمی ہے انہوں نے اسے حاتم کو دکھا دیا۔ اس نے واپس جاکر حسنا پری سے اس کے حسن جوانی کی تعریف کی۔ اس کا حاتم کو دیکھنے کا اشتیاق اور زیادہ بڑھ گیا۔ صلاح ٹھہری رات ہو جائے سپاہی سو جائیں اس وقت چوری سے اس کو اڑا لائیں گے۔ تمہیں دکھا دیں گے۔

پری کے پوچھنے پر حاتم نے بتایا۔" ماہ رو پری شاہ کا مہرہ لینے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔" تیری قسمت سے وہ ہاتھ لگے تو لگے۔ بلکہ میں بھی نا مقدر سعی کروں گی۔"

وہ لشکر جب خواب غفلت سے بیدار ہوا اور حاتم کو نہ پایا معلوم کیا کہ پریاں عاشق ہوکر اس کو چرالے گئی ہیں اگر بادشاہ سنے تو ہماری کھال کھینچے۔"

اقتباس کے لیے شروع کے حصے میں کنیزیں جاکر حاتم کے حسن اور خوب روئی کا ذکر کرتی ہیں۔ اس میں مہاکوی تلسی داس کے بیان کا عکس چھلکتا ہے جہاں ایک باندی نے جاکر رام چندر جی کے حسن کی سیتا سے تعریف کی تھی۔ اس کے ماسوا جہاں تک عشق کا سوال ہے۔ اس کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ کہ چھپ چھپاتے عشق کرنے کی روایت ہمارے معاشرے کے عام رویّے کا عکس ہے اس لیے کہ افشائے راز کی صورت میں سزائے سخت کا خیال ذہن کو بری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کو پتہ چل گیا تو ہماری کھال کھنچوا دے گا۔

وہ گوشے سے نکلا اور بولا۔" اے نمک حراموں۔ اس آدمی کو بادشاہ نے طلب کیا تھا ہم بہ حفاظت لیے جاتے تھے۔ ہم کو غافل پاکر تم اسے اڑا لائی ہو۔ .... زندگی چاہتی ہو تو ہمارے حوالے کرو۔" حسنے یہ بات سن کر غضبناک ہوئی اور بولی۔" اے نامحرم جوان مرد۔ تو میرے باغ میں کیوں آیا اور کس واسطے زبان درازی کرتا ہے۔ نامحرم کے سامنے بہت ہی برا خیال کیا جاتا تھا۔ کسی نامحرم کو اجازت نہیں

تھی وہ کسی ایسی عورت کے سامنے آئے جو اس کی بیوی نہ ہو۔

بادشاہ نے قبول کیا لیکن حاتم نے کہا اگر تو چاہے تمام عمر مجھے اپنے پاس رکھے مگر اس بات کا اقرار کرے کہ جب تک میرا جی چاہے گا رہوں جی چاہے چلا جاؤں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حاتم اپنی زندگی کے نصب العین میں کسی کو حائل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اسے خدا کی راہ میں کام اور خدا کے بندوں کی خدمت عزیز تھی۔ معاشرے کی صالح مقدار ایسے ہی لوگوں کے برقرار رکھنے سے قائم و دائم رہتی ہیں۔

حُسنی پری نے بھی اس شرط کو مان لیا اور حاتم نے رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا اب چلا جا۔

کئی پریوں کے ساتھ چالیس دن کے بعد طلسمات میں جا پہنچی ایک درخت نہایت عظیم الشان دکھائی دیا جس کی پھننگ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور اس سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ ایک مشکیزہ اس کے نیچے رکھ دیا پانی سے بھر جانے پر منہ باندھ کر وہاں سے اُڑی کہ خلقاش دیو کا چوکیدار جو ہزار دیو سے اس درخت کا نگہبان تھا آ پہنچا۔ حُسنی پری بہت چست و چالاک تھی اس کے ہاتھ نہ لگی۔ چالیس دن میں بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ حاتم نے اس پانی میں مہرے کو رگڑا اور بادشاہزادے کی آنکھوں سے لگایا۔ اور سات روز کے لیے پٹی سے باندھ دیا۔ آٹھویں دن پٹی کھولی تو آنکھیں ایسی تھیں جیسے ماں کے پیٹ سے لے کر نکلا۔ ماہرو پری بادشاہ نے بہت سا زر و جواہر حاتم کے آگے رکھا حاتم نے اسے تو قبول کیا اور کہا۔" یہ جو کچھ عنایت ہوا ہے سو آپ کا فضل ہے لیکن امیدوار اس بات کا ہوں کہ جو دینے کو کہا تھا سو عنایت ہو۔" بادشاہ نے کہا۔" کیا مانگتا ہے مانگ۔" کہنے پر حاتم نے کہا۔" یہ مہرہ آپ کے ہاتھ میں ہے اگر میری آرزو پوری کرنی منظور ہے تو بخشو۔"

بادشاہ نے یہ سنتے ہی سر نیچا کر لیا۔ اور کہا۔ معلوم ہوا کہ شاید یہ مہرہ حارث سوداگر کی بیٹی نے تجھ سے مانگا ہے اور میں نے بھی تجھ سے اقرار کیا ہے۔ ناچار ہوکر بادشاہ نے

شاہ مہرہ حاتم کو دیا اور کہا۔ "میں اس مہرے کو اس کے پاس رہنے نہ دوں گا۔ کسی نہ کسی ڈھب سے منگوا لوں گا۔

قول کا پاس اور وعدہ پورا کرنا اس پر مزید گفتگو ہو چکی ہے اس لیے یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (آئندہ بھی آئے گی)

حاتم نے مہرے کو اپنے بازو پر خوب مضبوط کر کے باندھا تو جتنے گنج اور دفینے زمین میں گڑے ہوئے تھے نظر آنے لگے۔ اس نے جان لیا کہ حارس سوداگر کی بیٹی نے اس واسطے یہ مہرہ منگوایا ہے۔

وہاں سے رخصت ہو کر حسنی پری کے گھر تھوڑے دن عشرت میں گزارے۔

شاہ مہرہ حارس کی بیٹی کے گھر جا کر اس کے حوالہ کیا اور اس کے باپ کو بلوا کر اس سوداگر بچہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور کہا اسے اپنا فرزند سمجھ۔

دس دن کے بعد وہ مہرہ حارس کی بیٹی کے ہاتھ سے جاتا رہا حاتم اسے بہت کچھ دلاسہ دے کر حسن بانو کے سوال کا جواب ڈھونڈنے چلا کئی دن بعد کسی دریا کے کنارے پہنچا۔ ایک عالیشان محل دکھائی دیا۔ اس کے دروازے پر بڑے بڑے خط سے لکھا دیکھا "نیکی کر اور دریا میں ڈال"۔ سجدۂ شکر کے بعد آگے بڑھا۔ بہت سے شخص اس محل سے نکلے۔ اور اسے اندر لے گئے۔ ایک سو برس کا بوڑھا مرد تخت پاکیزہ پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کر حاتم کو گلے لگایا۔ اور تخت پر پاس بٹھا لیا۔ طرح طرح کے کھانے کھلوائے۔ پھر حاتم کے پوچھنے پر کہ "دروازے پر یہ کیوں لکھا؟" اس نے کہا۔ "میں راہزن تھا۔ دن کو مزدوری کرتا تھا اور راتوں کو مسافروں کو لوٹتا تھا۔ آخر روز دو روٹیاں گھی سے چپڑ کر ان پر شکر ڈال کر دریا میں پھینک دیتا اور کہتا تھا۔ "یہ کام خدا کے واسطے کرتا ہوں"۔ مدت کے بعد بیمار ہوا مرنے کو ہو گیا ایک دن ایسا بے ہوش ہوا کہ جیسے بدن سے جان نکل گئی۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میرا ہاتھ پکڑ کر دوزخ دکھلاتا ہے قریب تھا کہ مجھ کو دوزخ میں ڈال دے۔ دو شخص خوبصورت آگے آئے اور میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگے "اس کو ہم دوزخ میں نہ جانے دیں گے۔ اور اس کی جگہ دوزخ نہیں بلکہ یہ بہشت میں جائے گا۔"

وہ مجھے بہشت کی طرف لے گئے۔ ایک بزرگ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا اس کو کیوں لائے ہو۔ ہنوز اس کی عمر میں دو سو برس باقی ہیں۔ اس کا ہم نام ایک اور شخص ہے اس کو لے آؤ۔"

دریا کا کنارے پانی میں محل کی موجودگی تخت پر کسی بزرگ آدمی کا رونق افروز ہونا اس کہانی میں بھی ایک سے زیادہ مواقع پر موجود ہے۔ بعض دوسرے قصوں میں بھی اسی طرف اشارہ ہے جس سے ایسے آب دوز محلات کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ جو بہت عام نہ سہی لیکن ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ راہزنی کرنا لیکن لوٹی ہوئی دولت سے کوئی نہ کوئی نیکی کر جانا بھی اس وقت کے اخلاقی اور ذہنی رویوں کی عکاسی کرنے والی بات ہے۔ دو روٹیاں اور دریا کے سپرد کرنا نیکی کا ایک ایسا معیار ہے جو تہذیبی اور ادبی اخلاقی قدروں کی کسی معاشرے میں نشاندہی کرتا ہے۔ عرب بھی جوئے میں جو اونٹ جیتتے تھے اسے نحر کر کے مفت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس کی عمر دو برس باقی ہے یا پھر دو سو برس اہمیت اس کی نہیں اس کی ہے کہ وقت سے پہلے موت نہیں آتی۔ قرآن کی آیت ہے۔ (ترجمہ):۔ جب ان کا وقت آ جائے گا تو ایک لمحہ کی تقدیم ہو گی نہ تاخیر۔

عافیت کا خیال بھی اس معاشرے میں عام تھا اور آج بھی ہے۔

کہنے لگے۔ "کہ ہم دونوں وہی روٹیاں ہیں جو خدا کے واسطے تو دریا میں ڈالتا تھا۔" میں تھوڑی دیر میں ہوش میں آ گیا اور خدا کی درگاہ میں مناجات کرنے لگا۔ جب صبح ہوئی تو معمول کے موافق دو روٹیاں ڈالنے لگا کہ ایک سو دینار پانی سے نکل آئے میں نے ان کو اٹھا لیا اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ اگر کسی کا مال دریا میں گر پڑا ہو تو مجھ سے لے لے۔ کسی نے اس بات کا جواب نہ دیا۔ پھر پہلے کی طرح دریا پر گیا اس طرح دینار نکل آئے۔ ان کو بھی لا کر چھوڑا۔ دن گزارا رات خواب میں ایک شخص کہتا تھا کہ اے بندۂ خدا دو روٹیاں تیری شفیع ہوئیں۔ اور خدائے کریم نے حکم کیا ہے کہ تجھ کو سو دینار روز کے ملا کریں۔ تو اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر اور باقی سے اپنی اوقات کاٹ۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ سجدۂ شکر بجا لایا میں نے یہ عمارت بنائی اور اس کے

دروازے پر یہ حکم لکھ دیا۔ اب بھی اسی طرح سے مجھے سو دینار پہنچتے ہیں۔ اور اب میری عمر کے سو برس باقی ہیں۔

حاتم نے رخصت چاہی تو اس کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دی حاتم اس کے ساتھ ہو چلا۔ ایک لشکر عالی شان سامنے دکھائی دیا حاتم کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا ہے وہ حاتم کو لے کر اپنے گھر پہنچا اور اسے تخت مرصع پر بٹھایا ضیافت کی رات راگ رنگ میں گزاری۔ صبح کو شہزادے نے اس غلام کی گردن ماری اور حاتم رخصت ہو کر شاہ آباد پہنچا۔ حاتم نے سب ماجرا حسن بانو کو کہہ سنایا اور تیسرے سوال کی جستجو میں جانے کا ارادہ کیا۔ منیر شامی کو دلاسا دیا کہ اب کچھ ہی دنوں میں خدا کے فضل سے تیری معشوقہ کو تجھ سے ملائے دیتا ہوں۔

اس پورے اقتباس میں جو بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے وہ غلام کی گردن مارنا ہے جو قدیم تہذیبوں میں عام تھا مہمانوں کی آمد اور کسی کے لیے صدقہ دینے کے موقع پر غلاموں کی گردن کاٹ دی جاتی تھی۔ اور جب مندر میں پوجا کا موقع آتا تھا تو جانوروں کی طرح غلاموں کو بھی دیوی دیوتاؤں کے قدموں پر لے جا کر ذبح کیا جاتا تھا۔

تیسرا سوال

"کسی سے بدی نہ کر اگر کرے گا تو وہی پاوے گا۔"

ایک مہینے کے بعد ایک پہاڑ آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دیا۔ اس کے قریب پہنچا تو آہ و زاری کی آواز سنائی دی مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اور نزدیک گیا تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے سنگ مرمر کی ایک سل پر ایک جوان کو درخت کی ڈالی کو پکڑے ہوئے اور آنکھیں بند کئے ہوئے کھڑا دیکھا۔ جدائی کے درد سے بے تاب تھا۔ اور نعرے مارتا تھا۔ حاتم نے اس سے اس کا ماجرا پوچھا۔ کچھ نہ بولا دوسری بار بھی چپ رہا۔ تیسری بار کہا "اے شخص! تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے اور مجھ سے کیا کام رکھتا ہے۔" حاتم نے جواب دیا۔ "میں بندہ خدا ہوں گھومتا پھرتا ادھر آنکلا ہوں تو اپنا حال کہہ یہ حال کیوں بنا رکھا ہے۔"

اس نے کہا میں ایک سوداگر ہوں ایک پری کے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ وہ سات دن کا کہہ کر گئی تھی۔ کہ لوٹ آئے گی مگر آج تک واپس نہیں آئی۔ میں نے اسی کے انتظار میں اپنا یہ حال کیا ہے۔

حاتم یہ حال سن کر بہت کڑھا اور پوچھا: "اگر اس نے تجھے اپنے مکان کا نشان دیا ہے اور نام تبلایا ہے تو مجھ سے کہہ۔" اس نے بتایا کہ بس یہی جانتا ہوں کہ اس کے قبائل کوہ القابر رہتے ہیں اور یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی اور کہاں ہے۔ حاتم نے

پوچھا۔ تجھ سے رخصت ہو کر کس طرف گئی۔ اس نے کہا" میرے سامنے دس بیس قدم داہنی طرف چلی تھی۔ پھر نہیں معلوم کس طرف غائب ہو گئی۔"

حاتم نے ساتھ چلنے کو کہا اس نے جواب دیا" اگر وہ یہاں آئے اور نہ پائے تو پھر یہ بگ ہی نہ پاؤں گا۔ اور نہ وہ ہی ہاتھ آئے گی۔" اور حاتم کے پوچھنے پر اس کا نام الگن پری بتایا۔

تھوڑے دنوں بعد اس پہاڑ سے آگے ایک اور پہاڑ آیا اس پر چڑھ گیا تو میوہ دار درخت لہلہاتے اور پھولوں سے لدے پودے نظر آئے دیکھے ایک صاف ستھری جگہ پر چار بڑے درخت تھے۔ حاتم وہاں گیا اور اس کی آنکھیں بے اختیار لگ گئیں۔ چار پریاں شام کے وقت آئیں مسند بچھا کر بیٹھیں اور آپس میں حاتم کو دیکھ کر کہنے لگیں یہ کون ہے اور کیوں کر آیا ہے۔" آپس میں مشورے کے بعد حاتم کو جگا کر پوچھا" تو یہاں کس ڈھب سے آیا ہے۔ اور کس واسطے یہ ارادہ کیا۔ حاتم بولا۔ یہاں مجھے میرا خدا لایا ہے۔ میں کوہ الفا کی سیر کرنے اور الگن پری کے دیکھنے کو جاتا ہوں کیونکہ وہ ایک آدمی سے سات روز کا وعدہ کر کے گئی اور سات برس گزر گئے وہ بیچارہ ایک درخت کے نیچے اس کی یاد میں تڑپ رہا ہے۔" وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں" الگن پری الفا پہاڑ کے شہزادی ہے اس کو ایسی کیا غرض تھی کہ وہ کسی آدمی سے ملنے کا اقرار کرتی اور پھر تو اگر جائے گا تو کب جیتا بچے گا۔"

اس خیال سے باقی رات ڈھونڈھتا پھرا صبح ہوتے ہی جس طرف سے آواز آئی تھی۔ ادھر جا پہنچا۔ دیکھا کہ جوان بے اختیار رو رہا ہے۔ حاتم نے پوچھا" اے بندۂ خدا تو ایسا پھوٹ پھوٹ کر کیوں روتا ہے۔۔۔ لازم ہے کہ تو مجھے اپنے حال سے آگاہ کر" وہ اور زیادہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اور کہا" میں سپاہی ہوں روزگار کے واسطے اپنے شہر سے نکلا تھا۔ راہ بھول کر اس ملک میں آ پہنچا اور اس بستی کے حاکم کا نام لوگوں سے پوچھا ایک نے بتایا اس شہر کا والی مسخر جادوگر کہا جاتا ہے۔ ڈر کر ایک جنگل کی طرف راہی ہوا۔ راہ میں ایک باغ نہایت دلچسپ دکھائی دیا۔ سیر کو دل چاہا گھوڑے

سے اتر اندر آ گیا۔ دو چار قدم ہی گیا تھا کہ پریوں کا ایک غول نظر آیا میں نے خیال کیا کہ شاید کسی امیر کا زنان خانہ سونے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے کسی کے ناموس کو بد نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے وہاں سے لوٹا کہ ان عورتوں نے اپنی بی بی کو خبر دی وہ مسخر جادوگر کی بیٹی تھی۔ وہ مسند سے اٹھی اور مجھکو بلوا کر ایک آراستہ مکان میں لے گئی پاس بٹھا کر گرم جوشی کرنے لگی۔

اس سے پہلے سوداگر بچے تھے یا خود حاتم کہ ان پریوں کے منظور نظر ٹھہرے اب یہ سپاہی بھی۔۔۔۔ وہ کتنا خوش رو ہوگا۔ شہزادوں اور سوداگر بچوں کا نہایت حسین جمیل ہونا تو قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ آدم زاد ہی ان کی نظر میں انھیں مبتلا عشق کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے یہ کہا جائے گا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن یہ آدم ان پریوں کے لیے بھی دیوانے ہوتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی شاید اس معاشرے کو عظمت آدم کا احساس رکھنے والا معاشرہ کہا جائے گا۔ اس سے یہی کچھ پتہ چلتا ہے لیکن اس معاشرے میں یہ بھی ایک پہلو ہے کہ یہ عشق کے ماروں کو اکثر و بیشتر ساکت اور غیر متحرک بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اور ان کی نجات کے لیے کسی حاتم کی آمد ضروری قرار دی جاتی ہے۔ یہ بے سوز عشق اس معاشرے کے لیے کٹھن ثابت ہوتا ہے۔

مسخر جادوگر نے لڑکی سے پوچھا تیری کیا مرضی ہے۔ اس نے کہا کہ آج تک میں نے کسی نامحرم کو نہیں دیکھا اور پہلے پہل یہی نظر پڑا ہے۔ اس واسطے میں نے اسے قبول کیا۔ کیا نامحرم کو دیکھنے یا نامحرم کے ذریعے دیکھے جانے کی بڑی احتیاط اس معاشرے میں پائی جاتی تھی۔ اسے گناہ جانا جاتا تھا یا ایسا تصور جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ احتیاط آدمیوں تو آدمیوں میں بلکہ پریوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ بھی جسے نامحرم جانتی تھیں یا محرم نہیں بنانا چاہتی تھیں اس کے سامنے آ جانے پر برہم ہو جاتی تھیں۔

مسخر جادوگر نے لڑکی کی مرضی پا کر کہا۔ بہت بہتر تجھے مبارک ہو لیکن یہ میرے تین قول پورے کرے اس پر میں نے جواب دیا آپ فرمائیں میں بجا لاؤں گا۔

اس نے کہا پہلے تو ایک جوڑا پریدو جانور کا لا۔ دوسرے سُرخ سانپ کا مہرہ لادے۔ تیسرے آپ کو کھولتے گھی کے کڑھاؤ میں ڈال اور سلامت نکال۔ ان سوالوں سے گھبرا کر اس بیابان میں آپڑا اور بھوک پیاس سے یہ طاقت بھی نہیں کہ وطن واپس جاؤں دو برس سے بگولے کی طرح چاروں طرف خاک اڑاتا پھرتا ہوں۔"

حاتم نے کہا" یہ شرطیں پوری کر کے تیری معشوقہ کو تجھ سے ملاؤں گا۔

اس سے معلوم تھا کہ پریدو جانور دشت مازندران میں پایا جاتا ہے اس لیے حاتم نے اس سے رخصت ہو کر اس طرف کا رُخ کیا۔

بادشاہ نے کہا۔ تو میرا یہ عصا لے کہ اس میں کئی خواص ہیں سانپ بچھو کا اثر نہ ہو۔ اس کے نیچے ہو رہے تو آگ سے نہ جلے اگر کوئی جادو کرے تو یہ کچھ نہ ہونے دے۔ اگر دریا میں راہ حائل ہو تو یہ کشتی کا کام دے۔ اور ایک مہرہ دیتا ہے وہ بھی اپنے پاس رکھ کہ اگر سُرخ یا سفید یا سیاہ سانپ ملے تو اس وقت منہ میں رکھ لیجو اور ڈر نہ مانیو۔ حاتم نے دونوں چیزیں لے لیں اور رخصت ہوا۔

عصا کا تصور سامی تہذیب کی روایت میں بہت معمولی رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کے عصا سے جس معجزے کا ظہور ہوا ہے یہاں اس کے علاوہ بھی اس کے خواص بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ نیا مہرہ بھی طلسمی تاثر رکھتا ہے۔ یہ باتیں گھکے کے بارے میں بھی کہی جاتی رہی ہیں۔ اور اُردو شاعری کی روایت میں داخل ہیں۔

مث ؛ جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی گھٹکا لے کر

کئی منزلوں کے بعد ایک بہت بڑا دریا دکھائی دیا۔ فکرمند ہو کر ادھر ادھر دیکھا کوئی نہ دکھائی دیا۔ حیوز کا دیا ہوا عصا یاد آیا۔ اسے دریا میں ڈال دیا اور اس پر سوار ہو کر چلا بیچوں بیچ پہنچا تو ایک گھڑیال نکلا اور حاتم کو کھینچ کر سات کوس تک نیچے چلا گیا۔ جب اس کا پاؤں زمین سے لگا تو اس نے دیکھا کہ ایک گھڑیال پہاڑ کی مانند ہے۔ یہ گھبرایا اس نے فریادیوں کی مانند عرض کی۔" یہ میرا مکان ہے اور اس کو کیکڑے نے زبردستی چھین لیا ہے۔ امیدوار ہوں کہ تو دلادے۔

دراصل اس کہانی میں جگہ جگہ حاتم کو ان قصوں سے آراستہ کیا گیا ہے جو کہیں پیغمبروں سے متعلق رہے ہیں اور کہیں کچھ معجزنما کرداروں سے۔ یہاں گھڑیال حاتم کو دریا کی گہرائیوں میں کھینچ کر لے جاتا ہے لیکن اسے نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کا تابع فرمان بن کر سامنے آتا ہے اور ایک کیکڑے کے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے میرے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ بظاہر کیکڑا گھڑیال سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن یہاں اس سے سمندری بلا مراد ہے جس کے بہت سے پیر ہوتے ہیں۔ اور اس میں وہ اپنے قریب سے گزر جانے والے جانوروں کو آہنی حلقوں کی طرح قید کر لیتی ہے۔ داستان نگار دکھلانا یہ چاہتا ہے کہ ایسے بھی کچھ دیوتا صفت انسان ہوئے ہیں جن کو سمندر اور اس کی مخلوقات پر حاکمیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت الیاسؑ کے معجزنما انسانی کرداروں کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد جو عبارت آئی اس میں عصائے موسیٰ کی ضرب شدید عمل میں آئی ہے۔ اور کیکڑا جو انتہائی خوفناک اور خطرناک تھا گھڑیال کو اس کا مکان سپرد کر دیتا ہے یہاں گویا حضرت سلیمان کے انصاف کی طرف بھی اشارہ ہے۔

پھر حاتم اس عصا کے ذریعے بڑھے پر چڑھا اور دریا کے کنارے جا لگا اور مازندران کی طرف چل پڑا۔ قریب پہنچ کر ایک درخت سایہ دار کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگا۔" اس جانور کے جوڑے کو ڈھونڈیئے کہ کہاں ہے۔ رات ہونے پر وہ چرائی سے واپس آئے اور ایک درخت پر بیٹھ کر کہنے لگے۔" آج کی رات ایک آدمی خدارسیدہ اور غریب پرور غیر کے واسطے اپنے اوپر اذیتیں اٹھاتا اور دکھ سہتا یہاں تک آیا ہے۔ ہم نے بزرگوں سے اس کا نام حاتم بن طے سنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری ملاقات سے محروم رہ جائے۔

وہ سب آئے اور حاتم کے پاؤں پر گر پڑے وہ ہر ایک جانور کی صورت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کہنے لگے۔" آفریں ہے تیری ہمت اور جواں مردی پر جو تو نے غیر کے واسطے آپ کو اس مشقت میں ڈالا۔ شاید کوئی شخص مسخر جادوگر کی بیٹی پر عاشق ہوا۔

اور مسخر نے اس سے ہمارا ایک جوڑا طلب کیا ہے۔" حاتم نے کہا: "تم نے یہ سچ کہا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور ایک نے اپنے بچوں کا ایک جوڑا دے دیا۔

انسانوں کے علاوہ جنگل کے وحشی جانور اور آزاد پرندے بھی اچھے انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی طرف بھی اس واقعہ میں اشارہ ہے اور اس کی طرف بھی کہ دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانا پیغمبرانہ صفات کا حصہ ہے جس کی وجہ سے چرند و پرند انسان کے حلقۂ تسخیر میں آجاتے ہیں۔

اور حاتم دوسرے سوال کو حل کرنے کی سوچنے لگا۔

مسخر جادوگر نے کہا: "بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ کوہ قاف کے دشت میں ہے۔"

حاتم اس سے رخصت ہو کر سرخ سانپ کے مہرے کی تلاش میں کوہ قاف کی جانب چلا۔ کئی منزلوں کے بعد ایک دن صبح کے وقت قضائے حاجت کو جاتا تھا کہ ایک بچھو ہفت رنگ کا سنگ مرغ کے برابر چلا جاتا دیکھا۔ حاتم ڈرا اور وہ کسی کونے میں چھپ رہا۔ حاتم دن بھر اس کی جستجو میں رہا۔ چاہا کہ دیکھنا چاہیے یہ رات کو کیا کرتا ہے ادھر ادھر کئی گاؤں آباد تھے۔ ان لوگوں نے حاتم کی آب و دانہ سے تواضع کی اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ رہا۔ اتفاقاً میدان میں بہت سے گھوڑے اور گائیں جمع ہو گیا ان کے پاس تین چار نگہبان سو رہے۔ پہر رات گزرنے پر وہ بچھو پتھر کے نیچے سے نکلا۔ اور گایوں کی طرف گیا۔ اور ایک گائے کے پیر پر ڈنک مارا۔ وہ تڑپ کر مر گئی۔ اور اس طرح سب کو مار ڈالا۔ پھر گھوڑوں کے گلے میں آیا اور ان کا بھی ان کے نگہبانوں سمیت خاتمہ کیا۔ پھر اس پتھر کے نیچے جا کر چھپ گیا۔ جب صبح ہوئی گاؤں کے رہنے والے جو اس جنگل میں آئے تو یہ حال دیکھا۔ ہر ایک کے پیٹ سے نیلا پانی بہا جاتا تھا۔ انہوں نے پوچھا اے مسافر تو کیوں کر بچا رہا۔ حاتم نے حقیقت بتائی۔ وہ بچھو پھر اس پتھر کے نیچے سے نکلا اور ان کے سردار کے سر پر ڈنک مارا۔ وہ تڑپنے لگا۔ بچھو نے جنگل کی راہ لی۔ حاتم اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک شہر آیا بچھو وہاں لوٹ پوٹ کر کالا سانپ بن گیا اور بل میں جا بیٹھا۔ حاتم حیران اور سوچ میں وہاں

بیٹھ رہا جب پہر رات گزر گئی وہ سانپ پھر بل سے نکل کر شہر کی طرف چلا۔ حاتم پیچھے پیچھے وہ بادشاہ کے محل میں ـــــــــ گھس گیا۔ اور بادشاہ کو ڈس کر وزیر کی حویلی میں پہنچا وہاں اس کی بیٹی کو کاٹ کر نکلا اسی سوراخ میں جا بیٹھا۔ صبح شہر میں ہائے توبہ مچی۔ شام ہوئی سانپ پھر بل سے نکلا اور کسی طرف کو چل پڑا حاتم بھی اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ صبح ہوتے ہوتے ایک دریا کے کنارے جا پہنچا وہاں شیر کی صورت ہو گیا۔ دس بارہ آدمی پانی پینے آئے ان میں ایک لڑکا چودہ پندرہ برس کا تھا اس پر جا پڑا اور اس کو اٹھا کر ایک گوشے میں لے گیا۔ وہاں اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اور دل اور جگر کو پرزے پرزے کر کے جنگل کو چلا۔ حاتم بھی ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک عورت نازنین کی صورت بن کے راستے پر جا بیٹھا۔ حاتم تاک لگائے ایک درخت کے نیچے بیٹھ رہا۔ دو بھائی سپاہی زادے ایک مدت بعد کچھ کماتے ہوئے گھر کی طرف چلے جاتے تھے۔ قریب آئے تو وہ عورت رونے لگی۔ بڑا بھائی اس کے پاس گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پوچھا تو کون ہے۔ اور کس لیے روتی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں فلانے شخص کی جورو ہوں۔ وہ میرے میکے سے لیے اپنے گھر جاتا تھا۔ اتنے میں ایک شیر جنگل سے نکلا اور اس کو اٹھا کر لے گیا۔ نہ اپنے باپ کے گھر کا راستہ جانتی ہوں نہ سسرال کا۔ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔" اس سپاہی زادے نے کہا مجھے قبول کر۔ عورت بولی۔ "تین شرطوں سے ایک یہ کہ تیرے گھر میں دوسری عورت نہ ہو۔ دوسری یہ ہے کہ مجھ سے محبت و خدمت نہ ہو سکے گی۔ تیسری یہ کہ جب تک میں جیوں مجھکو ایذا نہ دینا۔ اور نہ کڑھانا۔" سپاہی زادے نے قبول کیا۔ اور کہا تو کار فرمائی کرتی رہنا بخوبی کام ہوگا اور کسی نے بھی ـــــــــ آج تک اپنی معشوقہ کو ستایا ہے۔ جو میں تجھے رنجیدہ کروں گا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے چلا حاتم بھی پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دور جا کر اس عورت نے اس جوان سے کہا میں تین دن سے بھوکی ہوں کھانے کی کوئی چیز نہ ملے تو پانی ضرور لایا جائے۔ وہ اس عورت کو درخت کے نیچے بٹھا کر اپنے چھوٹے بھائی کو اس کی خبرگیری کے لیے چھوڑا اور خود پانی لینے گیا۔

کہانی میں یہ تین شرطیں معاشرتی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں پہلی یہ ہے کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ عورتوں میں سوتیہ ڈاہ بہت ہوتا ہے۔ دوسری شادی کی ہندوستان میں یوں بھی ممانعت رہی ہے اور بہت ہی خاص حالتوں میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی جا سکتی ہے۔ دوسری شرط سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں سے محنت مشقت بہت لی جاتی تھی اور جنوبی ہندوستان میں آج تک مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ کام کرتی ہیں۔

اس کے جواب میں خصوصیت کے ساتھ وہ جس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کوئی بھی اپنی معشوقہ کو کڑھاتا ہے جو میں کڑھاؤں گا۔ اس میں یہ پہلو بھی پوشیدہ ہے کہ ہندوستان میں بیوی معشوقہ ہوتی ہے۔ ہاتھ پکڑنا گویا ذمہ داری سنبھالنا ہے۔ اس لیے ایک عبارت ہے کہ ہاتھ چھوڑا۔ ساتھ نہیں چھوڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولی میں نے تیرے واسطے اس کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا۔ اپنی خدمت میں رکھ۔ اس نے کہا کہ "تم ہماری ماں بہن کی جگہ ہو یہ ہم سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ پھر اس نے چھوٹے بھائی پر تہمت لگانے کی دھمکی دی۔ چھوٹے سپاہی زادے نے کہا جو چاہے کر میں ہرگز تیرا نہ ہوں گا۔ اتنے میں بڑا بھائی آ پہنچا۔ اس نے دیکھتے ہی سر پر خاک ڈالی گالی گلوچ اور سر کے بال کھسوٹے اس سپاہی زادے نے سبب پوچھا۔ وہ بولی کوئی اپنی عورت کو ایسے بدکار کے پاس چھوڑ کر نہیں جاتا ہے۔ فقط خدائے کریم نے میری شرم رکھی۔ یہ کہتا تھا کہ اگر قابو پاؤں تو بڑے بھائی کو ٹھکانے لگا دوں گا۔" وہ غصے سے کانپنے لگا۔ اور کہا آج تک کس نے اپنی ماں اور بہن سے ایسا کیا ہے جو تو ایسا کیا چاہتا ہے اور چھوٹے بھائی کی قسموں پر بھی اعتبار نہ کیا اور تلوار ایسی ماری کہ سینہ تک پہنچی اور چھوٹے بھائی نے ایسا خنجر مارا کہ اس کے پیٹ کو ناف تک چیر گیا دونوں جاں بحق ہو گئے۔ وہ عورت بھینس ہو کر آگے بڑھی۔ حاتم اس کے پیچھے ہو لیا۔ ایک گاؤں کے قریب پہنچی اور گاؤں والوں نے چاہا کہ اسے اپنے گھر لیجائیں قریب آئے تو کتنوں کو لاتوں سے مار ڈالا۔ اور کتنوں کو سینگوں سے پھوڑ دیا۔

بعض قوموں میں یہ دستور رہا ہے کہ ایک بھائی کی شادی ہو جاتی تھی اور وہ عورت باقی سب بھائیوں کی بیوی ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس بھی شادی بیاہ کا تصور موجود تھا اور وہ یہ ہے کہ بڑے بھائی کی بیوی ماں اور بہن کے برابر ہوتی تھی۔ یہی وہ تصور ہے جس کا اظہار چھوٹے سپاہی زادے کی زبان سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ دونوں سپاہی زادے ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں اور تیغ و خنجر استعمال کرتے ہیں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ موت بھینس کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ بھینس کو موت سے نسبت ہے کہ موت کا دیوتا یم دود کی سواری ہندو روایات کے مطابق بھینسا ہے۔

پھر ایک جنگل میں جا کر ایک بوڑھے مرد کی صورت بن گئی اب حاتم نے سوچا کہ اس سے ماجرا پوچھا جائے۔ یہ دوڑا اور پکار کر کہنے لگا اے پیر مرد برائے خدا ذرا ٹھہر جا وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔" اے حاتم تو خوش تو ہے کیا کہتا ہے کہہ" حاتم نے اس سے جس صورت میں اس کو دیکھا تھا اس اس شکل کا حال پوچھا۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ کہ تجھے اس کے سننے سے کیا ایک دن تجھکو بھی اس صورت سے کھاؤں گا حاتم نے کہا کہ جب تک تو یہ بھید مفصل نہ کہے گا میں تجھ کو نہ چھوڑوں گا۔ تب اس نے ناچار ہو کر کہا۔ میرا نام ملک الموت ہے۔ جس صورت سے حکم ہوتا ہے اس شکل سے ایک ایک کی جان قبض کرتا ہوں۔ حاتم نے پوچھا میری اجل کیا ہے اور کس ڈھب سے آئے گی۔"؟ اس نے کہا ابھی تو تیری عمر آدھی نہیں گزری۔ جب تو پچاس برس کا ہو گا تب ایک برآمدے سے گر پڑے گا۔ اور تیری ناک سے یہاں تک لہو جاری ہو گا کہ تو مر جائے گا۔ ..... اس عرصہ میں جو نیک کام تیرے ہاتھ سے نکلے تو اس میں کوتاہی نہ کر..... سجدۂ شکر ادا کرنے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا تو وہ پیر مرد نظر نہ آیا۔

رزق کو حیلے سے اور موت کو بہانے سے وابستہ کیا گیا ہے یہاں موت نے طرح طرح کے روپ دھارے یہاں تک کہ وہ گزر جانے والے قصے میں ایک خوبصورت عورت کے روپ میں سامنے آئی ہے اس موقع پر فانی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
میری قضا کو لائے دلہن بنائے ہوئے

درگا کی مورتی کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ہر ہاتھ میں ایک الگ ہتھیار ہے اور اس طرح بارہ ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ بارہ ہتھیاروں کی بھی مالک ہے۔ درگا موت کی دیوی تو نہیں ہے۔ لیکن وہ ALL POWER FUL ہے۔ موت بھی ایک دوسرے معنیٰ میں ہر طرح سے صاحب قدرت ہے۔ لیکن قصہ نگار نے اس کا احاطہ رکھا کہ وہ بغیر حکم ربّی کے کسی کی جان نہیں لیتی۔ نیز یہ بھی کہ کس کس کی روح کب اور کیسے قبض کی جائے گی۔

حاتم وہاں سے چلا تو کئی دنوں میں زمین سیاہ میں جا کر پہنچا وہاں کے سانپ آدمی کی بو پا کر چاروں طرف سے دوڑے۔ وہ ھیوز کا عصا گاڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔ سانپوں نے اس کے گرد حلقہ کر لیا۔ اور ساری رات یہی صورت رہی۔ صبح ہوتے ہی وہ سب کے سب جہاں سے آئے تھے وہاں چلے گئے۔ حاتم وہاں سے آگے زمین سفید پر جا پہنچا وہاں سفید سانپ بھی اسی طرح سے ساری رات اس کے گرد بیٹھے رہے۔ اور صبح وہاں سے چل کر زمین سبز پر پہنچا۔ وہاں بھی یہی کچھ پیش آیا۔ اس کے بعد زمین سرخ پر جا پہنچا۔ وہاں کی زمین شنگرف سے بھی زیادہ سُرخ تھی۔ کئی قدم چلا۔ چلنے کی طاقت نہ رہی۔ سوچنے لگا آگے کیسے جاؤں۔ پیاس سے جان لبوں پر آئی ہوئی ہے۔ پھر بھی آگے بڑھا کیونکہ یہ سمجھتا خدا کی راہ میں غیر کے واسطے مارے جانے سے کوئی بات اچھی نہیں۔ اور زمین کوس گیا کہ دونوں پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے۔ خاک پر گر پڑا۔ گرتے ہی تمام بدن پر زخم پڑ گئے۔ اور جی ڈوبا۔ ایک پیر مرد نے اس کو اٹھا کر کہا۔ "اے حاتم یہ وقت ہمت ہارنے کا نہیں..... وہ مہرہ جو تجھے اس خرس کی بیٹی نے دیا ہے اپنی کمر سے نکال کر منہ میں رکھ لے۔ مہرہ منہ میں رکھتے ہی زمین کی گرمی اور پیاس کی شدت دور ہو گئی۔ اور حاتم اس گرمی کا سبب معلوم کرنے لگا۔ پیر مرد نے کہا۔ "یہ گرمی سُرخ سانپ کے زہر کی ہے اور اس زمین سے اس کے منہ کی آگ نکلتی ہے۔ اس سبب سے اس زمین کا رنگ لال ہے اور نہیں تو یہ آگے سبز تھی۔

خدا کی راہ میں غیر کے واسطے مارے جانے سے بہتر کوئی بات نہیں۔ یہ سوچ لینے پر غیبی امداد کا آجانا لازم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خدا کی راہ میں دشواریاں تو ہیں لیکن

ناکامیابی نہیں۔ اگر عزم اور ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے وہ معاشرہ جس میں مہموں کا ہی رواج تھا اور کارنامے ہی انجام دیئے جانے کا چلن تھا۔ ایسے واقعات سے معمور ہے جن میں پہاڑ ٹل جاتے ہیں اور دریا راستہ دے دیتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسروں کی بھلائی کے لیے وجود میں آتے تھے۔ یہی فلاح تھی اس زمانے کے معاشرے کی۔ جو نیک کام تیرے ہاتھ سے نکلے تو اس میں کوتاہی نہ کر۔"

آدھی دور گیا تھا کہ سُرخ سانپ نے حاتم کی بو پا کر پھنکار ماری منہ سے شعلے آسمان تک پہنچے۔ مہرے کے باعث تھوڑا تھوڑا پانی ٹھنڈا اس کے حلق میں جاتا تھا۔ سانپ سامنے پر نظر پڑتے ہی پھنپھنا کر لپکا۔ مگر ھیوز کے نیزے کے باعث زہر کارگر نہ ہوا رات اسی پریشانی میں گزری صبح کے وقت مہرہ سانپ کے لبوں پر آ رہا حاتم نے دیکھا کہ ایک خلیلہ سرخ سانپ کے لبوں پر چمک رہا ہے۔ اس نے نیزے کو ہلایا وہ اپنا سر زمین پر ٹیکنے لگا۔ اور آفتاب نکلنے کے ساتھ اس نے منہ سے مہرہ اگل دیا اور اپنی بانبی میں چلا گیا۔ حاتم نے وہ مہرہ اٹھا کر پگڑی میں باندھا گرمی جاتی رہی اور جنگل کی ساری زمین سرد ہو گئی۔

یاقوت۔ مہرے یا نگینے کی تاثیر بہت سی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ جادو ٹونے کی بھی علامتیں ہو سکتی ہیں۔ اور کچھ ایسی طلسمی تیروں پھولوں اور دواؤں کی بھی جن کے دیئے سے بہت سے خطرناک امراض کا علاج ممکن ہو جاتا ہے اور آدمی بہت سی آفتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ آج بھی انگوٹھی کا نگ کئی کام دے جاتا ہے۔

حاتم مہرہ لے کر اس جوان کے پاس پہنچا اور مہرہ دے کر تمام احوال کہے۔ اس جوان نے وہ مہرہ مستحر جادوگر کے آگے رکھ دیا۔ اس نے اس کی آزمائش کی اور مہرہ تحقیق ہوا تو تیسری شرط بھی پیش کی۔ اور مستحر جادوگر نے ایک لوہے کا کڑھاؤ گھی سے بھر کر چولہے پر رکھوا دیا اور سات روز تک دن رات خوب کڑکڑاتا رہا۔ حاتم نے دلاسا دیا اور کہا غم نہ کھا خدا کو یاد کرو وہ یہ بھی مشکل آسان کرے گا۔ حاتم نے خرس کی بیٹی کا مہرہ دیا اور کہا اسے منہ میں رکھ اور کڑھاؤ میں کود پڑ اور غوطہ مار کر نکل آ۔ قریب جا کر جوان گھبرایا تو

حاتم نے للکار کر کہا۔ "یہ آتشِ عشق ہے خدا کو یاد کر۔"

"یہ مہرہ جو اس کے پاس ہے ایک ایسے نوجوان کو اس وقت بھی زندہ رکھتا اور آگ کی شدت سے بچا لیتا ہے جب سات دن تک ابالے گئے تیل میں اس کو ڈال دیا جاتا ہے۔ کڑھائی میں ڈالنا اور گرم توؤں کے نیچے رکھ کر ہلاک کرنا تاریخ جرم و سزا کا حصہ ہے اور اس طرح بچ کر نکل آنا معجزے کرشمے اور کرامت کے ظہور کا۔

دونوں عاشق و معشوق کو ملا کر حاتم رخصت ہوا آخر ایک دن کوہ الفا کے قریب جا پہنچا دیکھا ایک پہاڑ آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ حاتم اس کے نیچے بیٹھ گیا۔ کہ یہاں کے کسی رہنے والے کو دیکھوں تو معلوم کروں کہ کونسی راہ ہے۔ اتنے میں پریزادوں کا ایک گروہ دکھائی دیا۔ حاتم ان کے پیچھے دوڑا لیکن وہ نہ ملا۔ ایک بڑا سا غار دکھائی دیا اس کے کناروں پر ایک صاف چکنا پتھر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس پتھر پر سے پھسلنے چلنے کی ٹھانی۔ اور شام تک لڑھکتا چلا گیا۔ جب پاؤں زمین پر لگے دیکھا کہ میدان بہت لمبا چوڑا ہے۔

پریزاد حاتم کو دیوانہ سمجھے اور غصہ ہو کر اس کی طرف دوڑے اور قتل پر مستعد ہوئے حاتم سر جھکا کر چپکا کھڑا رہا۔ وہ کہنے لگے "ایسے آدمی کو کوئی کیوں کر قتل کرے۔" حاتم سے بولے: "تیرے بھلے کو کہتے ہیں اگر سلامت جانا چاہتا ہے تو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ نہیں تو رنج اٹھائے گا بلکہ مارا جائے گا۔" حاتم نے کہا: "جان کے جانے کا مجھ کو کچھ رنج نہیں میں نے خدا کی راہ میں سر دینا اختیار کیا ہے۔"

تین روز کے بعد انہوں نے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا: "مجھے الگن پری سے ایک ضروری کام ہے۔ وہ ایک جوان سے سات روز کا وعدہ کر کے یہاں آئی ہے اور سات برس گزر گئے وہ اس کے انتظار میں مرگ کے قریب پہنچا ہے۔"

الگن سنسکرت کا بہت خوبصورت لفظ ہے جس کے معنی 'ہم آغوشی' کے ہیں۔ ہم آغوشی ہندو تہذیب کی ایک اہم نفسیاتی علامت ہے۔

یہاں اس کا ذکر تہذیب و تاریخ کے اس دور کی طرف ذہن کا مائل

کرتا ہے جب مسلمانوں کے محلوں اور خانۂ باغوں میں صدہا ایسی باندیاں اور کنیزیں ہوتی تھیں جن کو خوبصورت ہندوئی نام دیئے جاتے تھے۔ یا پھر واقعتاً وہ ان کے نام ہوتے تھے۔ ہم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ پریوں کی شکل دراصل اپسراؤں نے اختیار کی تھی اور اپسراؤں کے تو ہندو نام ہوتے ہی تھے۔

"میں اس واسطے آیا ہوں اس لیے کہ اس کا قول اسے یاد دلاؤں۔"

الگن پری آئی اور تخت پر بیٹھی۔ پریزاد حاتم کو ایک جھروکے کے پاس بٹھا کر بولے۔ "دیکھ وہ جو دھانی جوڑا پہنے اور سر پر آنچل پلو کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تخت پر بیٹھی ہے وہی الگن پری ہے۔

حاتم اسے دیکھ کر غش کھا گیا۔ ہوش آیا تو خدا کی درگاہ میں سجدہ کیا اور اس کی صفت پر متفکر ہوا۔ تین دن تک جوان کو بہلائے رکھا۔ جس کے واسطے یہ محنت اٹھائی تھی کھانا پینا چھوڑ دیا۔

پری نے کہا۔ میں تجھ کو دیکھ کر اسے بھول گئی وہ میرے لائق نہیں عشق بھی اس کا خام ہے کیونکہ سات برس گزر گئے کہ وہ اپنی جان کے ڈر سے وہیں رہا اور اس نے کوہ الفا پر قدم نہیں رکھا۔

صبح الگن پری آئی اور کہا۔ "تو نے دانہ پانی کیوں چھوڑا ہے۔ اگر بے آب و دانہ مر جائے گا تو میں تیرے گناہ میں پکڑی جاؤں گی۔ اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ حاتم نے کہا تو اس کو بلوا کر دیدار دیکھ اور وہ تیرا دیدار دیکھے۔ پری نے کہا۔ "یہ بات میں نے قبول کی۔" اور پریزادوں کو بھیج کر بلوا لیا۔ ملکہ نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ملکہ نے گلاب چھڑکا۔ وہ ہوش میں آیا تو الگن پری نے کہا۔ اے جوان: مجھ کو خوب سا دل بھر کر دیکھ لے۔ شام کو نشاط کی محفل آراستہ کی گئی۔ ناچ راگ شروع ہوا۔ حاتم اور وہ جوان بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے الگن پری اس جوان کی طرف متوجہ نہ تھی۔ حاتم نے جو خواب میں دیکھا تھا اس جوان سے اسی طرح عمل کرایا وہ اس کام میں مصروف تھا کہ کئی پریوں کی نظر پڑی وہ دوڑیں اور کہا۔ "تجھے آب خاص کی

تھیلیوں سے کیا کام ہے"۔ اس نے کہا۔ شدت سے پیاسا ہوں کیا کروں۔ انہوں نے اسے پانی دے دیا اور وہ جوان پھر حاتم کے پاس آ پہنچا۔ حاتم نے ملکہ سے کہا اس کو نہایت گرمی ہے تھوڑا سا شربت پلاؤ۔ پری کے حکم سے شربت آ گیا۔ حاتم نے اپنے ہاتھ سے شربت بنایا اور شہزادوں کے سامنے لے آیا۔ اس نے کہا: "تھوڑا تھوڑا سب پئیں"۔ حاتم نے کہا۔ "پہلے آپ قدرے نوش جان کریں پھر سب پئیں گے"۔

دو گھونٹ پیتے ہی وہ آدم زاد پر دیوانی ہو گئی لیکن حاتم سے کہا۔ "ماں باپ کی بے رضامندی یہ کام نہیں کر سکتی ہوں۔ تیرا کہا مانا اور اس کو قبول کیا الگن پری ماں کے پاس گئی۔ اس کے مصاحبوں نے کل کیفیت بیان کی الگن پری کی ماں اپنے میاں سے اجازت اور منظوری لینے گئی اور رضامندی حاصل ہو جانے پر شادی کر دی گئی۔

الگن پری کی شادی بغیر ماں کی اجازت کے نہیں ہوئی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ داستان نگار اور اس کے معاشرے میں شادی کو ایک ایسا Institution مانا جاتا ہے جس کا تعلق گہرے طور پر خاندانی روایت سے جڑا ہوا ہے۔

سات روز کے اندر حاتم وہاں سے روانہ ہوا۔ پری کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ کوہ آمر کا قصد ہے۔ مجھے وہاں ایک کام ضروری ہے۔ اور پری کے حکم سے تخت پر بٹھا کر فوراً وہاں جا پہنچا۔ پریزادوں کو رخصت کیا خود اس آواز پر چل نکلا اس درخت کے نیچے ایک پیر مرد وہاں لوہے کے ایک پنجرے میں ہے اس سے پوچھا۔ "اے بزرگ یہ آواز کیوں تیرے منہ سے ہر گھڑی نکلتی ہے اور کون ہے جس نے تجھے اس پنجرے میں بند کرکے لٹکا دیا ہے۔" اس نے کہا میں احمر کا سوداگر ہوں یہ ملک میرے باپ نے میرے نام سے آباد کیا تھا میرے بڑا ہونے پر باپ اس شہر سے تجارت کے واسطے کسی ملک کو گیا۔ میں نے سارا زر و جواہر، مال و متاع تھوڑے ہی عرصے میں اڑا دیا۔ میرا باپ اس سفر میں مر گیا۔ کچھ مال ہاتھ نہ لگا۔ چند روز کے بعد بازار میں ایک جوان کو یہ کہتے ہوئے پایا جس کا زر و جواہر مال و متاع کھو گیا ہو خواہ زمین میں گاڑ کر بھول گیا ہو۔ میں اپنے علم سے نکال لیتا ہوں۔ لیکن اس شرط پر کہ چوتھا حصہ مجھے دے۔

اسے گھر لایا اور ایک کونے کو کھدوایا وہاں زر و جواہر بے شمار نکلا چوتھائی دینے میں حیلہ کرنے لگا۔ اور اسے تھوڑا سا دینے کو کہا اس کے کہنے پر کہ چوتھائی حصہ لوں گا۔ میں برہم ہوا اور طمانچہ مار کر باہر نکال دیا کئی دن کے بعد پھر آیا اور دوستی پیدا کر لی اور ایک دن کہنے لگا کہ جو کچھ زمین میں گڑا ہوا ہے مجھے سب نظر آتا ہے۔ میں نے اس سے وہ علم سیکھنے کی آرزو کی۔ اس نے کہا۔ ایک سرمہ بنا کر جو کوئی آنکھوں میں لگا دے جتنا مال چھپا ہوا ہے نظر آنے لگے۔ میں نے کہا۔ اگر تو اس سرمے کو میری آنکھوں میں لگائے اور مال نظر آنے لگے آدھا تیرا آدھا میرا۔ وہ مجھے جنگل میں لے گیا اور اس پنجرے کو دیکھ کر اس سے پوچھا یہ پنجرا کس کا ہے۔ اس نے کہا میں نہیں جانتا اور اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور سرمہ کی ڈبیہ نکال کر سلائی سے میری آنکھ میں پھیر دیا میں اندھا ہو گیا میں نے پوچھا یہ کیا کیا اس نے کہا جھوٹوں اور بدعہدوں سے یہی سزا ہے۔ اگر بصارت چاہتا ہے تو اس پنجرے میں بیٹھ جا اور یہ سخن کہا کہ کسی سے بدی نہ کر کرے گا تو وہی پاوے گا۔ پوچھنے پر اس نے علاج بتایا کہ ایک مدت بعد ایک جوان حق پرست ادھر آوے گا وہ کہیں سے نور ریز گھاس لا کر اس کا پانی تیری آنکھوں میں جو ٹپکائے تیری آنکھیں جیسی تھیں ویسی ہی ہو جائیں گی۔

اس میں وہ پیر مرد جو پنجرے میں گرفتار ہے وہ قید کیے ہوئے جانوروں کو اور قفس میں محبوس طائروں کی بھی کہانی سناتا ہے اور جیل خانوں میں بند زندانیوں کی بھی اس کے علاوہ پوری کہانی میں دو تین باتیں قابل توجہ ہیں۔ زمین کے اندر خزانوں کا چھپا ہونا ایسا ہوتا ہی تھا پھر کسی عمل کے ذریعہ یا اتفاقاً ان کا نکل آنا اس کے بعد کا قصہ اس اعتبار سے عبرت خیز ہے کہ انسان احسان فراموش ہے۔ اور ذرا سی دیر میں بد دیانتی پر آمادہ ہو جانا۔ لالچ آدمی کو عذاب میں گرفتار کر دیتا ہے۔ اور وہ بے طرح اس کی سزا پاتا ہے اس کے بعد جڑی بوٹی سے اس کا علاج ہونا کہانیوں میں خاصا عام ہے آخر گل بکاولی کا تو پورا قصہ اسی پر بنی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اطبا، کتنے لائق ہوتے تھے اور آنکھوں کا کس طرح جڑی بوٹیوں سے علاج کیا جاتا تھا اور سرمہ سے

سے متعلق کیا کیا تصورات تھے۔

الگن پری حاتم کو چھوڑ کر جانے والے پریزادوں پر جھنجھلائی اور کہا اس کے کام سے فراغت پانے کے بعد اسے گھر پہنچا کر جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔

حاتم نے ان سے کہا جہاں نور ریز گھاس ہے وہاں جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے حاتم کو اس جنگل کے قریب پہنچا دیا۔ لیکن خود وہاں نہ گئے کہا اگر تم سلامت پھروگے تو تمہیں تمہارے شہر پہنچا دیں گے وجہ پوچھنے پر انھوں نے بتائی کہ جب وہ گھاس نکل آتی ہے جنگل کے تمام پھول چراغ کی مانند روشن ہو جاتے ہیں اور ہزاروں سانپ بچھو اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

حاتم اور پریزاد کئی دن تک اس جنگل میں رہے ایک دن وہ گھاس دکھائی دی جہاں تک پھول تھے چراغ تھے چراغوں کی طرح روشن ہو گئے۔ حاتم منہ میں مہرہ کو رکھ کر گھاس کی دو تین پتیاں لے کر لوٹ آیا۔ پریزادوں نے اسے پیر مرد کے پاس پہنچایا۔ حاتم نے اس کے کہنے پر گھاس کے دو تین قطرے اس کی آنکھوں پر ٹپکائے اور بصارت ..... واپس آ گئی۔

چوتھا سوال

"سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔"

حاتم کئی شہروں کے بعد ایک دامن کوہ میں پہنچا۔ دیکھا لہو سے بھرا ہوا ایک بڑا دریا بہہ رہا ہے۔ اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے اس طرف روانہ ہوا۔ ایک عالیشان باغ دکھائی دیا پاس پہنچنے پر دیکھا کہ ہر ایک ڈالی میں آدمیوں کے سینکڑوں سر لٹکتے ہیں اور نیچے ایک تالاب ہے۔ اس کا پانی جنگل کی طرف چلا جاتا ہے۔ درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ سروں نے قہقہہ مارا۔ آخر اس کی نظر سب سے اوپر کے سر پڑی۔ اسے دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو یہ اسرار معلوم کرنے کے لیے تھوڑے دن وہیں رہنے کا ارادہ کیا۔

کٹے ہوئے سروں کا درختوں پر لٹکے رہنا تو اس دور میں تاریخ کا کوئی انوکھا منظر نامہ نہیں ہے ایسا تو ہوتا تھا لیکن یہ تصویر اپنی جگہ پر غیر معمولی میں علامتی کردار رکھتی ہے۔ کہ سر ہیں اور درخت کی شاخوں پر پھلوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں اور ان سے جو خون بہہ رہا ہے اس سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا ہے۔ اس میں تخیل اور تمثیل کا جو عنصر ہے وہ اپنے طور پر بہت پرکشش ہے ورنہ بقول میرے استاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، " ہلاکو خاں نے جب سلطنت بغداد کو تباہ کیا اور اس شہر کے لوگوں کا قتل عام عمل میں آیا تو کہتے ہیں کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہو گیا تھا ان لٹکے ہوئے سروں کا قہقہہ لگانا

اس میں ایک طلسم کی سی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایسے کٹے ہوئے سر موت کے قہقہہ کی علامت تو ہوتے ہی ہیں۔

رات ہوئی تو وہ ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سارے سر درخت سے تالاب میں گر پڑے۔ تالاب میں ایک نشست تھی۔ کئی گھڑی کے بعد کئی پریاں نکلیں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ نوکیلی اور سجیلی تھی تخت پر بیٹھ گئی۔ حاتم نے غور سے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہی سر ہے جو سب سے اوپر تھا۔ دوسری پریاں کرسیوں پر اس کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ اور کچھ ہاتھ باندھ کر باادب کھڑی ہو رہیں۔ طائفہ ساز ملا کر تخت کے سامنے ناچنے لگا۔ آدھی رات کو دسترخوان بچھا اور انواع واقسام کے کھانے چنے گئے۔ اس تخت نشین نے ایک خواص سے کہا۔ ایک خوان اس مسافر کو جو فلانے کونے میں بیٹھا ہے دے آ۔"

حاتم کے پاس وہ خواص خوان لے کر پہنچی تو اس نے اس خواص اور پریوں کے سردار کا نام پوچھا۔" اس نے کہا تجھے نام سے کیا لینا ہے۔ اگر بھوکا ہے تو کھانا کھا۔" حاتم نے کہا۔" اگر نام نہ بتائے گی تو ہرگز نہ کھاؤں گا۔" اس پر وہ ملکہ کے پاس واپس آئی اور کہا۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تو اپنا نام اور اپنے سردار کا نام اور اس جماعت کا احوال کہ تالاب سے نکلی ہے ظاہر نہ کرے گی کچھ نہ کھاؤں گا۔" اس نے حاتم سے آکر شہزادی نے جو کچھ کہا تھا کہہ دیا۔ حاتم نے چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑے وہ بھاگ کر تالاب میں کود پڑی۔ اور ملکہ کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ تمام رات ناچ راگ ہوتا رہا صبح کو سب تالاب میں کود پڑیں اور پھر کچھ دیر کے بعد کئی سر پانی میں تیر آئے اور آپ ہی آپ اچھل کر درخت کی ڈالیوں میں لٹک گئے۔ حاتم سردار کے سر پر ٹکٹکی لگائے رہا اور دل میں کہا اگر اس بھید کو پاؤں تو اس نازنین سے جو شب کو چھپتی ہے ہر طرح نکاح کروں۔

پانی سے گزر کر کسی محل میں پہنچنا خود اس کہانی کے ایسے واردوں میں ہے جن سے ہم ایک سے زیادہ موقعوں سے گزرے ہیں یہاں تخیل نے جو طلسم آراستہ کیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ یہاں پہنچ کر پھر غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردوں میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو گئیں

اس واقعہ کو ہم غالب کے اس شعر کی روشنی میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

ہم غالب کے ان اشعار کی روشنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ داستانوں نے فکر شعر کو کس طرح متاثر کیا ہے

دوسری رات پھر پہلی رات کی طرح محفل آراستہ ہوئی۔ حاتم انتظار میں رہا کہ آج وعدہ وفا کرتی ہے یا نہیں۔ جب خوان آیا تو حاتم نے کہا اے پری تو نے کہا تھا کہ میں کل احوال کہوں گی۔ اور نام بتاؤں گی۔ . . . . آج وعدہ وفا کر۔" اس نے پھر بادشاہزادی سے کہا۔ تو اس نے کہلوا بھیجا۔ جب تو ملکہ کے حضور میں آئے گا اس وقت یہ بھید کھل جائیگا پہلے کھانا کھا اس کے بعد میرے ساتھ چل۔"

کھانا کھانے کے بعد حاتم اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ غوطہ مار کر اس جگہ بدستور قایم ہوئی حاتم نے جو آنکھیں بند کر کے تالاب میں غوطہ مارا اور زمین کی تہہ پر اس کے پاؤں لگے تو نہ تالاب تھا نہ درخت نہ وہ پریاں بلکہ ایک لق ودق جنگل یکایک نعرے مارنے لگا۔ اور آہیں بھر کر سر پر خاک ڈالنے لگا۔ جب اس حالت میں سات دن رات گزر گئے تو خدا کے حکم سے حضرت خضر علیہ السلام آئے۔

حضرت خضر نے اپنے دست شفقت سے حاتم کو اس کی اصل صورت بخشی اور کل ماجرہ کہہ سنایا کہ اس کو صحرائے خبرپرس کہتے ہیں اور حاتم حضرت خضر کا عصا پکڑ کر دوبارہ اسی جگہ پر لوٹ آیا جہاں پر سر درختوں سے لٹک رہے تھے۔

حاتم نے دوبارہ اس طلسم کو توڑنے کی کوشش کی مگر وہ درخت کے اندر دھنس گیا اور حضرت خضر نے دوبارہ اپنے عصا کے ذریعہ اس کو باہر نکالا۔ اور کل کہانی کہہ سنائی۔

اور کہا یہ سردار شاہ احمر جادوگر کی بیٹی ہے اور اس مکان کا نام کوہ احمر ہے۔ اس کا نام ملکہ زریں پوش تھا باپ سے اس نے شادی کی خواہش کی

تو اس کے باپ نے سزا کے طور پر اس کو اس طلسم میں قید کر دیا۔ حاتم نے کہا میں اس درخت پر چڑھنا چاہتا ہوں۔ حضرت خضر نے ایک عصا اس درخت پر مارا اور اسم اعظم پڑھ کر کہا۔ اس درخت پر چڑھ جا۔

حاتم درخت پر چڑھ گیا جب سب سے اوپر والے سر کے برابر پہنچا اس کا سر بھی انہیں سروں کے برابر لٹکنے لگا۔ اور تن تالاب میں گر گیا۔ رات ہوئی تو سب سر حاتم کے سر سمیت اس تالاب میں گر پڑے اور حسب سابق محفل آراستہ ہوئی اور حاتم تخت کے ایک کونے سے لگ کر کھڑا رہا۔ لیکن اسے کچھ خبر نہ تھی۔ ملکہ زرین پوش نے اس سے اس کا نام اور پتہ معلوم کیا۔ اس نے کہا۔" میں بھی تیرے خادموں میں سے ہوں اور اس تالاب سے نکلا ہوں۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ مجھ پر عاشق ہوا اور اس طرح محفل آراستہ ہوئی ملکہ نے اپنے پاس تخت پر حاتم کو بٹھایا کھانا آیا تو کھانا کھانے لگا مگر اپنے آپ سے بے خبر صبح کو حاتم کے سر سمیت اس درخت پر جا لٹکے۔

اس قصے میں بار بار حضرت خضر اس کی مدد کرتے ہیں اور اس بار بھی اپنے عطیے اور اسم اعظم کی مدد سے حاتم کو زندہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں جب تک اس کا باپ زندہ ہے اس کو کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت خضر اور حاتم دونوں مل کر احمر جادوگر کو تباہ کر دیتے ہیں۔

حاتم نے تھوڑا سا پانی پڑھ کر درخت بنے ہوئے جادوگروں پر چھڑکنے کو دیا۔ اور بسم اللہ کہہ کر سب درختوں پر چھڑک دیا۔ وہ سب اپنی اصلی صورت میں آ گئے اور ـــــ بتایا کہ شام احمر کملاق کے پاس بھاگ گیا وہ سب حاتم کے پاس آئے اور کہا۔" اے خداوند اب کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" حاتم نے کہا۔" شام احمر کی بیٹی سے بیاہ کیا چاہتا ہوں۔ اگر بخوشی بیاہ دے تو بہتر نہیں تو جیتا نہ چھوڑوں گا۔ حاتم نے انھیں اول سے آخر تک کل ماجرا بیان کر دیا۔

حاتم اس کے بعد جادو کے آسمان پر اسم اعظم پڑھ پڑھ کے پھونکنے لگا۔ وہ گنبد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہاڑ پر گرا مگر کملاق اور شام احمر کس طرف کو بھاگے

حاتم ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ آخر وہ گھبرا کر پہاڑ سے گرے اور پاش پاش ہو گئے۔ اس طرح حق کی جادو پر فتح ہوئی۔ وہاں کے لوگوں کو بندۂ خدا ہونے کی ہدایت کی اور تنبیہ کی کہ اس کے خلاف کرو گے تو اپنی سزا کو پہنچو گے۔

وہاں سے روانہ ہو کر حاتم چند روز میں ملکہ زریں کے یہاں پہنچا۔ دیکھا تو نہ تالاب ہے نہ وہ پانی مگر درخت ہرا بھرا ہے۔ اور تالاب کی جگہ پر ایک شیش محل ہے۔ دروازے پر گیا تو سب نازنینوں کو اپنی جگہ کھڑا پایا۔ انہوں نے پوچھا تم کون ہو کہاں سے آئے ہو۔ ایک پری نے ملکہ کو جا کر اطلاع دی پھر لوٹ کر آئی کہ کوہ احمر کا احوال معلوم کرے حاتم نے اسے بتایا کہ شام احمر جادوگر اپنے اعمال کے باعث مارا گیا۔ ملکہ سن کر رنجیدہ ہوئی لیکن خواص کے مشورے پر حاتم کو اندر بلوایا اور کل کیفیت جانی۔ آخر دونوں کی شادی ہو گئی۔

چاہتا تھا کہ وصل محبوبہ سے محظوظ ہو کہ منیر شامی کی یاد آ گئی وہ اس خیال سے باز رہا اور کہا خدا کی راہ میں اپنے گھر سے منیر شامی کے لیے نکلا ہوں چوتھے سوال کی تلاش میں تھا کہ یہ اتفاق ہوا اب تم اپنی خوشی سے مجھے رخصت کرو۔" اس نے کہا۔" مجھ کو کس پر چھوڑو گے۔" حاتم نے کہا۔" میں تمہیں یمن بھیجتا ہوں اس نے اپنے باپ کو ایک عرضی لکھی وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ یمن روانہ ہوئی۔ اور حاتم وہاں سے چل کر چند روز کے بعد ایک شہر میں داخل ہوا۔ لوگوں سے معلوم کیا۔" وہ کون شخص ہے جو ہمیشہ کہا کرتا ہے۔"سچ کہنے والے کو ہمیشہ راحت ہے۔"

لوگوں نے بتایا کہ ایک بوڑھے نے یہ لکھ کر اپنے دروازے پر لگایا ہوا ہے معلوم ہونے پر کہ شہر خوارزم نو کوس پر ہے حاتم اس طرف کو روانہ ہوا اس عمارت کے دروازے پر دستک دی گئی دربان آئے اور انہوں نے دریافت کیا تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ دربانوں سے مسافر کو لے آنے کے لیے کہا۔ حاتم کی اچھی خاطر تواضع کی گئی اور کھانے سے فارغ ہوتے ہی حاتم سے پوچھا گیا۔ کس واسطے اتنے دور کے سفر کا رنج کھینچا۔ حاتم نے اپنا پورا تعارف دیا اور معلوم کیا یہ آپ نے دروازے پر کس لیے لکھ کر لگا رکھا ہے۔" دوسرے دن اس کی حقیقت بتانے کو کہا رات کو حاتم

آرام سے رہا اور صبح کے کھانے کے بعد معلوم کیا۔ اس نے بتایا اس شہر کو آباد ہوئے سات سو برس گزر گئے اور میں آٹھ سو برس کا ہوں ایسا ہی اس وقت تھا جیسا کہ اب ہوں۔ میں جواریوں میں بڑا نام رکھتا تھا۔ ایک روز بالکل تنگ دست ہو گیا۔ رات کو چوری کے لیے نکلا اور بادشاہ کی حویلی میں کمند ڈالی اور اس کی خوابگاہ میں پہنچا کوئی بھی بیدار نہ تھا بادشاہ بے خبر سو رہا تھا آگے بڑھ کر گوہر شب چراغ اتار کر کمند سے باہر آ گیا۔ جنگل میں ایک درخت کے نیچے بہت سے چور کہیں سے چرائے ہوئے مال کے ساتھ دیکھے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا۔ تو کون ہے اور یہاں کہاں سے آیا ہے۔ ان سے سچ سچ کہہ کر گوہر شب چراغ دکھایا۔ چوروں نے مجھ سے چھین لینا چاہا ایک شخص جنگل میں غیب سے پیدا ہوا اور دھاکارا۔ اس کی للکار سے سارا جنگل کانپ گیا۔ وہ سب بھاگ گئے۔ میں اکیلا رہ گیا اس نے مجھ سے پوچھا تو کون ہے۔ میں نے اس سے سچ کہہ دیا اس نے کہا تو نے سچ کہا اس لیے یہ سب مال تجھے بخشا لیکن چوری سے توبہ کر۔ میں نے جوا کھیلنے اور چوری کرنے کی توبہ کی اس نے کہا تیری عمر نو سو برس کی ہوگی۔ اگر توبہ پر قایم رہا۔

اس پیراگراف سے دو تین باتیں سامنے آتی ہیں سب سے پہلے یہ کہ قدیم زمانے میں نیک لوگوں کی عمر بہت زیادہ ہوتی تھی یعنی آٹھ سو اور نو سو سال یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ قوم عاد اور ثمود کے لوگوں کی عمر اتنی لمبی ہوئی اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ساڑھے بارہ سو سال تھی۔ مگر وہ لوگ سو سو ہاتھ گز لمبے ہوتے تھے۔ بارہ بارہ گز کی چھاتیاں ہوتی تھیں جو پتھر کی ٹوپیاں اوڑھتے تھے پتھر کاٹ کر پہاڑوں کے درمیان رہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں یہی بات رہی ہو اور یہ سوچ کر اس نے اس کی عمر آٹھ سو سال بتائی ہو۔

یہاں بھی غیبی امداد مشعل راہ کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ایک بزرگ جنگل میں آ کر یہ تائید کرتا ہے کہ جو جوئے اور چوری سے ہاتھ اٹھا لے۔ تو یہ سب مال تیرا ہے۔ اگر تو نیک راہ پر چلے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ ایسی باتوں میں بھی یقین رکھتا تھا۔ گوھر شب چراغ ایسا ہی کوئی قیمتی پتھر ہوتا تھا جو صرف بادشاہوں اور امراء رؤسا

کے پاس ہوتا تھا۔

محلے والے دشمن ہوئے اور کوتوال سے جا کر کہا۔ "کل یہ کوڑی کوڑی کو محتاج تھا آج اتنی دولت کہاں سے آ گئی جو اس نے اتنی عالی شان عمارت بنوائی۔ میں نے بھی سچ ہی کہہ دیا وہ مجھے بادشاہ کے پاس لے گیا۔ میں نے وہاں بھی سچ کہا بادشاہ نے نوازش کی اور کہا اس کی راست گوئی پر میں نے یہ مال اس کو دیا بلکہ اور بھی زر و جواہر دیا اس دن دروازے پر لکھ کر لٹکا دیا۔

یہاں اس دور تاریخ اور تہذیب کے ایک اور اہم پہلو کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ شاہی اجازت کے بغیر عالی شان محلات اور مکانات کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ تاکہ کسی امیر اور رئیس کا محل شاہی محلات کی رونقوں کو کم نہ کرے۔

بادشاہ اپنے لشکر سے الگ ایک تالاب پر بیٹھا پانی اچھالنے لگا کہ ایک زنجیر ہاتھ آئی اسے کھینچا تو کنجی سمیت قفل صندوق نکل آیا۔ اس صندوق کو کھولنے پر اس میں سے ایک مہ جبین نکل آئی۔ بادشاہ کو ڈر لگا لیکن اس نازنین نے کہا میں بھی انسان ہوں اور صراحی سے پیالہ بھر کر بادشاہ کے سامنے رکھ دیا اور بوس و کنار کی امیدوار ہوئی۔ بادشاہ ریجھ گیا شراب لی اور صحبت کی جب لشکر یاد آیا اٹھا انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر دی کہ یہ میری نشانی ہے تاکہ پھر ملاقات ہو تو مجھ کو بھول نہ جائے اس نے ہنس کر انگوٹھیوں کی ایک تھیلی نکال کر دکھا دی۔

نشانی اور یاد دہانی کے طور پر بہت سی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جن میں سب سے اہم انگوٹھی یا چھلا ہے۔ ہمارا معاشرہ آج تک اس کا قائل نظر آتا ہے یہی وجہ ہے آج بھی کسی سے رشتہ جوڑتے وقت انگوٹھی پہنائی جاتی ہے یعنی عام طور پر منگنی کی رسم انگوٹھی پہنا کر ہی ادا کی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس حسین عورت کے پاس انگوٹھی کی ایک پوری تھیلی موجود ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب بھی اس سے کوئی ملتا ہے تو اس کو اپنی یاد کے طور پر انگوٹھی پہناتا ہے۔

اور کہا۔ میرے خاوند نے حفاظت کے واسطے مجھے جنگل میں لا کر اس باغ کے

اندر صندوق میں بند کر کے حوض میں لٹکا دیا ہے۔ اور آپ سوداگروں کے ساتھ سوداگری کرتا ہے۔ جو بھی تیری طرح اس باغ میں آنکلتا ہے اسی طرح حوض سے نکال کر ہم بستر ہوتا ہے پھر انگوٹھی دے کر چلا جاتا ہے۔ اتنی انگوٹھیوں میں کون سی کس کی ہے یہ بھی معلوم نہیں۔ بادشاہ نے اُسے صندوق میں بند کر کے اسی صورت میں تالاب میں لٹکا کر اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں آیا۔ سب کچھ فقیروں میں تقسیم کر کے آپ جنگل میں نکل گیا۔ پھر جب تک رہا عورت کا نام نہ لیا۔

اب ملکہ زریں پوش کو یاد کر کے شاہ آباد کو چھوڑ کر اس کی ملاقات کو یمن جانا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنی محنت خواہ مخواہ خاک میں ملاتا ہے۔

حاتم یمن کا ارادہ چھوڑ کر شاہ آباد کا راہی ہوا۔ وہاں کے لوگ اسے حسن بانو کے دروازے پر لے گئے۔ وہ اوجھل ہوگئی اور پردے کے باہر بیٹھا کر سب حال دریافت کیا۔ حسن بانو نے حاتم کے سامنے پر تکلف کھانا رکھوا دیا مگر اس نے کہا کاروان سرا میں جا کر اپنے بھائی کے ساتھ کھاؤں گا۔ رات کارواں سرا میں منیر شامی کے ساتھ رہا۔ صبح کو حسن بانو کی ڈیوڑھی پر پانچواں سوال معلوم کرنے کے لیے آ گیا۔ اور وہاں سے آ کر منیر شامی سے کہا کہ اب میں کوہ ندا کی خبر کو جاتا ہوں۔

پانچواں سوال

"کوہ ندا کی خبر لاوے۔"

بستی کے لوگوں سے پوچھا تھا کہ اگر تم میں سے کوئی کوہ ندا کی راہ سے واقف ہے مجھے بتا دے مگر کچھ نہ معلوم ہونے پر چلا جاتا ہے۔

اس زمانے میں سفر خدا کے بھروسے ہوتا تھا اس لیے کہ ہر بات بے یقینی ہوتی تھی۔ منزل کا پتہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس امر کے علاوہ اس واقعہ میں جس بات کی طرف خصوصیت سے اشارہ ہے وہ کوہ ندا ہے کہ وہ خود بھی ایک علامت ہے انسان کی منزل کا تعین یا روشنیوں سے ہوتا تھا یا دریا کے راستے سے یا پھر غیب کی آوازوں سے کوہ ندا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شہر کے گرد و نواح میں اس شہر کے مرد و زن کو جمع دیکھا ہے اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر لوگوں نے پکار کر کہا ہم کب سے تیری راہ دیکھتے ہیں۔" حاتم نے دیکھا دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے ایک جنازے کے گرد بہت سے لوگ بیٹھے ہیں پوچھنے پر مردے کو کیوں نہیں گاڑتے اور اس قدر کیوں روتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہماری قوم کی یہ رسم ہے کہ کوئی شخص مر جائے تو ہم جنازے کو جنگل میں لے آتے ہیں دسترخوان بچھا کر مسافر کی راہ دیکھتے ہیں۔ اگر مسافر اس عرصہ میں آ گیا تو مردے کو گاڑ دیتے ہیں اور کھانا اس مسافر کے آگے رکھ دیتے ہیں اس مردے کو سات روز

ہو گئے کہ اسی طرح پڑا ہے ہم عجب مصیبت میں گرفتار تھے۔ ہر روز ہی کھانا شام کے وقت اپنی عورتوں کو بھیج دیتے تھے اور آپ یوں ہی پڑے رہتے تھے حاتم کے کہنے پر کہ اگر ایک مہینہ کوئی مسافر یہاں نہ آئے تو اس مردے کا حال کیا ہو تم کیسے زندہ رہو انہوں نے کہا یہ درست ہے لیکن ساتویں دن کہیں نہ کہیں سے مسافر آ ہی جاتا ہے۔ اور جب وہ روز نہیں آیا تو تمام دن روزہ رکھیں اور شام کو صرف پانی پئیں اور مردہ بھی ایک مہینہ تک نہیں سڑتا۔ اگر مہینے سے اوپر ہو جائے اور بدبو مردے سے آنے لگے تو مردے کو گاڑ دیں اور سب مرد و زن چھ مہینے تک روزہ رکھیں شام کے وقت درگاہ الٰہی میں توبہ کریں اور ہر روز ہمسایوں میں کھانا بانٹیں پھر مردے کی قبر پر جا کر بہت سا مال و زر خیرات کرنے کے بعد اپنے کام میں مشغول ہوں۔

مسافروں کو پانی پلانا یا کھانا کھلانا ہمیشہ ہی کار ثواب سمجھا گیا ہے۔ یہاں کسی ایسے قبیلے کی رسم کا ذکر ہے (اگر وہ محض خیالی نہ ہو) جو کسی مہمان کے آنے اور کھانا کھلائے بغیر اپنا مردہ دفن نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے ہندوستان کے قبیلوں میں ہی سے کسی قبیلے کی رسم ہو اس لیے کہ سات دن یا اس سے بھی زیادہ مدت تک لاش کے خراب نہ ہونے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی سرد علاقے کا افسانوی ماجرہ ہے۔ مردے کو دفن کیے بغیر کھانا نہ کھانا آج بھی رائج ہے۔ اس ضمن میں سات روز کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمانوں میں تیجے اور دسویں کا دستور ہے۔ لیکن سات دن تک کھانا نہ کھانے یا ایسی ہی کوئی رسم موجود نہیں مردے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے غریبوں کو کھانا تقسیم کرنا اور مصلی کھلانے کا رواج آج بھی ہے۔

روزہ رکھنے کا رواج مسلمانوں میں ہمیشہ سے ہے نفلی روزے بھی رکھے جاتے ہیں ہندوؤں میں بھی کچھ خاص خاص روزے رکھے جاتے ہیں اور اسلام میں ایک ماہ کے روزے بہر حال فرض ہیں۔ یہاں روزوں کی مدت چھ مہینے تک بڑھا دی گئی ہے جو ہو سکتا ہے مردے کی چھ ماہی کی مدت ہو۔ ممکن ہے یہ محض افسانوی فکر فرمائی کا نتیجہ ہو لیکن اس میں مروج تہذیبی روایتوں کا عکس ضرور ملتا ہے۔

مردے کو تہہ خانے میں اتار کر فرش پر اس کو ڈال دیا طرح طرح کے کھانے رکھے۔ خوشبو کی بتیاں جلائیں۔ سات بار اس کے گرد پھیرے قدم بوس ہو کر باہر آئے اور پھر دستر خوان پر بیٹھے۔ حاتم سے کہا اے مسافر پہلے کھانے میں تو ہاتھ ڈال اور پیٹ بھر کر کھا تاکہ ہم بھی روزہ کھولیں۔" بچے ہوئے کھانے کو اپنے اپنے گھر بھجوا دیا عورتوں نے کھایا وہ نہا دھو کر پاک اور پاکیزہ کپڑے پہن کر گھر چلے حاتم سے کہا اگر تو چاہے تو چند روز ہمارے یہاں مہمان رہ۔ حاتم کو شہر کے ایک صاف ستھرے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ کھانے پینے کے لوازم بہت خوبصورت لونڈیوں سمیت بھجوا دیئے وہ عورتیں آرزو مند تھیں اگر اس مسافر کا دل چاہے تو ہم میں سے کسی سے بشوق ملے لیکن حاتم نے کسی سے خواہش نہ کی سات دن گزر گئے تو عورتوں نے اپنے سرداروں سے حاتم کی نیک ذاتی اور نیک طینتی بیان کی شہر کے حاکم نے اسے بلوایا۔ اور کہا اگر اس شہر میں بود و باش رکھے تو مہربانی ہے اور میں بھی اپنی بیٹی تیری خدمت میں دوں۔" حاتم نے مجبوری اپنی بتائی اور کہا میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ساتھ تکلیف اٹھائے اور پوچھنے پر کام بنا دیا۔ حاتم نے بتایا میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دکن کی طرف طلسمات ہے اور اس کے بائیں طرف ایک عالی شان شہر آباد ہے وہاں آج تک کسی نے مردہ نہیں دیکھا۔ نہ قبر دیکھی اور نہ کوئی کسی کے واسطے روتا ہے۔

اس میں سرزمین دکن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہاں کے طلسمات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ مگر یہ طلسمات کیا ہے اس کی کوئی ذکر نہیں دکن کے عظیم الشان مندر رولا، اور ایلورا اجنتا کی خانقاہوں میں وہ نقاش تصویر کشی اور صورت گری کے نمونے ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں یا پھر یہاں کے شاہی محلات کا ذکر تاریخوں میں پڑھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی طلسم سے واقف نہیں۔ لیکن سراندیپ یا سنگلا دیپ سے متعلق کوئی نہ کوئی کہانی ہماری داستانوں میں ضرور آتی ہے۔ مُردوں پر نہ رونا ممکن ہے کسی قبیلے میں ایسا بھی ہو لیکن مُردوں کو بنا سنوار کر لے جانا اور باجے گاجے کے ساتھ ماتمی جلوس لے کر چلنا اب بھی رائج ہے۔ دکن میں بھی اور شمال میں بھی۔

شہر کے اندر گیا وہاں کے رہنے والوں سے پوچھا انہوں نے بتایا کہ وہ ندا کا رستہ

یہاں سے بہت دور ہے۔ جانا ہی چاہتا ہے تو آج رات میں وہ دال روٹی قبول کر۔ ایک شخص بہت دنوں سے بیمار تھا۔ اس کے وارثوں نے اسے ذبح کیا اور آپس میں گوشت بانٹ لیا۔ وہ شخص جس نے حاتم کی مہمانداری کی تھی اپنے حصّہ کا گوشت پکا کر دو چار روٹیاں اور ایک کوزہ پانی شام کو لے گیا۔ حاتم نے کہا یہ کس جانور کا گوشت ہے۔ میں نے حلال چرند پرند کا گوشت کھایا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ تو آدمی کا گوشت ہے۔ حاتم بولا تم آدم خور ہو تم سے ڈرنا چاہیے۔ کسی مسافر کو تم نے مارا ہے شاید۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا یہی قاعدہ ہے۔ اس شخص نے بتایا کہ ہم مسافروں کو نہیں مارتے۔ ہمارے ملک کی یہ رسم ہے کہ جو کوئی بیمار پڑتا ہے اس کے قبیلے کے لوگ اس کو ذبح کرکے آپس میں گوشت تقسیم کرلیتے ہیں۔ چنانچہ اس سبب سے ہمارے شہر میں اپنی موت سے کوئی نہیں مرتا اور نہ ہی کوئی قبر بنتی۔ حاتم نے کہا یہ فعل کسی قوم میں درست نہیں۔ اس سے تم سب کے سب گنہگار رہو۔ اور ہزاروں خون تمہاری گردنوں پر ہیں تمہارا منہ دیکھنا روا نہیں۔ یہ کہہ کر جنگل کی راہ لی۔

آگے چل کر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ کسی ایسے قبیلے کی رسم ہے جو انسان کا گوشت کھاتا ہے اور اپنے مردوں کو دفن کرنے یا جلانے کے بجائے ان کا گوشت باہمی طور پر تقسیم کرلیتے ہیں۔ ممکن ہے آسام کی پہاڑیوں میں یا پھر انڈمن نیکوبار یا اس کے بھی جنوب مشرق میں ایسا کوئی قبیلہ آباد ہو۔ بقول تنویر احمد علوی۔

"مشرقی مجمع الجزائر میں ایسے قبائل پائے جاتے ہیں جو مردم خور ہیں اور اپنے مردوں کا گوشت کھا جاتے ہیں۔"

حاتم کا ردعمل ایک مذہبی آدمی کا ردعمل ہے۔ جو اس طرح کی قبائلی رسموں کو پسند نہیں کرتا اور ان پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

دور جاکر دیکھا ایک شیر مارے بھوک کے زمین پر تڑپ رہا ہے۔ یہ حال معلوم کرکے اس نے ایک ہرن کا شکار کیا اور شیر کے آگے ڈال دیا اور پھر جنگل کی راہ لی۔ کچھ کباب کھا کر اس نے بھی پانی پیا جب جنگل میں کہیں میوہ۔ دانہ ملتا شکار کرتا اور گوشت کھاتا چند روز

بعد ایک آبادی کے قریب پہنچا دیکھا ایک میدان میں کچھ لوگ آگ جلارہے ہیں اور اس کے گرد کھڑے ہیں حاتم نے پوچھا یہ کونسا ملک ہے۔ اور تم نے آگ کیوں جلا رکھی ہے۔ انھوں نے کہا۔" تو اپنی راہ لے تجھے یہ دریافت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ ہماری قوم میں ایک شخص مرگیا ہے اس کی جورو اس کے ساتھ جلتی ہے۔" حاتم نے کہا تم مُردے کو زمین میں کیوں نہیں گاڑتے اور اس عورت کو جیتے جی کیوں جلاتے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ملک ہندوستان ہے۔ اور یہاں یہ رسم ہے کہ بیوی اپنی مرضی سے جلتی ہے۔ حاتم نے کہا یہ رسم نہایت ہی بُری ہے۔

ایک موقع پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ شیر بھوک سے تڑپ رہا ہے یہاں یا تو غیر معمولی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ یا پھر شیر بہت ضعیف ہے اس کا اظہار ہونا چاہئے تھا بہر حال قصّہ نگار تہذیبی طور پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کہ اہل خیر اور حاتم جیسا کلیجہ رکھنے والا شخص دشمنوں کی بھی ان کی مشکل وقت میں مدد کرتا ہے۔ اس میں تضاد کا یہ پہلو بہرحال ڈھونڈا جا سکتا ہے کہ اگر وہاں ہرن تھے تو وہ خود شکار کیوں نہیں کرتا اور حاتم پر حملہ آور کیوں نہیں ہوتا۔

اس کے بعد کے واقعات میں ستی کا واقعہ ہے۔ اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ملک ہندوستان ہے اور ہندوستان کے علاوہ کہیں ستی کی رسم نہیں پائی جاتی تھی آقا یا شوہر کے لیے اس کی موت کے بعد مرجانا قربان ہوجانا یا ستی کی دوسری صورت میں زندہ دفن ہوجانا بہت سی دنیا کی قوموں میں رائج رہا ہے۔

آگے کے واقعات میں ستی کی ایک دوسری صورت سامنے آئی ہے جہاں مرد کو مارنے کی کوشش ہے۔

کسی گاؤں میں جاکر پینے کا پانی مانگا ایک کٹورا دودھ کا اور ایک مٹھے کا لاکر رکھ دیا اگر طبیعت دودھ کی طرف رغبت کرے تو دودھ پی اور چھاچھ چاہتے ہو تو چھاچھ پی۔ حاتم نے پہلے چھاچھ پی پھر دودھ کا پیالہ اس کی طرف دیتے ہوئے اس شخص نے کہا۔ " باس متی چاول پکے ہیں اگر تو کہے تو وہ بھی لے آؤں۔ اسے کھا کر خوب مزا ملے گا۔" حاتم نے

وہ کھائے اور رات وہیں بسر کی۔ صبح ہوئی ہی تھی کہ گھر کی عورت نے آکر کہا رسوئی تیار ہے کچھ۔ اس زنانے سے کھاؤ اور دو چار دن یہاں رہ کر ماندگی دور کرو۔ اور حاتم کچھ دن قیام پر رضا مند ہوگیا۔ اور اس کے آرام کے لیے ہر طرح کا سامان رکھ دیا گیا۔ حاتم نے کھانے اور ملک کی بہت تعریف کی۔ اور کہا۔ لیکن یہ رسم جیتی عورت کو مردہ خاوند کے ساتھ جلانے کی کیا ہے۔ مردے کا تو جلانا بھی اچھا نہیں۔ میزبان نے کہا۔ زن و شوہر باہم بہت الفت رکھتے ہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے عشق ہوتا ہے۔

اتفاق سے وہاں کا رئیس دو چار دن میں مرگیا۔ اس کی چار بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا ایک لڑکا تھا اس کی ارتھی گئی تو چاروں بیویاں اس کے ساتھ ہولیں۔ قبیلے کے لوگوں نے ان کی خوشامد کی۔ انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ حاتم ان کے پاس گیا اور کہا تم گھر سے نکل کر نامحرموں میں آئی ہو اور ایک مردے کے ساتھ جلنا چاہتی ہو۔ انھوں نے کہا۔ ہم تو مردے ہیں۔ ہم کو ستر پردے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اس مُردے کے ساتھ ہم نے عیش و آرام کیا تھا۔ اب جو وہ مرگیا تو ہم اس سے جدا ہوں اور جیتے رہیں۔ یہ بات محبت اور مروت سے بعید ہے۔ اور پھر ساری عمر آتش فراق میں بھی جلنا پڑے گا۔ اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں شیطان اپنی مکر سے ہمارے دلوں میں ایسا وسوسہ ڈالے کہ جس کے سبب سے ہم اپنے سوامی کو بھول کر کسی غیر کی طرف بدنظر سے دیکھیں۔ حاتم کو خیال آیا کہ وہ آگ کی گرمی سے ڈر کر بھاگ جائیں گی۔ لیکن اس کا گمان غلط ہوا وہ اپنی خوشی سے اس کے ساتھ جل کر راکھ ہوگئیں۔

مسافروں کی خاطر تواضع ہندوستان میں عہد قدیم سے عزیز رکھی جاتی رہی ہے اور مہمانداری ہر ایک شخص اپنا فرض جانتا تھا۔ اس لیے جو کچھ بھی گھر میں اچھے سے اچھا موجود ہوتا مہمان کو پیش کیا جاتا۔ کوئی پانی مانگے تو اسے خالی پانی نہیں دیا جاتا تھا بلکہ دودھ یا چھاچھ دی جاتی تھی۔ یا پانی سے پہلے کچھ ناشتہ دیا جاتا تھا۔

ہندو اقوام میں عام طور سے ایک ہی بیوی کا رواج ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بھی موجود ہیں اور ہم اکثر قصے کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ جب کسی راجہ کی ایک سے زیادہ بیویاں

ہوتی ہیں تو ان کی تعداد چار ہی ہوتی ہے۔ یہاں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ سامنے آتا ہے وہ ستی کی رسم سے متعلق ہے جس میں کسی مرنے والے راجہ کی رانیاں اپنے سوامی کے ساتھ چِتا میں جل جانا چاہتی تھیں۔ یا جوہر کر لیتی تھیں۔ یہ رسم ہندوؤں میں عہد قدیم میں پائی جاتی تھی اور اس کو عورت کی طرف سے اپنے شوہر کے ساتھ وفاداری خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ حاتم کے ذہن میں اس کا خیال آنا کہ تم بے پردہ کیوں ہوگئیں ایک ساتھ دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ ہے کہ حاتم کا کردار ایک مسلمان کا کردار ہے کہ وہ بے پردگی اور ستر کو اہمیت دیتا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی بڑے طبقے میں پردے کا رواج تھا۔ ہمارے زمانے تک یہ رواج رہا ہے۔

گاؤں گاؤں پھرتا ہوا اتر کی جانب گیا۔ ایک شہر دکھائی دیا وہ قریب پہنچا تو بہت سے لوگوں کو جمع دیکھا تو ان سے پوچھا۔ شور و غل کیوں کرتے ہو۔ کسی نے کہا۔ یہاں کے رئیس کی بیٹی مرگئی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے ساتھ جیتا اس کے خاوند کو بھی ماردیں۔

باغ و بہار میں بھی ایک درویش کی داستان میں ایک شہر کی ایسی ہی رسم بیان کی گئی ہے۔ اس میں مردے کے ساتھ اس کے زندہ رفیق حیات یا رفیقۂ حیات کو بھی ایک حویلی میں کچھ دنوں کا کھانے پینے کا سامان دے کر بند کر دیا جاتا تھا۔ جہاں اس کا بھی اپنے رفیق حیات یا رفیقۂ حیات کی مانند آخر خاتمہ ہو جاتا تھا۔

عورتوں کا مردوں کے ساتھ ستی ہونے کی رسم تو یقینی ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی تھیں مگر عورت کے ساتھ مرد کا گاڑنے یا جلانے سے متعلق بظاہر ہندوستان میں کوئی رسم رائج نہیں ہوسکتی ہے۔ کہ ہندوستان کے کسی قبیلے میں ایسا قول و قرار کیا جاتا ہو۔ مگر اس کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ مرد کا قول سے پھر جانا مردوں کی بے وفائی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ عورتیں تو جوہر کی رسم لاکھ منع کرنے پر بھی ہنستے ہنستے ادا کرتی تھیں وہ اس لیے کہ اس کا شوہر اس کے لیے مجازی خدا کا درجہ رکھتا ہے اور وہ اپنے سوامی کے بغیر زندہ رہنا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا۔ حاتم نے کہا۔ اپنے رئیس کے پاس مجھے لے چلو۔ سردار کے پاس لے جانے پر حاتم نے کہا۔ تمہارے یہاں کیا رسم ہے کہ جیتے کو مردے کے ساتھ گاڑتے ہیں۔ وہ راضی نہیں تو زبردستی کرتے ہو اور خدا سے نہیں ڈرتے۔ سردار نے بتایا کہ یہ جوان بھی تیری طرح اس شہر میں مسافر وارد ہوا تھا۔ چند روز یہاں رہنے کے بعد میری بیٹی کو چاہنے لگا۔ اور ہم لوگوں میں مل گیا۔ اس شہر کے دستور کے مطابق لڑکی یا لڑکے کو جوانی پر آ جانے کے بعد اس وقت تک نہیں بیاہتے۔ جب تک وہ آپس میں عشق و محبت میں حد سے گزر نہیں جاتے اور باہم خوشی سے اقرار نہیں کر لیتے کہ جو کوئی ہم میں سے مر جائے گا تو اس کے ساتھ دوسرا جیتے جی گڑ جائے گا۔" اس نے حاکم شہر کے سامنے اس بات کا اقرار کیا تھا۔ اب اپنے اقرار پر ثابت قدم نہیں رہا۔ کچھ ہم زبردستی نہیں کر رہے تو ہی پوچھ یہ اپنے قول سے کیوں پھرا۔

جب حاتم نے دیکھا کہ دونوں اپنی اپنی باتوں پر قائم ہیں تو اس نے اپنے شہر کی بولی میں کہا مجھے اس قبر سے کسی نہ کسی طرح نکال لوں گا۔ لیکن اب ان کے سامنے اس میں گر جا۔ اس نے کہا تیرے نکالنے تک جیتا کیوں کر رہوں گا۔ حاتم نے انہیں بتایا کہ یہ اپنی بولی میں کہتا ہے کہ قبر ہمارے شہر کے دستور کے مطابق حجرے کی شکل میں بنائیں۔ اس کی حاتم سے رضامندی حاصل کر لی گئی اور حجرے کی مانند قبر بنائی اور زندہ اور مردہ دونوں کو اس میں گاڑ دیا۔ اور پتھر سے منہ بند کرنے کے بعد حاتم کے ساتھ شہر میں چلے گئے۔

دستور کے مطابق مردے کے وارث تین دن تک قبر پر بیدار رہتے تھے۔ نہ گھر آتے تھے نہ عورت کا منہ دیکھتے تھے۔ چوتھی رات قبر پر گیا۔ وہ شخص حاتم کو برا بھلا کہہ کر سو رہا تھا۔ جب حاتم تابدان پر منہ رکھ کر پکارا تو جواب ملا۔ دوسری بار بھی خاموش رہی۔ حاتم کو نہایت افسوس ہوا اور وہ بے اختیار رو دیا۔ تیسری بار زور سے پکارا تو وہ شخص اٹھ کر تابدان کے پاس آیا اور پوچھا کون ہے جو پکارتا ہے۔ حاتم نے سجدۂ شکر ادا کیا اور خنجر سے کھود کر اسے نکالا۔ کھانا کھلا کر اس سے کہا۔ جدھر چاہے ادھر چلا جا۔ اپنے کیسے سے چند درم اس کو دیئے۔ اسے رخصت کر کے خود واپس آ کر سو رہا۔

اور صبح کو لوگوں سے کہا۔" مجھے کوہ ندا کی خبر کو جانا ہے رخصت کرو۔" انہوں نے بتایا کہ کوہ ندا یہاں سے بہت نزدیک ہے۔۔۔ تھوڑی دور پر دوراہہ ملے گا۔ اس کے داہنے طرف کی راہ اختیار کرنا۔" آخر گیارھویں دن دوراہے پر پہنچا۔ اور داہنے کے بجائے بائیں جانب ہو چلا۔

کئی دن کے بعد ایک قلعہ دکھائی دیا اسے سنسان پایا۔ اس کے اندر بڑی بڑی عمارتیں آئینہ دار چمک رہی تھیں۔ آدمی کا کہیں نشان نہ تھا۔ چوپڑ کا بازار نہایت صاف ستھرا اور دکانوں میں جو چیزیں چاہئیں موجود۔ جیسے کوئی دیو شہر میں آیا ہو۔ اور ڈر سے چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔ قلعے پر گیا وہاں بادشاہ اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ باہر کے دروازے پر دو چار نوکر بھی بیٹھے تھے۔ حاتم کو دیکھ کر ایک بولا۔" مدت کے بعد ایک مسافر اس شہر میں آیا۔" دوسرے نے کہا۔" اس کو پکارو کہ ادھر آئے۔" حاتم ایک دریچے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور بولا۔" اے جوان تو کہاں سے آیا اور کہاں جائے گا۔" حاتم نے جواب دیا۔" یمن کا رہنے والا ہوں شاہ آباد سے آیا ہوں اور کوہ ندا کا قصد رکھتا ہوں۔" بادشاہ نے کہا۔" اے جوان تو راہ بھول گیا۔ جو بائیں طرف کے راستے سے آیا شاید تیری موت تجھے یہاں لے آئی ہے۔

حاتم بولا۔" اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو میں جان و دل سے راضی ہوں۔ لیکن تو قلعہ بند کیوں ہوا ہے۔ تو اپنا ماجرا کہہ۔" بادشاہ نے جواب دیا میں یہاں کا بادشاہ ہوں اور چند دنوں سے بلائے عظیم آئی ہے۔ اس لیے سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اسے ماروں ناچار ہو کر گوشہ گیری اختیار کی۔

بلاؤں کا آنا اور ان پر کسی طرح سے قابو نہ پا سکنا اس قصے اور دوسرے قصوں کی ایک جانی پہچانی روایت ہے۔ جس پر ہم اس سے پیشتر بھی گفتگو کر چکے ہیں۔

حاتم نے کہا۔" اے بادشاہ تجھے مبارک ہو میں نے اس کا جنگل میں خاتمہ کر دیا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں بائیں طرف آ نکلا۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ یہ ہماری تہذیب اور معاشرت کا ایک بڑا رکن سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی مانا جاتا ہے کہ جب خدا کو کسی منعم کی مصیبت

دور کرنا ہوتی ہے تو کسی کو کسی وجہ سے ممنوعہ راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اس مقام کی مصیبت اور پریشانی کو ختم کردیتے ہیں۔ یعنی خدا کے ہر کام میں بہتری جتانے والا معاشرہ ہے۔)

ایک دن سو دو سو آدمیوں میں حاتم بیٹھا تھا کہ کوہ ندا کا ذکر آگیا اور لوگوں سے پوچھا کوہ ندا کون سا ہے۔" انھوں نے بیان کیا۔ "کوہ ندا کے قلعے کی ہر ایک دیوار آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ اور اس سے خود بخود آواز آتی ہے۔ انہیں باتوں میں ایک آواز اس پہاڑ کی طرف سے آئی "یا اخی یا اخی" اور ایک خوش رو جوان بے اختیار اس طرف دوڑ پڑا لوگوں نے اس کے وارثوں کو اطلاع دی کہ فلانے شخص کی کوہ ندا سے طلب ہوئی ہے سب دوڑتے آئے دیکھا کہ اس کا منہ سرخ ہو رہا ہے لوگ اس کے گرد ہیں مگر وہ بے اختیار کوہ ندا کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر حاتم نے پوچھا یہ ماجرا کیا ہے۔ انھوں نے کہا۔" اس کی کوہ ندا سے طلب ہوئی ہے" حاتم نے اسے پکڑ لیا۔ اور کہا کہ "اے بھائی یہ مروّت سے بعید ہے جو تو نہیں بتاتا۔ برائے خدا بہ دے کہ کس کے بلانے پر ہم سب کو چھوڑ جاتا ہے۔" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور جھٹک کر بھاگا۔ اور پہاڑ کے نیچے جا پہنچا۔ حاتم بھی اس کے پیچھے گیا۔ پہاڑ یکایک آنکھوں سے غائب ہوگیا۔ اور رنگین پتھروں کے سوا کچھ بھی نہ سوجھا۔ بے بس ہوکر شہر میں واپس آگیا۔ لوگوں نے رونے دھونے کے بجائے بہت سا کھانا بانٹا۔ خوشی کی اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

چھ مہینے گزر گئے۔ اس مدت میں پندرہ آدمی گئے۔ جو نہ پھرے۔ ایک شخص حاتم نامی رہتا تھا۔ دونوں حاتم دن رات ایک ہی جگہ رہنے لگے۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے کہ کوہ ندا سے آواز آئی وہ بیچارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ عزیزوں کو خبر ہوئی تو سب آکر جمع ہوئے۔ حاتم نے طے کر لیا کہ میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

جیسے ہی قلعے کے نزدیک گئے ایک کھڑکی دکھائی دی۔ دونوں لپٹے لپٹائے اس کے اندر چلے گئے لوگوں نے واپس آکر ماتم شہر سے بنایا۔ وہ بہت بگڑا۔

کھڑکی کے اندر محلہ خموشاں تھا۔ ایک وسیع میدان میں بیچے ایک سبزہ زار دکھائی

دیا۔ تھوڑی سی زمین اس میں خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پانوں رکھنے لگا۔ پانوں سخت ہوگئے حاتم یہ سوچ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا کہ یہ مرگیا۔ وہ زمین تڑخ جانے پر اس میں سما گیا۔ اور خالی زمین سبز ہوگئی یہ دیکھ کر حاتم نے کہا۔" دنیا فانی ہے سب کو مرنا ہے واقعی اب کوہ ندا کی حقیقت کما حقہٗ معلوم ہوگئی۔ واپس جانے کے لیے کھڑکی اور قلعے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ سات روز تک حیران و سرگرداں رہا ہے آب و دانہ بغیر جینے سے مایوس ہوگیا اور سوچا موت یہاں لائی ہے۔

حاتم کنارے کنارے چلنے لگا۔ سات دن اٹھتے بیٹھتے چلنے میں گزرے تو دور سے دریا کی موجوں کی مانند کوئی چیز سفید سفید دکھائی دینے لگی۔ قریب گیا تو دیکھا ایک دریا لہریں مار رہا ہے۔ حاتم نے پانی پینے کو بایاں ہاتھ ڈالا پانی تو نہ نکلا لیکن ہاتھ چاندی کا ہوگیا اب اس بوجھ سے چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تھا۔

کئی دن بعد کشتی کنارے پر لگی اترا اور آگے بڑھا ہر وقت اپنا ہاتھ دیکھا کرتا تھا۔ چار دن کے بعد ایک پہاڑ سامنے دکھائی دیا وہ اس طرف کو ہولیا۔ تین دن کا سفر رہ گیا تھا کہ پتھر سفید زمرد و سُرخ و سبز نہایت خوش رنگ نظر آنے لگے۔ اور آگے گیا تو الماس و زمرد و لعل جا بجا پڑے تھے۔ کئی جواہر اٹھا کر جیب میں ڈال لیے تھوڑی دور چلا اس سے بھی بیش قیمت جواہر تھے۔ اُس کو پھینک دیا۔ اِس کو جیب و دامن میں لے لیا۔ اور اس کے بوجھ سے تھک کر بیٹھ گیا۔ اور کئی لعل و زمرد و الماس بڑے بڑے رکھ لیے باقی وہیں ڈال دیئے۔ لالچ میں پڑ گیا جس سے کم قیمتی جواہرات لے لیے۔ اس سے زیادہ قیمت کے ملنے پر انھیں چھوڑ دیا وہ لے لیے جب بوجھ سے چلنا مشکل ہوا اور منزل کھوتی ہوئی دکھائی دی تو بیشتر سے فلاحی حاصل کی یعنی لالچ نے بھی ساتھ نہ چھوڑا یعنی نیک سے نیک انسان بھی اس بد بلا سے مشکل ہی سے نجات پاتا ہے۔ وہاں سے چل کر حاتم ایک چشمے پر پہنچا کنارے بیٹھ کر ہاتھ دھوئے۔ اب بائیں ہاتھ پہلے ہی ہاتھ میں آگیا۔ اگرچہ ناخن چاندی کے رہے۔

داستان کو اہمیت دینے کے لیے اس میں طلسمی واقعات کا بھی اضافہ کیا جاتا تھا

لعل وجواہر بیش قیمت اور نادر اشیاء اور اشخاص کے لئے آج تک استعمال ہوتا ہے یہ بھی خیال پایا جاتا تھا کہ بعض ایسی وادیاں ہیں جس میں سنگ ریزوں کی طرح لعل وجواہر بکھرے رہتے ہیں۔ ہم الف لیلہ کے قصوں میں بھی، سندھ آباد جہازی کے قصوں میں بھی اس طرح کی وادیوں کی سیر کرتے ہیں اور یہ بھی کہ دینے والا کبھی کبھی اس طرح دیتا ہے کہ لینے والوں کو کوتاہیِ دامن کا شکوہ ہو جاتا ہے۔

رات چشمے پر گزارنے کے لیے رہا۔ دو شخص چشمے سے نکلے سر تو آدمی کے تھے پاؤں ہاتھی کے سے اور ناخن شیر کے سے۔ نہایت سیاہ رنگ حاتم اٹھ کھڑا ہوا۔ یکایک تیر مارا ایک نے پکڑ لیا۔ چاہتا تھا کہ دوسرا تیر مارے۔ انھوں نے فریاد کی کہ تو بھی اپنی جان کے ڈرسے ہمیں مارتا ہے۔ ہم بھی خدا کے بندے ہیں کچھ ایذا دینے نہیں آئے۔ حاتم نے تیر و کمان رکھ دیئے اور سوچنے لگا کہ ان کو مجھ سے کیا کام ہے۔ نزدیک آئے تو بولے: اے حاتم تجھے شرم نہ آئی جو جواہر کی طمع کی۔ تجھے ایک اور خلقت کے واسطے اللہ نے رکھا ہے۔ حاتم نے کہا۔ کیا آدمی اس جواہر کے لائق نہیں۔ جو اسے اپنے تصرف میں لائے۔ دیووں نے کہا۔ اگر جو سلامت اپنے گھر کو جانا چاہتا ہے تو اس جواہر سے ہاتھ اٹھا۔ یہ سنتے ہی حاتم نے سب جواہر پھینک دیئے۔

معاشرہ ایمانداری کا اپنا ایک الگ معیار رکھتا تھا اور وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ کسی کا مال بے کہے اٹھانا یا اس کی طرف نظر رکھنا بھی گناہ سے کم نہیں۔ جب تک کہ خدا نے اس کے لیے وہ چیز نہ بھیجی ہو۔ لیکن ایک لعل ایک الماس ایک زمرّد اس کو دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "تجھ کو یہی بہت ہے لے۔" حاتم نے وہ لے لیے اور ان سے راہ معلوم کی۔ انہوں نے کہا۔ اس سے آگے ایک جواہر کا دریا ملے گا۔ اس کے بعد دریائے آتش۔ اگر ان سے گزر گیا تو اپنے ملک میں جا پہنچے گا۔

تھوڑی دور جانے پر دریائے جواہر پایا اسے صحیح و سالم پار کیا چند روز کے بعد ایک اور دریا آیا پیاسا تھا بہت خوش ہوا لیکن نزدیک پہنچا تو موتی سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے پائے۔ ہر ایک انڈے کے برابر۔ لالچ سے بمشکل حاتم نے اپنے آپ کو باز رکھا۔ ان دونوں دیووں کی

نصیحت یاد آئی۔ پانی دودھ اور شہد کی مانند تھا خوب پیا اور پیاس بجھائی اور آگے بڑھا تو دور ایک روشنی نظر آئی۔ ایک مہینے کے بعد قریب پہنچا تو سونے کا پہاڑ چمکتا دیکھا اس پر چڑھا ہر ایک درخت سونے کا تھا۔ تین دن کے بعد ایک وسیع میدان آیا اس کی زمین سنہری تھی۔ آگے گیا تو سونے کا محل دیکھا۔ قریب گیا دروازہ کھلا پایا اندر پہنچا۔ باغ پھول اور پھل سے بھرا پایا۔ تھوڑا سا میوہ توڑ کر کھایا ایک حوض نظر آیا اس کے کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ یہ کس کا محل ہے اس سوچ میں تھا کہ کئی پریاں دکھائی دیں حاتم کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ حاتم کو ملکہ زریں پوش یاد آئی ان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ محل پری، نوش لب کا ہے۔ اتنے میں وہ آ پہنچی۔ حاتم اس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ وہ سرہانے کھڑی کہنے لگی "جلد آ کر اس کے منہ پر گلاب چھڑکو۔

سونا چاندی اور ہیرے جواہرات زندگی میں بڑی دولت کی علامت تصور کئے جاتے رہے ہیں اور آج بھی سوچ کا یہی انداز باقی ہے۔ ہمارے محاورات میں بھی یہ چیز موجود ہے۔ کیا سونے کا محل کھڑا کرو گے۔ اس نے اپنے بچوں کو سونے کا نوالہ کھلایا۔ سنہری پوشاک خوشیوں اور مسرتوں کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر سونے چاندی اور رؤسا میں ہیرے جواہرات کے زیور اور اشیاء آرائش کا تصور اب بھی ہے۔ یہ سب دولت اور ثروت کی نشاندہی کرنے والے امور ہیں۔ صحرائی قوموں میں پانی اور وہ بھی میٹھا۔ دودھ کی طرح سفید اور شہد کی مانند شیریں بہشت کی نعمتوں میں شمار ہوتا ہے۔ سونے کا درخت اور پہاڑ بھی قدیم روایتوں اور ان کی علامتوں کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔ واقعۂ بہشت میں "شجرِ ممنوع درخت کے لیے ایک قدیم تر روایت کے طور پر ہمارے ذہنوں میں موجود ہے۔

ہوش آنے کے بعد پری نوش ایک مرصّع تخت پر بیٹھی۔ اور حاتم کو ایک کرسی پر بٹھایا۔ پوچھنے پر حاتم نے کل ماجرا سنا دیا اور معلوم کیا: "اس پہاڑی کا کیا نام ہے۔ اس جگہ کا مالک کون ہے۔ جواب پری نوش نے دیا۔ اس پہاڑی کو کوہ زرّین کہتے ہیں۔ مکان شاہ پال بادشاہ کا ہے۔ اس کی ایک بیٹی آسا نام ہے۔ میں اس لڑکی کی ایک خواص ہوں۔ اور

ساتواں دن میری باریابی کا ہے۔ یہ مکان کوہ قاف سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دور سے جو دکھائی دیتا ہے اس کا قلعہ ہے۔ اس سے آگے دریائے آتش ہے۔ گرمی اسی کے باعث ہے لیکن رستہ یہی ہے۔ راہ بتانا ہمارا کام نہیں مگر اتنا ہو سکتا ہے کہ یہ کام وہیں ہو جائے۔ حاتم نے کہا۔ جو تم سے ہو سکے اس میں گریز نہ کرو۔" انھوں نے ایک مہرہ نکال کر حاتم کو دیا اور کہا۔" اگر اس کو اپنے منہ میں رکھے گا تو آگ تجھ پر کارگر نہ ہوگی۔ لیکن دریا کے پار جاتے ہی اس مہرے کو پھینک دینا۔

ہمارے زمانے میں قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا لکھا یہ امیجری جگر کے یہاں بھی موجود ہے

ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے

حاتم کی اس کہانی میں دریائے آتش ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی علامت کا ماخذ ہے مہرہ کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔

حاتم رات وہیں رہا صبح کو منہ میں مہرے کو رکھ کر آگے چلا تین روز کے بعد آگ کے شعلے دکھائی دیئے۔ کچھ دور جا کر حاتم نے آنکھیں کھولیں تو نہ وہ دریائے آتش ہے نہ کشتی ایک سہانا جنگل ہے۔ مہرہ منہ سے نکال کر پھینک دیا۔ تھوڑی مسافت کے بعد معلوم ہوا کہ یمن کی سرحد ہے۔ کسی گاؤں میں گیا اور ایک کھیت پر کھڑا ہو کر کسان سے کہنے لگا یہ کونسا مقام ہے اور کس شہر کا نواح ہے۔" وہ کچھ نہ بولا۔ ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ حاتم کے پھر پوچھنے پر وہ بولا۔" تیری صورت میں اپنے حاتم بادشاہزادے کی سی دیکھتا ہوں۔ پھر حاتم نے اس سے پانی مانگا۔ وہ جلدی سے ایک پیالہ دودھ اور ایک چھاچھ کا لے آیا۔

ہندوستان میں بھی حاتم کو دودھ کا پیالہ پیش کیا ہے اور یمن میں بھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور یمن میں مسافروں کے ساتھ ایک سا برتاؤ کیا جاتا تھا یہاں پر کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہندوستان اور یمن کی تہذیب میں یگانگت پائی جاتی ہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔

حسن بانو سے سب حال کہہ چکنے پر نشان دکھا کر یقین دلانے کے لیے کہے جانے پر

حاتم نے بایاں ہاتھ دکھا دیا جس کے ناخن اب تک چاندی کے تھے۔ دوسرا نشان چار دانت سونے کے اور وہ تینوں قسم کے جواہر بھی دکھا دیئے۔

یہ آفات (سونے چاندی کے دریا اور آگ کا دریا یہ پہاڑ۔ اور جنگل میں آگھیرنے والی مصیبتیں) علاقائی آفات ہیں۔ زندگی کی آفات کی صرف اس فرق کے ساتھ کہ ان میں بہت زیادہ غلو سے کام لیا گیا ہے۔ دوسرے سوالوں کے مقابلے میں اس سوال یعنی پانچواں سوال کا واپسی کا راستہ نہایت کٹھن اور صبر آزما ہے اس کے علاوہ اگرچہ کوہ ندا کا پتہ چل جاتا ہے اور خبر بھی اس کی راستے کے نشانات کے ساتھ لادی جاتی ہے مگر اس کے باوجود یہ پراسرار ہی رہتا ہے جیسے یہ خدائی معاملہ سمجھ لینے پر اکتفا کر لیا گیا ہو۔ جیسے اس داستان میں مختلف لوگوں کی موت مختلف آفات کے ذریعہ ہوتی ہے اور سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ بلائے موت ہے جس کا آنا قدرتی بات ہے۔

چھٹا سوال

"وہ موتی جو مرغابی کے انڈے کے برابر ہے اور بالفعل موجود ہے
اس کی جوڑی کا موتی پیدا کرے"۔

شاہ آباد سے پانچ چھ کوس چل کر ایک پتھر کی سل پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا یا خدا ایسا موتی کس دریا میں سے حاصل کیا جا سکے گا" کہ ہفت رنگی طوطے کا ایک جوڑا وہاں ایک درخت پر آ بیٹھا۔ اس کے بسیرے کا مقام دریائے قومان کے کنارے تھا۔

نر، مادہ کے حاتم سے متعلق پوچھنے پر کل کیفیت کہنے کے بعد بولا۔ تو کہے تو میں اس کو راہ بتاؤں؛ مادہ بولی" اس سے بہتر کیا ہے کہ حیوان کا احسان انسان پر ہو۔" نر نے بیان کیا۔ اگلے زمانے میں بہتے ہیں کتنے پرندے تیس برس کے بعد دریائے قوبان کے کنارے انڈے دیتے تھے۔ ایک شمس شاد کے ہاتھ آ گیا تھا ہر چند کہ وہ آگے سے مال و جواہر بہت سار کھتا تھا بلکہ اس نے ایک شہر بھی بڑا سا بسایا تھا اب وہ ویران پڑا ہے۔ اتفاقاً اس کا خزانہ حسن بانو کے ہاتھ آیا ہے۔ وہ انڈا بھی اس میں تھا جو اس نے پایا القصہ جب جہاد قرمانی مر گیا اور اس کا ملک کسی اور نے لے لیا اس کی جورو حاملہ وہ موتی لے کر بھاگی۔ اور ایک جنگل میں جا پڑی۔ یہی دن تھا کہ دریائے قرمان کے کنارے جا نکلی۔ قضارا اس وقت مسعود سوداگر بھی کشتی پر بیٹھا ہوا وہاں نکلا اس عورت اور کشتی کو دیکھ کر غل مچایا " مجھے کس کو بھی ناؤ پر چڑھاؤ۔ سوداگر نے ناؤ کنارے سے

لگا اس کو بٹھا کر حقیقت پوچھی۔ مسعود سوداگر نے اس کو اپنی بیٹی کہا اور شہر میں لے آیا۔ چند روز بعد اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا برزخ سلسکو نام رکھا گیا۔ جب وہ ہوشیار ہوا مسعود سوداگر مر گیا۔ اس کی سرداری اس لڑکے کو ملی۔ وہ ایک مدت تک اس کے مال و دولت سے لاکھوں سپاہی نوکر رکھا گیا۔ کئی ہزار گاؤں اپنے قبضے میں لایا۔ یکایک وہاں کا بادشاہ مر گیا۔ جب وہ مر گیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہوئے تب انہوں نے کوہ قاف کے تمام نواحی اور دریائے قلزم و قہرمان اور دریائے زرین آتشی بلکہ جو کچھ کوہ قاف سے علاقہ رکھتا تھا سب کا سب دیوؤں، پریوں۔ جادوگروں۔ مردم آزاروں کے رہنے کو دیا۔ اور کہا تم سب اس کو آباد کرو آدمیوں کے شہر کی طرف نہ جاؤ، رفتہ رفتہ وہ موتی ہشام پری سرخ کلان کے ہاتھ لگا تھا۔ اب ماہ یارِ سلمانی جو آدمی اور پری سے پیدا ہوا ہے اس نے لیا ہے۔ بالفعل اس کی استقامت برزخ کے جزیرے میں ہے اس کی ایک لڑکی نہایت حسین ہے اس کی شادی کی شرط ہے جو کوئی اس موتی کی پیدائش کا احوال ظاہر کرے گا اس کے ساتھ لڑکی بیاہی جائے گی۔ ماہ یارِ سلمانی بڑا عالم و فاضل ہے اس وقت کتابیں اس کے ہاتھ لگی ہیں ان کو پڑھ کر اس کی پیدائش کا حال دریافت کر لیا ہے اور ان جانوروں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت سے حکم نہیں جو کہیں انڈے دیں۔ اس لیے ایسے موتی کا پیدا ہونا موقوف ہے۔ مادہ کے کہنے پر یہ وہاں کیسے پہنچے گا نر نے کہا اس کا وہاں پہنچنا بشرطِ حیل خدا کی قدرت سے کچھ دور نہیں ہاں تھوڑے سے پر ہمارے اپنے پاس رکھے کیونکہ جب کوہ قاف پہنچے گا تو ایک عظیم صحرا ایسا ملے گا جس کا اور چھور نہیں اس میں داخل ہو کر لال پر جلا کر پانی میں گھولے اور اپنے تمام بدن پر مل لے۔ پھر بے دھڑک چلا جائے۔ اس کی بُو سے تمام جانور درندے گزندے بھاگ جائیں گے۔ اس کی صورت بھی دیو کی سی ہو جائے گی۔ جب جنگل کو طے کرے برزخ جزیرے میں پہنچے گا سفید پر جلا کر اس کی راکھ پانی میں گھول کر بدن پر ملے پھر دھو کر صاف کر ڈالے خدا کے فضل سے اپنی صورت پر اسی وقت واپس آ جائے گا۔ وہاں کے لوگ اسے پکڑ کر ماہ یارِ سلمانی بادشاہ کے پاس لے جائیں گے۔ چاہئے کہ

یہ اپنا مطلب اس سے کہے۔ اور جو کچھ اس موتی کی پیدائش اور حقیقت کے بارے میں کہا گیا ہے اسے یاد رکھے اور بیان کردے۔ ماہ یارِ سلیمانی اپنے وعدے سے نہیں پھرے گا۔ وہ وعدے کا بہت سچا ہے۔

حضرت سلیمان کے بارے میں بہت سے قصے کہانیوں میں یہ بات آتی ہے کہ جن دیو اور پریاں ان کے تابع تھیں۔ یہاں بھی اس افسانوی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور ایک نئی بات بیان کی گئی ہے۔ کہ حضرت سلیمان نے ان کو کوہ قاف میں بسا دیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ تم یہیں تک پابند اور محدود رہو اور انسانوں کی دل آزاری اور تکلیف انسانی سے پرہیز کرو۔ کوہ قاف کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہاں پریاں رہتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ خوبصورت ہوتے ہیں اور اصلاً یہودی نسل کے ہیں شاید یہیں سے یہ کہانیاں بھی مشہور ہوئیں کہ وہ پریوں اور جناتوں کا ملک ہے۔ میرے ریسرچ کا ئیڈ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مجھے بتایا کہ، قرآن کی بعض آیتوں سے مترشح ہوتا ہوتا ہے کہ جن یہودیوں کو بھی کہا جاتا تھا۔ اور کوہ قاف کے رہنے والے تو یہودی نسل کے ہی تھے۔

یہاں ایک ایسے شخص کا ذکر بھی ہے جس کا نام ماہ یار سلمانی ہے۔ جو کسی پری اور انسان کی اولاد ہے۔ اور جزیرۂ برزخ میں رہتا ہے۔ برزخ جنت اور دوزخ کے درمیان کے طبقہ کو کہتے ہیں۔ ماہ یار سلمانی کیونکہ مختلف طبقوں کی اولاد ہے یعنی اس کی ماں پری ہے اور باپ انسان ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے اسے برزخ ہی میں ہونا چاہیے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قدیم قومیں اس بات کی قائل رہی ہیں کہ مختلف انسانی نسلوں کے علاوہ اور بھی کچھ ایسی مخلوقات ہیں جو انسان کی نظر سے چھپی ہوتی ہیں۔ لیکن دنیا میں موجود ضرور ہیں اور ان کی صفات بھی انسانوں جیسی ہی ہے۔ دیو، پریاں، جن اور۔ اپسرائیں اس نوع کی مخلوق ہیں عربوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ فرشتے خدا اور عرب کے سرداروں کی بیٹیوں کی اولاد ہیں۔

احسان ہر معاشرے میں ایک بڑی اہم قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ انسان

اشرف المخلوقات ہے اس لیے اس پر احسان اس سے کم درجے کی مخلوق فخر سمجھتی ہے اسی لیے بھی کہ وہ اسی طرح کسی قدر اس کے برابر ہو سکے۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ دوستی یا دشمنی۔ مقصد دونوں کا برتری ہی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ شریف الطبع برتری نہیں چاہتے۔ برابری چاہتے ہیں۔ (اس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

شرخ سانپ کا مہرہ بیس سال ہی میں وجود میں آنا بیان کیا جا چکا ہے۔ غالباً ایسی نادر اشیاء کے لیے تیس سال کی مدت وجود میں آنے کے واسطے ضروری ہے ورنہ تیس سال کی ہی شرط کیوں رکھی ہے کہ تیس سال میں ہونے والی اور دوسری چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔

داستانوں میں پرندوں کی زبانی ایسی پیش گوئیاں اکثر و بیشتر بیان ہوئی ہیں اس سے پہلے ایک ایسی ہی مثال بھی گزر چکی ہے۔ گیدڑ نے بھی پہلے سوال میں ایسی ہی آگاہی دی ہے طوطا مینا کی کہانی اس سے بھری ہوئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرہ ایسی باتوں میں یقین رکھتا تھا۔

یہ کہہ کر توتے نے اپنے بازو پھڑپھڑائے کئی پر گرے حاتم نے سب کے سب چن لیے۔

وہاں سے چل کر حاتم دو چار دن کے بعد ایک رات کسی درخت کے نیچے سو گیا۔ اتنے میں بہت سے جانوروں نے فریاد کی "ہے ہے کوئی خدا کے بندوں میں سے ہماری مدد کو نہیں پہنچتا۔" حاتم نے یہ سنا اور ان کی طرف گیا۔ دیکھتا ہے کہ ایک لومڑی ہاتھ پاؤں زمین پر دے دے مارتی ہے اور چلاتی ہے۔ حاتم نے اس سے پوچھا۔ تجھ کو بندگان خدا میں کس نے ستایا ہے جو اس طرح بلبلا رہی ہے؟ اس نے کہا۔ "ایک صیاد میرے نر کو بچوں کو سمیت پکڑ لے گیا ہے میں ان کی جدائی میں روتی ہوں" حاتم نے کہا تو یہیں یہیں چھپ رہ میں بستی میں جا کر صیاد کو ڈھونڈتا ہوں۔"

سورج نکلتے ہی صیاد کے دروازے پر جا پہنچا۔ دستک پر وہ باہر آیا اور پوچھا تجھے مجھ سے کیا کام ہے۔ جو ایسا صبح ہی آیا تو ہمارے گاؤں کا معلوم نہیں ہوتا۔ حاتم نے کہا۔ مجھے ایک ایسا ہی آزار ہے ایک حکیم نے بتایا ہے اگر لومڑی کا تازہ لہو پئے بدن پر لے

تو ابھی اچھا ہوتا ہے۔ اگر تیرے پاس لومڑی کے تین چار بچے ہوں تو مجھے دے۔"

جنگل میں لاکر ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھول کر چھوڑ دیا۔ بچے دوڑ کر اپنی ماں کے پہلو سے جا لگے پھر وہ نر کے قریب آئی تو وہ قریب المرگ پہنچا ہوا تھا۔ رونے لگی۔ اور بولی آج میرے سر کا تاج چلا جاتا ہے۔ تو نے نہیں سنا مردوں کو عورتوں کا ستر کہتے ہیں۔"

نر کی حالت بہت خراب تھی۔ مادہ نے کہا کہ اگر اس کو زندہ انسان کا لہو پینے کو ملے تو یہ دوبارہ سے صحت مند ہو سکتا ہے۔ حاتم اپنی انگلی کاٹ کر لہو اس کے منہ میں ٹپکاتا ہے اور نر دوبارہ طاقت حاصل کرتا ہے۔

لومڑی بچوں سمیت حاتم کے پاؤں میں گر پڑی حاتم انھیں دلاسا دے کر آگے بڑھا۔

ہم قدیم زمانے کے قصے کہانیوں میں یہ دیکھتے ہیں کہ بعض امراض کا علاج رؤسا میں سے کسی عضو کے ذریعے یا پھر خون کے ذریعے کرتے ہیں جس کو بطور دوا استعمال کیا جاتا ہے جب تک غلاموں کی خرید و فروخت کا رواج تھا اس وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کے زندہ اجسام پر عمل جراحی کر کے اس طرح کی چیزیں حاصل کی جاتی تھیں۔ بعد ازاں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور صرف قصے کہانیوں میں اس کا تذکرہ باقی رہ گیا۔ ممکن ہے اس کی طرف انسان کا ذہن اس لیے بھی منتقل ہوا ہو کہ بہت سے قدیم قبائل میں انسان کا گوشت کھانے اور اس کا خون پینے کا رواج رہا تھا۔ جانور تو یہ کام کرتے ہی تھے۔ اور آج بھی کرجاتے ہیں۔ لومڑی کا اپنے نر کے لیے سرتاج کا استعمال ایک عام روایت ہے اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ مرد عورت کے سر کا تاج ہے۔

ایک مدت کے بعد کسی جنگل میں پہنچا۔ سورج اتنا تپا کہ پیاس سے بیتاب ہو گیا۔ ایک چشمہ چاندی سا سفید دور سے نظر آیا ادھر دوڑ کر گیا مگر وہاں سانپ کو کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا دیکھا وہ واپس پھرا کہ سانپ بول اٹھا۔" اے جوان یمنی ــــــ تو یہاں کس کام کے واسطے آیا ہے"۔" اے بندۂ خدا میں شدت سے پیاسا ہوں۔ دور سے تیرے رنگ کی سفیدی پانی کی طرح نظر آتی ہے۔"

اس کے بعد کے قصے میں ایک ایسی حکایت بیان کی گئی ہے جس میں پریزاد کو قول

سے پھر جانے پر اور سزا کے طور پر اس کو سانپ کا قالب اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس سے جون بدلنے کی تصور کو تقویت ملتی ہے۔

قول سے پھرنا اس معاشرے میں گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا تھا اور قول نبھانا معاشرے کی اہم قدروں میں ایک قدر تھی جیسا کہ ہر صالح معاشرے میں ہوتا ہے اور یہ یقین اس معاشرے میں پایا جاتا تھا کہ توبہ وزاری سے قول کے پھیرنے کی سزا سے نجات مل سکتی ہے۔

ہر رات یہ ہی صدا آیا کرتی تھی ایک رات نہایت عجز و زاری سے توبہ کی۔ حکم ہوا کہ تھوڑے دن اور صبر کر میں نے پھر فریاد وزاری کی کہ "اب میری نجات ہو۔ تب یہ ندا آئی ایک دن جوان یمنی تیس برس کا ادھر آئے گا تو اس کے دیکھتے ہی اپنی اصل صورت میں آجائے گا۔ چاہئیے کہ تو اس کی خدمت میں دل سے مصروف رہے وہ تیرے حق میں دعا مانگے گا۔ تو تو اپنی صورت میں رہے گا نہیں تو سانپ کی شکل پر ہو جائے گا۔" حاتم نے پوچھا:" وہ قول کون سا تھا جس سے تو پھر گیا۔ وہ بولا:" ہماری قوم نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اقرار کیا تھا کہ اگر تمہارے بعد ہم اگر آدمیوں کو ایذا دیں یا ان کے ملک کا قصد کریں تو خدا کا قہر ہم سب پر پڑے۔

حاتم نے غسل کر کے پاکیزہ کپڑے پہنے اور پریزاد کے حق میں دل سے دعا کی۔ حاتم قوم یہود سے تھا مگر خدا کو ایک جانتا تھا۔ دن رات اس کے ذکر میں مشغول رہتا تھا۔ مرنے کے وقت اس نے اپنے اقربا سے کہا تھا تھوڑے دن بعد پیغمبر آخرالزماں صلعم پیدا ہوں گے۔ وہ لوگوں سے بیعت چاہیں گے تم میرا سلام ان سے کہنا کہ وہ میرے حق میں دعا کریں اور لوگوں کو یہ معلوم کرنے پر کہ اس وقت تک ہم زندہ رہیں گے تو تیرا اسلام پہنچائیں گے یا ہماری تمہاری اولاد میں کوئی رہے گا جو کہے گا۔ حاتم نے کہا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی میری اولاد میں سے ایمان لائے گا۔ اور میرا سلام آداب سے پہنچائے گا۔ جب حضور کا زمانہ آیا حاتم کی اولاد سے ایک لڑکی بنی طے کے ساتھ بندگی میں آئی تھی۔ اس نے حضرت سے سب گناہ معاف کرا دیئے۔ اور انہوں نے آزاد کروا دیا۔ کیونکہ حاتم سخی تھا اور حاتم کی وصیت یاد آنے پر حضور عالی میں پہنچنے کی درخواست کی اس نے آداب کے ساتھ حاتم کو

سلام عرض کیا اور حاتم کے حق میں دعا کرنے کے لیے عرض کی وہ خود مسلمان ہوگئی اور اس کے ساتھ قبیلۂ طے کے لوگ بھی مسلمان ہوگئے۔

روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ حاتم حضرت رسول اللہ کی ولادت سے آٹھ سال بعد ۔۔ میں پیدا ہوا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو حاتم کو یہ بشارت ضرور ہوئی ہوگی کیونکہ اس نے خدا کی راہ میں عمر تمام کی تھی۔ اور یادِ الٰہی میں بیشتر مصروف رہتا تھا اس کی نوید حاتم کو کیوں کر نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ حاتم کے متعلق اس پیراگراف میں آنے والی باتیں فارسی قصوں میں بھی موجود ہیں۔ پیغمبروں کے متعلق پیش گوئیاں مختلف وقتوں میں کی گئی ہیں اور پیغمبروں کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے انہیں دھرایا جاتا رہا ہے۔

حاتم کی پریزاد کے حق میں دعا بھی اس واسطے قبول ہوئی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اس کے حق میں رعایت کریں گے اور توجہ فرمائیں گے۔ اس تحریر سے دو امور کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ حاتم کی دعا اس لیے قبول ہوئی ہوئی تھی کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس روح کا سایہ تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضور اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن آپ کے نور کو آدم سے لے کر آپ کی پیدائش کے وقت تک موجود مانا جاتا ہے اس لیے یہ سوچنا بھی ممکن ہوا۔ اس سے روضۃ الصفا میں جو پیدائش کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا)

سات پریزادوں نے ذمہ لیا کہ وہ حاتم کو برزخ جزیرے تک پہنچا دیں گے اور کہا جو راہ میں خلل ہو تو آپ دور کریں۔ دن رات چلتے رہے۔ چوتھے دن جس جگہ کہ دیو رہتے تھے پریزادوں نے بھولے سے وہاں ایک درخت کے نیچے کھٹولا اتار دیا اور باہم کہا کہ تین دن سے کچھ کھایا پیا نہیں گھڑی دو گھڑی آرام کریں اور کچھ کھائیں۔ پریزاد ادھر ادھر چلے گئے۔ ایک حاتم کے پاس کھڑا رہا۔ کئی ہزار دیو شکار کھیلنے ادھر آنکلے انہیں دیکھا وہ چار ہزار کھٹولے کے گرد کھڑے ہوگئے۔

جب دوسرے چھ پریزاد لوٹ کر درخت کے پاس پہنچے تو دو تین دیووں کی لاشیں دیکھیں نہ پریزاد نہ حاتم موجود حیران و پریشان ہوئے۔ ایک کو سسکتے ہوئے پایا۔

اس کے منہ میں پانی ڈالا اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھنے پر بتایا۔ ”میں مقرنس کے دیووں میں سے ہوں۔ ایک پری زاد کے ہاتھ سے میرا یہ حال ہوا۔ اس کو ایک آدمی کے ساتھ پکڑ کر مقرنس کے پاس لے گئے۔ یہ معلوم ہونے پر پریزاد اس دیو کو اپنے ملک میں لے گئے اور بادشاہ سے آکر فریاد کی۔ بادشاہ نے کہا: ”دیکھو تو کس نے ان پر ظلم کیا ہے۔ انہوں نے کل ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے اُسے پیش کرنے کو کہا۔ اور انہوں نے دیو سے کہا: ”مقرنس اب تک جیتا ہے اور ہمیں بھول گیا؟“ اس نے کہا: ”آپ تو ایک مدت سے غائب تھے ان پریزادوں سے معلوم ہوا مگر اعتبار نہ آیا اب جانا۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ بادشاہ غضبناک ہوا اور تیس ہزار پری زادوں کے ساتھ تین دن کے بعد مقرنس کے شہر کے قریب جا پہنچا اور کئی جاسوسوں کو مقرنس کی خبر کو بھیجا۔ انہوں نے آکر بتایا کہ فلانے جنگل میں شکار کھیلتا ہے۔ بادشاہ فوراً اس پر جا پڑا۔ اس کے لوگ سنبھل نہ سکے۔ بہت سے زخمی ہوئے کتنے مارے گئے۔ اور مقرنس کئی مصاحبوں سمیت گرفتار ہو کر حضور میں آیا۔ وہ بولا اس کو اس وقت کہا گیا آدمی کو دیو کب جیتا چھوڑتا ہے۔“ بادشاہ نے کہا: ”حضرت سلیمان نے تم کو آدمیوں کے ستانے سے منع کیا تھا۔ اور تم نے یہ قول دیا تھا کہ ہم ان کو ایذا نہ دیں گے۔“ دیو نے کہا: ”وہ بات حضرت سلیمان ہی کے ساتھ گئی۔

اس میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ اور صدیوں سے چلی آرہی روایتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً جنات کا حضرت سلیمان کے تابع ہونا اور ان کا قول دینا کہ وہ انسانوں کو نہیں ستائیں گے۔ قول دینے کو ہندی میں وچن دینا کہا جاتا ہے۔ اور ممکن ہے قول دینے کا محاورہ وچن دینے سے ہی آیا ہو۔ قول دینے کی اہمیت ہمارے معاشرے میں بہت رہی ہے جس کی ایک نشانی قول کا چھلا بھی ہے اور فارسی کا یہ مقولہ بھی قول مدان جان دارد۔ یہاں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ جنوں یا دیووں کی طرف سے اس قول کی یاددہانی پر یہ جواب دیا گیا ہے کہ وہ بات تو حضرت سلیمان کے ساتھ گئی جس کے معنی یہ ہیں کہ بہت سی باتیں وقتی ہوتی ہیں اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ رات گئی بات گئی۔

حاتم کو پری زاد لے کر اُڑے۔ ایک جنگل کے قریب پہنچے وہاں سے حاتم کہنے لگا

یہاں ہماری حد تمام ہوتی ہے۔" حاتم گھوڑے سے اترا اور جانور کا لال پر نکال کر جلایا اور راکھ کو پانی میں گھول کر اپنے بدن پر مل لیا۔ وہ دیو کی صورت ہو گیا۔ اور سفر جاری کر دیا۔

مہر آور اور حاتم تین روز کے بعد ایک دریا پر جا پہنچے۔ وہی دریا قہرمان تھا۔ مہر آور اور حاتم تین روز کے بعد ایک دریا پر جا پہنچے۔ وہی دریا قہرمان تھا۔ مہر آور نے گھبرا کر کہا۔ بھائی ایسے دریا کے پار کس طرح جائیں۔ وہ بولا اگر چند روز یہاں ٹھہرو تو میں ایسے دریا سے اترنے کی تدبیر کروں۔ وہ اُڑ کر پردۂ بدر ان میں شمشان پریزاد کی بادشاہی سے دو اچھے دریائی گھوڑے پیراک اور اُڑنے والے لایا اور کہا۔ "اٹھو جلد سوار ہو۔" وہ دریائے قہرمان سے پار ہو گئے۔ مہر آور نے کہا۔ کئی جزیرے اس میں اور بھی بستے ہیں۔ ابھی وہ شہر دس روز کی راہ ہے۔ حاتم نے سفید پر نکال کر جلائے۔ ان کی راکھ پانی میں گھول کر ملی جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا۔

کئی دن بعد ایک دن جنگل میں سیر کرتا پھرتا تھا کہ ایک باغ کا دروازہ کھلا ہوا دکھائی دیا۔ اندر گیا۔ درخت میووں سے لدے ہوئے تھے۔ گھوڑا دریا میں دن بھر چرتا رہا۔ رات کے وقت اس باغ میں آ رہتا۔ مہر آور اپنے جزیرے میں پہنچا۔ ماں باپ سے اپنی گمشدگی کی کیفیت بیان کی اور جو آپ کا کہنا نہ مانا ایک مدت پریشانی کھینچی۔ خدا کسی کافر کو بھی یہ حالت نہ دے۔ طالع مبارک تھے کہ حاتم یمن کا شہزادہ مجھے فلانے جنگل میں ملا۔ اس نے مجھے قول دیا کہ جس وقت وہ میرے ہاتھ لگے کا موتی میں لے لوں گا۔ اور موتی والی تیرے حوالے کروں گا۔ ماں کو یہ یقین نہ آیا اور وہ سُن کر ہنس پڑی۔ لیکن مہر آور نے جو کیفیت حاتم سے مرغابی کے انڈے کے برابر موتی کی پیدائش سے متعلق سنی تھی کہہ سنائی اور کہا میں بالفعل اسے جزیرۂ برزخ کے قریب چھوڑ آیا ہوں اور لاؤ لشکر کے ساتھ بادشاہوں کی طرح شہر میں داخل ہونے کا ارادہ ہے۔ وہاں سے مہر آور لشکر کے ساتھ وعدے کے دن آن پہنچا۔ لشکر دریا کے کنارے چھوڑا اور حاتم کی جگہ آیا۔ اسے نہ پا کر گھبرایا۔ لیکن گھوڑے کو چرتے دیکھ کر پہچانا۔ باغ جا کر ڈھونڈھا وہ ایک جوان خوش رُو کی

شکل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا تماشا دیکھتا تھا۔

تمام رات عیش و عشرت سے گزری۔ صبح ہوتے ہم نے کوچ کیا۔ یہ خبر بادشاہ جزیرہ برزخ کو پہنچی وہ غصے میں آیا اور ایک سردار کو حکم دیا کہ ایک لشکر کے ساتھ ان کی راہ بند کرو۔ کئی دنوں بعد مہر آور وہاں پہنچا اس نے سامنے لشکر دیکھا اور ایک معقول مرد بھیجا کہ ہم لڑنے کے ارادے پر نہیں آئے۔ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ سردار نے کہلا بھیجا آپ فراغت سے یہاں ڈیرہ کریں۔ بادشاہ سے بخوبی ملاقات ہوگی۔ اور اپنے بادشاہ کو اس مضمون کی عرضی بھیجدی۔

حاتم اور مہر آور چند مصاحب اور تھوڑے لوگوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔ لشکر شہر کے قریب کسی باغ میں ٹھہرا۔ ماہ سلیمانی نے ایک امیر کو مہر آور کے پاس آنے کا مقصد معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ کہلا بھیجا کہ شہزادہ یمن کو آپ کے قدم دیکھنے کی نہایت آرزو ہے۔ چنانچہ میں اس کو لے آیا ہوں۔ بادشاہ نے دوسرے روز حاتم کو بلا کر ایک جڑاؤ کرسی پر بٹھایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔ حاتم نے چاندی کا انڈا جس بانو نے اس کو موتی کا نمونہ دیا تھا۔ اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا۔ "یہ مطلب ہے۔ اگر اس کی جوڑی کا موتی حضور سے عنایت ہو تو عین الطاف ہے۔ ماہ یار نے کہا۔" اس کا دوسرا کہاں سے ملے گا۔" حاتم بولا۔" میں نے سنا ہے کہ آپ کی سرکار میں ہے۔" انھوں نے کہا۔" اگر تو میری ایک شرط پوری کرے تو موتی کے ساتھ بیٹی بھی دوں۔" حاتم نے تامل کے بعد کہا۔ "مجھ کو موتی درکار ہے صاحبزادی کے آپ مختار ہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "شرط پوری کر دینے پر میں دونوں چیزیں تیرے حوالہ کر دوں گا پھر تجھے اختیار ہے جسے چاہے اسے دیجیو۔" حاتم کے کہنے پر مہر آور کو بلوایا پھر حاتم نے موتی کی پیدائش کا احوال بیان کیا۔ جو اس نے لونا طقہ ہفت رنگی سے سنا تھا۔ بادشاہ نے سُن کر تحسین و آفرین کہا اور محل سے موتی لے آیا اور بادشاہ زادی کی تیاری کا حکم دیا۔ شہزادی آئی۔ حاتم نے کہا یہ میری بہن ہے اس کو میں نے شہزادہ مہر آور کو دیا۔ وہاں سے رخصت ہو کر حاتم مہمان سرا میں منیر شامی سے جاملا۔

ساتواں سوال

"حمام باد گرد کی خبر لاوے"

چند روز کے بعد حاتم ایک شہر کے قریب پہنچا دیکھا کہ ایک کنویں کے گرد بہت مرد اور عورت جمع ہیں۔ حاتم کے سبب پوچھنے پر ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں کے حاکم کا بیٹا اس کنویں پر دیوانہ ہو کر بیٹھ رہا تھا۔ آج تیسرا دن ہے کہ اس نے اپنے آپ کو گرادیا ہر چند کانٹے اور رسیاں ڈال ڈال کر ڈھونڈتے ہیں پر اس کی لاش نہیں ملتی۔ کوئی اپنی جان کے خطرے سے اترتا بھی نہیں کہ کہیں اس میں اژدھا ہو اور وہ نگل جائے۔

بلاؤں کی ہر جگہ موجودگی محسوس کی جاتی تھی۔ اس کے سبب کوئی اپنی جان خطرے میں ڈالنے یا کسی مصیبت میں پڑنے سے ڈرتا تھا۔ دوسرے کی آگ میں تو وہی کودتا ہے جو خدا کی راہ میں سر ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ ایسے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ لیکن بہت کم۔ انہیں کوئی لالچ نہیں ہوتا وہ صرف خدا کی راہ میں کام کرنے پر متوجہ رہتے ہیں۔

کنویں میں کود جانے کے بعد حاتم نے کئی غوطے کھائے۔ اور پھر یکایک پانی تہہ کو جالگے۔ آنکھیں کھولیں تو نہ کنواں تھا نہ پانی ایک وسیع میدان دکھائی دیا آگے چلا تو ایک باغ ملا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر چلا گیا۔ ہر ایک تختے کی طرف گیا۔ ایک جگہ پریزادوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اور تخت پر ایک خوش رو بیٹھا

ہوا تھا۔ حاتم تھوڑی دور بڑھ کر گنجان درختوں میں چھپ کر تماشا دیکھنے لگا۔ پریوں کی نظر اس پر جا پڑی انھوں نے چیخیں ماریں "ہے ہے یہ آدم زاد نامحرم کہاں سے آیا۔" اور جا کر اپنے سردار سے کہا: "ایک شخص آدم کی قوم سے فلانے درختوں میں چھپا کھڑا ہے۔" پریزاد نے اس جوان سے کہا۔ "تمہارا بھائی بند ایک اور بھی یہاں آپہنچا ہے۔ اگر کہو تو لے آئیں۔ اور مہمانداری کی شرط بجا لائیں۔" وہ بولا: "مجھے بھی اپنے ہم جنس کا کمال اشتیاق تھا۔ خدا نے بھیجدیا۔

ہم جنس کا تصور ہر معاشرہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے انسان ہم جنسوں سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے ہم اپنی داستانوں میں غیر جنس جیسے پریوں۔ جناتوں۔ اور دیویوں کو انسانوں اور انسان کو ان پر عاشق ہوتے دیکھتے ہیں۔ ماں باپ اپنی اولاد سے کس قدر محبت کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں

پریزاد نے دو مصاحبوں کو حکم دیا کہ اس کو شائستگی سے لے آؤ۔" جب حاتم تخت کے قریب پہنچا تو دونوں پریزاد اور جوان اٹھ کھڑے ہوئے اور مہمانداری کی رسمیں بجا لائے۔ پوچھنے پر حاتم نے کل کیفیت بتادی۔ اس جوان نے کہا: "میں اس کا بیٹا ہوں۔ ایک دن کا ذکر ہے میں اس کنویں پر آنکلا۔ کہ یہ رشک زلیخا مجھے نظر آگئی۔ باولا ہو بیٹھ رہا۔ یہ برق وش بھی روز اپنی جھلک دکھا کر چلی جاتی تھی۔ لیکن مجھے اس دیکھا بھالی سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ آخر اس کی محبت نے مجھ کو اس کنویں میں گرادیا۔ اس کی تلاش میں اس باغ میں آپہنچا۔ اس نے میری حالت پر مہربانی فرمائی اب وہ آرام کرتی ہے۔" حاتم نے کہا: "یہ کیا انصاف ہے۔ یہاں تو رنگ رلیاں مناتا ہے اور وہاں تیرے ماں باپ کا وہ حال ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے ہاتھ اختیار ہے۔ اگر یہ رخصت دے تو جاؤں ان کی تسلی کر آؤں۔ حاتم پھر پری کی طرف متوجہ ہوا کہنے لگا "احسان و مہربانی سے دور ہے کہ اس کے ماں باپ آتش ہجر سے جلیں اس جوان کو دو تین دن کی رخصت دے جو یہ جا کر ان کے دل کو ٹھنڈا کر آئے۔" وہ بولی: "یہاں

کس نے منع کیا ہے۔ ابھی چلا جائے۔" یہ سن کر حاتم نے کہا۔" اٹھ کھڑا ہو پری نے پروانگی دی۔" بولا یہ رضامندی نہیں چاہیئے کہ مجھ سے قول کرے کہ تو خاطر جمع سے اپنے گھر جا میں ہر ایک ہفتے میں دو تین بار رات کو تیرے پاس آجاؤں گی۔ اور تجھے نہیں بھلاؤنگی۔"

پھر ایک دم کے بعد حاتم نے اس پری زاد سے کہا، خدا کے واسطے اس پر مہربان ہو اور جو یہ کہتا ہے مان لے۔" وہ تیوری چڑھا کر بولی۔" ہماری قوم کی یہ چال نہیں جو میں کروں۔"

یہ بات بھی معاشرے میں عام تھی کہ اگر دیو یا پری کسی پر عاشق ہو جائے تو اس کو پھر اس کی دنیا میں نہیں چھوڑتی۔ بلکہ اس کو اپنے ساتھ اپنی دنیا میں لے جاتے ہیں اور ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ انسانی دنیا میں آکر بس جائیں۔ وہ تو انسانوں کو پسند ضرور کرتی ہیں مگر یہ تصور ان کے یہاں نہیں پایا جاتا کہ وہ ان کے گھر انسانی دنیا میں آکر آباد کریں یہی وجہ ہے کہ انسان تو پریوں کے دیس میں جاکر رہ سکتا ہے مگر وہ ان کے دیس میں بسنے کے لیے نہیں آتیں لیکن اس قصے میں یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ پری اس سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ اس سے ملنے آیا کرے گی مگر یہاں بھی گھر بسانے کا وعدہ نہیں کرتی۔

حاتم نے کہا "حضرت سلیمان کے درمیان مطلب مجھے یاد رہو۔" پری نے قسم کھا کر کہا۔" میں ہرگز قول سے نہیں پھروں گی۔" اور پریوں سے ان دونوں کو کنوئیں پر پہنچا کر آنے کے لیے کہا۔ انہیں دیکھ کر سب لوگوں کو حیرت ہوئی۔

وہاں چودہ دن حاتم مہمان رہا۔ پری بھی وعدے پر آتی رہی پندرھویں دن وہ وہاں سے رخصت ہوا ایک مدت کے بعد ایک بستی نظر آئی۔ ایک پیر مرد شہر پناہ کے باہر ملا۔ پوچھنے پر اس نے کہا۔ اول تو اس کا نشان معلوم نہیں دوسرے جو کوئی وہاں گیا سو گیا۔ اس کا راستہ اول منزل سے کم نہیں۔ اور راستے میں حارس قطان شہر قطان کے بادشاہ نے اس کی سرحد میں چوکی بٹھائی ہے۔ کہ جو کوئی اس حمام کی خواہش کرے آگے پہلے اسے میرے پاس لے آؤ۔ معلوم نہیں اپنے روبرو بلانے کی اس کی کیا وجہ ہے۔

رخصت ہو کر حاتم کو چند روز بعد ایک شہر نظر آیا اور نقاروں کی آواز سنائی دی تب میں بجنے لگا شاید کسی کے گھر میں شادی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ" رسم اس شہر کی ہے کہ برسویں دن ہر ایک امیر و غریب اپنی اپنی نابالغ لڑکیوں کو دلہن بنا کر خیمے میں بٹھا دیتے ہیں پھر ایک بڑا سانپ جنگل کی طرف سے آتا ہے اور ایک جوان کی شکل بن کر ہر ایک خیمہ کے اندر جا کر ان سبھوں کو دیکھتا ہے جو پسند آتی ہے اس کو لے جاتا ہے ہم نے دہشت سے بے حیائی کی نقاب منہ پر ڈال کر مجبوراً شادی مچائی ہے۔"

شادی بیاہ کی رسمیں مختلف قوموں میں مختلف رہی ہیں ان میں ایک رسم لڑکی کو اٹھا کر لے جانے کی بھی ہے اور دولھن جا کر بھینٹ کرنے کی بھی ہے۔ زبردستی اٹھائے جانے کی رسم کی یادگار اس میں موجود ہے کہ دولھا دولھن کو اپنی گود میں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اور اس میں بھی کہ اس کی بغل میں تلوار بندھی رہتی ہے نیز اس میں بھی کہ سالیاں اور دولھن کی سہیلیاں دولھا کو پھولوں کی چھڑیوں سے مارتی ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ شوہر کے لیے ایک لفظ خصم بھی موجود ہے جس کے معنی دشمن کے ہیں۔ سانپ خود مردانہ قوت جنسی کی علامت بھی ہے اور یہاں اسی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

حاتم نے کہا۔" یہ بڑی بلا تم پر آتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس آفت کو میں اس رات کو تمہارے سر سے دفع کرتا ہوں۔"

جب حاتم کو خبر ہوئی کہ وہ موذی آپہنچا تو اس بادشاہ سے کہا۔" ذرا میں بھی اس کو دیکھوں۔" پھر اٹھ کر خیمے کے باہر نکلا۔ تو دیکھا کہ ایک اژدھا آسمان سے سر لگائے چلا آتا ہے۔ جو درخت اور پتھر اس کی چھاتی کے نیچے آتا ہے وہ پس کر سرمہ ہو جاتا ہے۔ نزدیک آکر اپنی دم ایسی سخت کر کے ہلائی کہ سب آدمی سر جھکا کے زمین پر گر پڑے اور چاروں طرف لوٹ پوٹ ایک خوبصورت آدمی بن گیا۔ بادشاہ آگے جا کر اسے اپنے خیمے میں لے آیا وہ ایک دم بیٹھا اور کہا۔" اپنی اپنی لڑکیاں مجھے دکھاؤ۔" اس نے خیمے سے نکل کر سرداروں سوداگروں اور غریبوں کی لڑکیاں دیکھیں کسی کو پسند نہ کیا الٹا پھرا بادشاہ کے خیمے میں جہاں شہزادی بیٹھی تھی اسے منظور نظر کر کے کہا۔" اسے میرے حوالہ کر دو۔"

بادشاہ نے حاتم کی کہی ہوئی بات دہرادی۔ اس نے کہا اسے بلواؤ۔ وہ فوراً روبرو آکھڑا ہوا۔ جن نے پوچھا تو کون ہے اور کس واسطے اس ملک کو خراب کروایا چاہتا ہے۔ حاتم نے کہا۔ "اب اس ملک کا مالک میں ہوں اور یہاں کے سب کام مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو کوئی ہمارے باپ دادا کی رسمیں بجالاتا ہے اس کو پیش کر دیتے ہیں۔

حاتم کا کردار شروع سے ایک ایسے ہیرو کا کردار رہا ہے جو شروع سے اپنی ہمت و حوصلے، فکر و تدبر اور غیبی امداد کے سہارے پر مہم کو سر کرتا جاتا ہے۔ قدیم زمانے سے اس طرح کے ہیرو ازم ناموں اور داستانوں میں ہمیں ملتے ہیں۔ حاتم ہو یا داستان امیر حمزہ کے ہیرو۔ ازم یہ اسی ہیرو ازم کا عکس ہیں۔ سانپ کا اپنی دُم کے سہارے چلنا اسی جنسی اور جذبات قوت کے فروغ اور بلوغ کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں سانپ کی پوجا ہوتی ہے وہاں اُسے ایسی حالت میں دکھلایا جاتا ہے۔ اور ایسے بہت سے سانپ ہوتے ہیں جو اپنی دم کے سہارے انسان کے قد کی طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جن نے پوچھا: "وہ کیا ہے"۔ حاتم نے کہا: "میرے پاس ایک مہرہ ہے پہلے تو اس کو گھس کر پلاتا ہوں"۔ جن نے کہا "لے آ، میں پیوں گا۔" حاتم نے خرس کی بیٹی کا دیا ہوا مہرہ تھوڑے سے پانی میں رگڑ کر اس کے حوالے کیا۔ جن نہ جانتا تھا کہ یہ اس کے لیے زہر ہے۔ مارے غرور کے پی گیا۔ اس نے علم جنی فراموش کیا۔ لیکن ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ "کوئی اور رسم باقی ہو تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں"۔ حاتم نے کہا ایک گولی میں تم اترو اور ہم اس کا منہ باندھ دیں پھر اس کے باہر نکل آؤ۔ اگر نہ نکلو تو ہزار لعل اور ہزار الماس اور ایک موتی مرغابی کے انڈے کے برابر جو پریوں کے ملک میں ہے گنہگاری میں ہیں۔ وہ بولا۔ "جلد لاؤ، گولی کہاں ہے"۔ حاتم نے ایک بڑے سی گولی منگا کر اس کے آگے رکھی۔ اور کہا بسم اللہ، وہ فوراً اتر پڑا۔ حاتم نے اس کے منہ پر ڈھکن ڈھک کر مضبوط باندھ کر اسم اعظم پڑھنا شروع کیا اور کہا اب باہر نکل۔ اسم اعظم کی برکت سے اس کا ڈھکنا پہاڑ سے سوا بھاری ہو گیا۔ اس نے بہت زور لگایا پر نکل نہ سکا۔ تب حاتم نے کہا۔ اس آس پاس نیچے اوپر لکڑیاں رکھ کر آگ بھڑکا دو۔ لوگوں نے اس کے

کہنے پر عمل کیا جن میں جلا بھن جلانے لگا۔ اور آخر جل کر خاک ہو گیا۔

جنوں کو اسم اعظم کی مدد سے قابو میں کرنے اور فلیتوں کے ذریعہ جلانے کی روایت اور رسمی طریقہ بہت عام رہا ہے۔ یہاں اسے ایک ایسے برتن میں بند کیا گیا ہے جس کو اب وہ کھول ہی نہیں سکتا۔ الف لیلہ میں کسی مٹی کے برتن میں جن کو کھولا گیا ہے جو اب بند نہیں ہو سکتا۔ یہاں اتنی بات اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ جن بہت آسانی سے اپنا جون بدل سکتے ہیں اور اس کے باوجود کہ وہ آگ سے بنے ہیں ان کو جلایا بھی جا سکتا ہے جب کہ آگ سے بنی کسی چیز کو جلایا نہیں جا سکتا۔

حاتم وہاں سے رخصت ہو کر تین دن کے بعد اس پہاڑ کے نیچے پہنچا جس کا اس پیر مرد نے ذکر کیا تھا۔ پھر دوراہا آ گیا۔ اور پیر مرد کے مشورے پر [illegible] اختیار کیا کچھ دور جا کر اسے خیال آیا کہ اس راستے جانا [illegible] ہے۔ [illegible] خدا ساتھ ہے تو پھر کیا کس بات کا اندیشہ۔ دوسرے مسافروں کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔

خود مصیبتیں اٹھا کر دوسروں کے لیے راستہ صاف کرنے کا تصور [illegible] معاشرے کا پتہ دیتا ہے۔ اور حاتم کے خدا کی راہ میں ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے پہلے بھی [illegible] آسان راستہ قبول نہیں کیا۔ اور جس راستے سے [illegible] اس راستے سے گیا تھا۔ [illegible] اس وقت بھی [illegible] ہے۔

اس جنگل کے بچھو [illegible] دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے [illegible] [illegible] ہو گیا۔ زمین مہرے کے پڑتے ہی رنگ بدلنے لگی۔ [illegible] تین دن تک [illegible] تمام ہوئے۔ چوتھے روز [illegible] ایک بڑا شہر دکھائی دیا۔ لوگوں نے دیکھ کر پوچھا [illegible] بتانے پر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی [illegible] اور بولے جنگل کے راستے گزرا۔ [illegible]

پاس رکھا ارادہ تھا کہ سچا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ سولی دے دی جائے گی۔

اس دور کے معاشرے میں بادشاہ سے ایسی توقعات ہی وابستہ کی جاتی تھیں اور ایسے ہی بادشاہ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جس کی رعایا خوشحال ہو اور ظلم کے خلاف داد کو پہنچتی ہو۔ (ع ۔ ز)

بادشاہ کے کہنے پر حاتم نے کہا ایک رہبر ساتھ کر دیجئے کہ وہ شہر قطان کا پتہ بتا دے اتنا بھی احسان بہت ہوگا۔

چند روز کے بعد ایک مقام پر رہبروں نے عرض کی "ہماری حد ختم ہو چکی ہے۔ یہ سرحد شہر قطان کی ہے۔

حاتم شہر قطان میں جا کر کارواں سرا میں اترا۔ ایک دن دو موتی اور دو لعل ایک ڈبہ میں رکھ کر بادشاہ کے پاس پہنچا بادشاہ ان جواہرات کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کو پاس بٹھا کر احوال پوچھا۔

ایک دن اور پھر بادشاہ کو خوش دیکھ کر حاتم نے کئی لعل و زمرد الماس نذر گزارے۔ بادشاہ نے کہا۔ جو تجھے درکار ہو بے تکلف مانگ عذر نہ کروں گا۔" حاتم نے بادشاہ سے قول لینے کے بعد کہا۔ "حمام بادگرد دیکھنے کی آرزو ہے۔" بادشاہ سن کر متفکر ہو گیا حاتم نے پوچھا آپ اس قدر متفکر کیوں ہیں۔ ہر طرح سے آپ کا فرماں بردار ہوں۔" بادشاہ نے کہا "اے عزیز مجھے کئی طرح کے اندیشے ہیں۔ پہلے تو میں نے قسم کھائی ہے کہ کسی کو حمام بادگرد کی طرف نہ جانے دوں گا۔ دوسرے تجھ سا جوان خوبصورت نیک سیرت اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ اگر اجازت نہ دی تو قول سے جھوٹا ہوں۔ یہ بادشاہوں کے حق میں مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر بد عہد مشہور ہو گیا تو پھر کوئی میرے قول و قسم کا اعتبار نہ کرے گا۔ سلطنت کے کاموں میں خلل پڑے گا۔

بادشاہ کو اس معاشرے میں سلطنت کے کاموں کو ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اور معاشرے کے لوگ بھی بادشاہ سے کئی باتوں کی توقعات رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا قول کا سچا ہونا دوسرے

عہد شکنی نہ کرنا۔ اور تیسرے کسی کے سلوک کا احساس رکھنا اور پاس کرنا۔

پندرہ روز بعد حمام نظر آنے لگا۔ حاتم کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا۔ یہی حمام کا دروازہ ہے۔ دیکھنے میں نزدیک مگر سات روز کی مسافت ہے۔ اور ساتویں دن دروازے سے متصل جا پہونچے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر عظیم پڑا تھا جو حمام بادگرد کے دربان کا لشکر تھا۔ اس لشکر میں ہمراہیوں کے بہت سے خویش و اقربا تھے۔ ایک نامہ بھی دربانوں کے نام اُسے دیا۔

آخر ناچار ہو کر حاتم کو حمام کے دروازے پر لے گیا۔ دروازے پر لکھا تھا۔ "یہ طلسمات کیومرت بادشاہ کے وقت میں بنا ہے اس کا نشان مدتوں رہے گا اور جو کوئی اس طلسمات میں جائے گا جیتا نہ نکلے گا۔ وہیں بھوکا پیاسا سرگرداں رہے گا۔ اگر اس کی زندگی ہے تو ایک باغ میں وارد ہوگا۔

لوگوں کو رخصت کیا اور اندر گیا۔ دس بارہ قدم چل کر جو پیچھے پھر کر دیکھا تو نہ لوگوں ہی کو پایا نہ دروازہ ہی نظر آیا۔ ایک جنگل لق و دق موجود تھا۔ متفکر تھا کہ کس طرح دروازہ کو ڈھونڈے پھر باہر نکلے۔

چند روز کے بعد ایک سمت کا رستہ لیا۔ تھوڑی دور جانے پر ایک آدمی کی صورت نظر پڑی۔ خیال ہوا کہ آگے شاید بستی ہوگی۔ ادھر گیا۔ وہ بھی ادھر کو آتا تھا۔ قریب پہنچ کر اس صورت طلسمی نے سلام کیا اور ایک آئینہ بغل سے نکال کر حاتم کے ہاتھ میں دیا۔ حاتم نے اس کو لے کر اپنا منہ دیکھا اس نے پوچھا۔ حمام یہاں سے نزدیک ہے اور تو کیا حمام ہے جو آرسی دکھاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "البتہ حاتم کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ "میں حجام ہوں جس شخص کو دیکھتا ہوں لے جا کر حمام میں نہلاتا ہوں پھر انعام کا امیدوار ہوتا ہوں۔" حاتم نے کہا۔ "بہت بہتر۔" اور پوچھا۔ "تو اکیلا ہے یا اور کوئی شریک بھی رکھتا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں تو بہتیرے پر آج غلام ہی کی باری ہے۔"

آگے پیچھے دونوں دو تین کوس چلے ہوں گے۔ کہ ایک گنبد آسمان سے ملا ہوا نظر آیا۔ نزدیک پہنچنے پر حمام کے اندر گیا۔ اور اس کو بلایا۔ جیسے ہی حاتم داخل ہوا

دروازہ بند ہوگیا۔ لیکن دکھائی دیتا تھا۔ اس امید پر آگے بڑھا۔ کہ جب چاہوں گا نکل جاؤں گا۔ خواص نے حوض پر لے جا کر کہا۔ "آپ اس میں اتریں تو میں بدن پر پانی ڈالوں اور میل چھڑاؤں۔" حاتم نے کہا۔ "بے لنگی کیسے کپڑے اتاروں۔" خواص نے ایک لنگی حوالے کی۔ اُسے پہن کر حاتم حوض میں اترا۔ تو خواص نے ایک جڑاؤ طاس گرم پانی سے بھر کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ تیسری مرتبہ جونہی گرم پانی طاس سے سر پہ ڈالا وہیں ایک تڑاقہ ہوا حمام میں اندھیرا ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد تاریکی نہ رہی تو اس نے دیکھا نہ حمام ہے نہ حوض۔ مگر ایک پتھر کا تراشا گنبد ہے۔ اس کا تمام صحن پانی سے بھرا نظر آیا۔ اور تھوڑی دیر میں پانی پنڈلیوں پر نظر آگیا۔ گھٹنوں سے اوپر ہوا تو حاتم گھبرایا۔ بےچین ہوکر دروازے کی طرف گیا۔ چاروں طرف سر ٹکراتا پھرا لیکن دروازہ بھی نہ پایا پانی ڈباؤ ہوا تو وہ مرنے لگا دل کو طرح طرح سے تسلی دیتا تھا۔

حمام ایرانی روایت تھی۔ اور اس میں بڑے اہتمام روا رکھے جاتے تھے یہاں گرم پانی کے طاس کا ذکر ہے جو جڑاؤ ہے اس خواص کا ذکر ہے جو بدن کو مل کر میل چھڑاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک حوض کا ذکر ہے جس میں اتر کر نہایا جاتا ہے اور جس میں حاتم برہنہ نہیں اترنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے حمام میں لوگ برہنہ ہوکر ہی نہاتے ہوں۔ اس لیے کہ اُردو میں ایک محاورہ ہے جو فارسی سے آیا ہے۔

"کہ ایک حمام میں سب ننگے"۔

ایک اور بات اس میں قابل ذکر پانی کی آمد سے متعلق ہے۔ اس طرح کے حوض مغل دور میں بنائے جاتے تھے۔ اور ان میں پانی خود بخود چاند کی کشش سے آتا تھا۔ اور چاند کی کشش کم ہونے کے بعد کم ہو جاتا تھا۔ پانی کی سطح کا آسمان سے باتیں کرنا بہت سے ایسے قصّوں میں موجود ہے جس میں "طوفانِ نوح" کا تاثر جھلکتا ہے۔

ایک زنجیر لٹکی دکھائی دی حاتم نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی کہ ویسی ہی آواز آئی وہ گنبد کے باہر ہوگیا۔ اور ایک جنگل میں اپنے آپ کو کھڑا پایا۔ میدان کے سوا کسی طرف کچھ نہ تھا۔ آگے گیا اور تین دن تک بھٹکتا گیا۔ ایک عمارت دکھائی دی اس طرف گیا۔

نزدیک پہنچا تو ایک خوشنما باغ دیکھا۔ قریب ہوا تو دروازہ کھلا ہوا تھا کئی قدم بڑھا اور لوٹ کر دیکھا تو دروازہ بھی نہ دکھائی دیا۔ ایک مکان کی طرف چلا میوے کے درخت تھے۔ میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا کھاتا جاتا مگر پیٹ نہ بھرتا۔ مگر کھاتا اور سیر کرتا تماشا دیکھتا پھرتا تھا۔ ایک بارہ دری میں جا پہنچا اس کے قریب بہت سے آدمی پتھر کے ننگے کھڑے تھے مگر لنگی باندھے تھے۔ یہ فکر میں تھا کہ ایک طوطی نے آواز لگائی کہ "اے جوان کیوں کھڑا ہے۔ یہاں جو آیا ہے اس نے جان سے ہاتھ دھویا ہے۔ دیکھا تو پنجرے میں ایک طوطی تھا۔ اور یہ عبارت ایوان پر لکھی دیکھی۔" اے بندۂ خدا اس حمام بادگرد سے جان سلامت نہ لے جائے گا۔ کہ یہ طلسمات کیومرث بادشاہ کا ہے۔ اسے ایک الماس تین مثقال وزن کا ملا۔ اسے رکھنے کے لیے یہ طلسمات بنوایا ہے۔

بہت سے انسانوں کا پتھر ہو جانا ہماری روایتوں میں بھی شامل ہے۔ ایک مزار کے قریب راقمہ نے ایک پتھر کو کھڑے ہوئے دیکھا جس سے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ یہ چوری کرنے آیا تھا اور صاحب مزار کی کرامت سے اس جرأت نارواکی پاداش میں پتھر ہوگیا۔ مندروں میں ایسے بہت سے بت اور مجسمے ملتے ہیں جن پر یہ دھوکا ہوتا ہے۔ کہ کبھی یہ انسان رہے ہوں گے۔ بعد میں بازور سحر پتھروں میں ڈھل گئے اس طرح اس کہانی کا یہ تخلیقی منظر نامہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشاہدہ کا بھی حصہ ہے اردو کے اس شعر کی طرف اگر اشارہ کردیا جائے تو یہ جذباتی حقیقت سامنے آسکتی ہے۔

جانے کس نے دی صدا زیں مجھے
مڑ کے دیکھا اور پتھر ہوگئی۔

مندروں کی دولت کا تصور اس خزانے کی طرف اشارے سے ملتا ہے جس میں بیش بہا یاقوت موجود ہیں۔

طوطی کو ہیرا لگوا کر پنجرے میں یہاں لٹکا دیا اور جواہر نگار کرسی پر تیر و کمان

اس واسطے رکھ دیا کہ جو کوئی اس طلسم میں وارد ہو اور باہر جانے کا ارادہ کرے تو تیر و کمان اٹھائے اس طوطی کے سر میں ایک تیر بقلم مارے اگر لگا تو وہ اس کے طلسم سے باہر ہوا اور ہیرا بھی اس نے پایا نہیں پتھر کا ہو جائے گا۔

طوطا ایک ہندوستانی پرند ہے اور وہ خود کلام طاہر ہے۔ جو بہت سی کہانیوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں تیر کمان کو اٹھانا اور تیر کو ایک خاص نشانے پر مارنا تاریخی و نیم تاریخی اور افسانوی قصّوں کا ایک دل آویز عکس پیش کرتا ہے۔

بسم اللہ کرکے تیر و کمان اٹھا کر ایک تیر ایسا مارا کہ طوطی پھڑک گئی۔ مگر تیر خطا ہوا پنجرے کی چھت میں لگا اور حاتم گھٹنوں تک پتھر ہو گیا۔ طوطی وہیں آ بیٹھی اور بولی: اے جوان جا یہاں سے یہ مکان تیرے قابل نہیں۔ حاتم سو قدم پیچھے جا پڑا۔ اور ایک تیر اور مارا وہ بھی خطا ہو گیا تو ناف تک پتھر ہو گیا۔ طوطی نے پھر وہی بات کہی حاتم دو سو قدم پیچھے ہو گیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہ اپنی سوت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے اور تیر مارا۔

آنکھوں پر پٹی باندھ کر تیر مارا تو خطا نہ ہوا اور دو تیر اس سے پہلے آنکھیں کھلی ہونے پر مارے مگر کوئی ایک نہ لگا۔ یہ خدا پر مکمل بھروسہ کا ہی نتیجہ ہے۔ آنکھ بند کرکے تیر مارنا یا آنکھوں پر پٹی باندھ کر تیر مارنا تیر اندازی کی مہارت کی طرف اشارہ ہے ایسے ماہر تیر انداز آواز پر تیر مارتے تھے۔ اور اس کا ذکر متعدد جگہوں پر ملتا ہے۔ پرتھوی راج راسا میں بھی موجود ہے۔

طوطی کو جا لگا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ اور وہ پنجرہ سے باہر آ پڑی اتنے میں ایک آندھی آئی۔ گھٹا اٹھی۔ بجلی کڑکنے لگی اور اندھیرا ہو گیا۔ شور و غوغا سے حاتم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایک ساعت کے بعد سب کچھ دور ہوا اور سورج نکل آیا حاتم نے اپنے آپ کو بتوں کے برابر پڑا پایا اور الماس سمیت بت آدمی بن گئے حاتم نے الماس اٹھا لیا۔

آزمائشوں اور امتحانوں کا جو تصور ہماری پوری زندگی پر چھایا رہا ہے۔ اسی کا

ایک بہت ہی فکر انگیز اور خوبصورت عکس گھٹاؤں۔ طوفانوں اور آندھیوں کی اسیری کے ساتھ اس بیان میں ملتا ہے اور جب ایسا کوئی طلسم ٹوٹ جاتا ہے تو مردے زندہ ہو جاتے ہیں اور زندہ سچائیوں کو موت آ جاتی ہے   شاعری بھی ان طلسموں سے متأثر رہی ہے مشہور شعر ہے۔

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کر گنجینۂ زر لیتا ہے

چند روز کے بعد شہر قطان میں داخل ہوا اور حارث بادشاہ کے روبرو الماس رکھ دیا۔ لیکن وہ حسن بانو کو دکھانے کی اجازت چاہی۔ ساتھ کے لوگوں کے لیے سواری اور خرچ راہ کا انتظام کروا دیا۔ حاتم بھی رخصت ہوا۔ بادشاہ نے ساتھ بہت سا سامان اور اسباب کیا۔

کئی مہینے بعد حاتم شاہ آباد پہنچا۔ حسن بانو نے بدستور بلایا۔ اس نے کل کیفیت بیان کی اور الماس بھی دکھایا حسن بانو نے کہا اب تو میرا مختار ہے جو چاہے سو کر جس کو چاہے اسے بخش دے۔ اپنے پاس رکھا چاہے تو رکھ۔ حاتم نے منیر شامی کو بلا بھیجا۔ وہ بڑے ٹھاٹھ سے شاداں اور فرحاں آیا۔ حاتم نے اسے بھی ایک جڑاؤ کرسی پر اپنے پاس بیٹھایا حسن بانو نے پردے سے جھانک کر دیکھا اور نیچی نظر کیے شرم سے اٹھ کر دوسرے مکان میں چلی گئی۔

رات کارواں سرا میں رہا۔ صبح کو حسن بانو کے خالی کروائے ہوئے مکان میں منیر شامی سمیت آ گیا۔ اور بیاہ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ساچق بھجوایا۔ دوسرے دن مہندی اس ٹھاٹ سے آئی۔ آدھی رات گئے نہایت شان سے منیر شامی حسن بانو کو بیاہنے گیا۔ برات کا ٹھاٹھ باٹھ بادشاہوں کی شادیوں کی مانند تھا۔

مہندی کی اور ساچق کی رسم دہلی کی معروف رسموں میں سے ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر حاتم زندگی اور ذہن کے بہت سے طلسموں سے گزرتے ہوئے خود اس شہری تہذیب کے دائرے میں آ گیا جہاں سے اس کا سفر شروع ہوا تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں قاضی نے نکاح پڑھایا مبارک سلامت ہوئی۔ دولہا ڈیوڑھی تک لیجایا گیا۔ وہاں کئی بیگمیں دلھن اناسمیت آئیں۔ آرسی مصحف میں منیر شامی غش کھا گیا۔ ہوش میں لایا گیا۔ تو دوسری رسمیں انجام دی گئیں۔ دلھن کو چنڈول میں سوار کراکے دولت خانے پر لایا گیا۔ چار دن تک محل میں رہا پانچویں دن برآمد ہوا اور حاتم کے پاؤں میں گر پڑا۔ حاتم نے گلے لگایا اور دو چار روز اور بھی بہ منت رکھا۔

محل میں مبارک باد کی دھوم مچی شہر میں آیین آیین ہوئی گھر گھر شادیانے بجے بادشاہ نے ہر ایک چھوٹے بڑے کو رتبے کے موافق خلعت دیا محتاجوں کو غنی کیا۔ حاتم کو نئے سرے سے ملکہ زریں پوش کے ساتھ بیاہا اور بادشاہ نے حاتم کو قائم مقام کیا اور دس برس سات مہینے نوروز میں یہ ہفت سیر انجام کو پہنچی۔

آیین۔ آیین ایک خاص امر کی طرف اشارہ ہے جس میں مکتوبوں کے بچے مبارک باد دینے آئے تھے۔

باغ و بہار کا تہذیبی مطالعہ

باغ و بہار جس کے نام سے میر امّن مشہور ہوئے اور آج میر امن کا نام اس کے نام کے ساتھ جیسے ہمیشہ کے لئے جوڑ دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ قصہ میر امّن سے پہلے بھی مشہور رہا ہے اور میر امّن کے بعد اس کے کئی نسخے سامنے آئے ہیں۔ یہ کہانی عہد محمد شاہی میں سب سے پہلے مرتب ہوئی تھی جبکہ یہ میر امن کا بیان ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو نے حضرت محبوب الٰہی کو اس وقت سنائی تھی جب وہ بیمار تھے اور حضرت نے صحت مند ہونے پر دعا فرمائی تھی کہ جو اس کہانی کو سنے گا صحت یاب ہوگا۔ ہر اچھی کہانی کے ساتھ اس طرح کے واقعات جڑے رہتے ہیں اور زمانہ بہ زمانہ اس میں شاخ گل کی طرح نئے پھول کھلتے اور اپنی بہار دکھلاتے رہتے ہیں۔

خود باغ و بہار کا قصہ اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے قصوں سے استفادے کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ قصے کی اس نوعیت کا مطالعہ بھی تہذیبی مطالعہ کا ایک حصہ بن سکتا ہے کہ کسی حصے میں کب کب تبدیلیاں آئیں اور اس کی ابتدا کو کس دور اور کس زمانے سے وابستہ کیا گیا۔ باغ و بہار کا حصہ بھی پہلے فارسی میں لکھا گیا پھر ہندی میں اس کا نسخہ تیار ہوا بعد ازاں نوطرز مرصع کی صورت میں عربی میں حسین خاں بخش نے اسے لکھا اور اپنے زمانے کے رواج کے مطابق مسجع اور مرصع عبارتوں سے آراستہ کیا۔ فورٹ ولیم کالج پہنچ کر میر امّن کے ہاتھوں

اس نے سادگی اور پُرکاری کا ایک نیا لباس پہنا۔ انگریزی اور فرانسیسی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ غرض کہ زمانہ بہ زمانہ اس کی شکلیں اور لہجہ بدلتا گیا لیکن قصہ کی اپنی مقبولیت قائم رہی۔

ابتدائے قصہ ہی سے جس پہلو پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت کا معاشرہ روایت پرست تھا۔ ایک بہت مشہور روایت ہے "یا بہت عرصہ ہوا" "یا کہا جاتا ہے" "یا سنا جاتا ہے" "یا کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا" اس انداز کے دوسرے آغاز داستان روایت ہی کے قبیل کے ہیں۔ (۱) اور یہ بتاتے ہیں کہ جس معاشرے میں یا جس معاشرت میں اس طرح قصوں کا آغاز کیا جا رہا ہے وہ روایت پرست ہی ہے۔ اس کے افراد کے نزدیک روایت کی بڑی اہمیت ہے اور وہ اسے یقین ہی کی طرح سے لیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایسے معاشرے میں روایت عقیدے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔

دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ بادشاہ میں کون کونسے اوصاف ضروری خیال کیے جاتے تھے اور اس سے معاشرے کو کیا توقعات ہوتی تھیں نیز وہ اپنے ذمے رعایا کے کیا فرائض لازم قرار دیتا تھا۔ روم کے بادشاہ آزاد بخت کو رحم دل اور انصاف پسند بتایا گیا اور اس کے اوصاف میں سخاوت اور رحم دلی نمایاں تھیں (۲) یہ اس کا حسن انتظام اور رعایا پروری کا عالم تھا کہ اس کے عہد میں عوام بہت خوش و خرم تھے۔ (۳) لیکن ایسے نیک بادشاہ کے ساتھ یہ بدبختی بھی لگی ہوئی تھی کہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی یہ خدا کی جانب سے بادشاہ کے لئے ایک امتحان ہی ہوا کرتا تھا اور اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل قرار دینے کے لیے خدا پرستی اور عبادت الٰہی میں اور بھی مصروف ہوتا تھا۔ (۴) اس پر بھی شاکر تھا اور خدا ترسی میں کامل تھا یہی امید لئے ہوئے اس کی عمر چالیس سال کی ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ چالیس کا ہندسہ کیونکر رواج میں آیا۔ زچگی کے زمانے میں بھی زچہ کے لئے چالیس دن یا سوا مہینے کی احتیاط اور دیکھ بھال ضروری خیال کی جاتی ہے۔ چلّہ کھینچنے کے لئے

بھی چالیس دن، کسی مزار پر چالیس دن چراغ جلانے کا عقیدہ، اس طرح اور دوسرے معاملات میں بھی اس گنتی کی اہمیت مانی جاتی ہے۔ (۵) اور بڑھاپے کی آمد آمد کی حد کا تعین کرتی ہے۔ اگرچہ بڑھاپے کی شروعات کی نشانی مونچھوں میں سفید بال دکھائی دینا ہے۔

اولاد زندگی کا پھل، اندھیرے گھر کا دیا اور بانی دیوا اور نام لیوا کی حیثیت سے مانی جاتی ہے۔ نام اور ریاست کا نشان اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی واحد ذریعہ ہے نام چلانے کا۔ جب خاص عمر تک یہ نصیب نہ ہو تو یہ احساس قدرتی ہے۔ . . "افسوس تو نے اپنی عمر ناحق برباد کی اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ . . . . . آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے اس سے بہتر یہی ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔ یعنی اس معاشرے میں خالق کی یاد ہی دنیا اور زندگی کا حاصل سمجھی جاتی تھی اور دنیا کی حرص تو عمر کی ناحق بربادی خیال کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب بادشاہ میں یہ احساس پایا جاتا تھا تو عوام کا رنگ بھی کچھ اس سے مختلف نہ ہوگا۔

بادشاہ کا گوشہ نشین ہونا تھا کہ مفسدوں اور غنیموں نے سر اٹھایا، بدعملی کی خبریں آنے لگیں اور امرا میں صلاح ٹھہری کہ وزیر کو آمادہ کیا جائے کہ وہ بادشاہ کو گوشہ نشینی سے باہر نکالے۔ وزیر ہی سے بادشاہ اور عوام آڑے وقت میں تدبیر چاہتے تھے اور اپنی عقلمندی اور سوجھ بوجھ سے خواص و عوام کی امید پوری کرتا تھا۔ وزیر صرف نام ہی کا خردمند نہ تھا بلکہ اسم بامسمیٰ تھا جیسا کہ وزیر سے توقع کی جاتی رہی ہے حکومت سے بادشاہ کو اس کے فرائض کی ادائیگی پر رضامند کیا۔ بادشاہ بھی قدامت، خیرخواہی، تدبیر اور جاں نثاری کے سبب وزیر کا قدر دان تھا۔ پہلے تو کہا "مجھے نہ ستاؤ" "تم سلطنت کرو۔" وزیر نے کہا "ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے انجام اس کا اچھا نہیں۔" جب بادشاہ نے اپنی فکر بیان کی تو وزیر کا کردار اُبھرا اور اس نے کہا "خدا کی جانب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں . . . . بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدانخواستہ

کا بھی کھاتا روزنامہ شامل تھا۔ یعنی اس معاشرے میں اونچے طبقے کے لیے سپاہ گری کا کسب فن ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ حالانکہ سپاہ گری کا کسب فن شہزادوں اور جنگجو طبقے ہی کے افراد کے لیے ہوتا ہے۔

رات کا بے انتہا ہونا بھی غنڈوں بھانکڑوں، مفت پر کھانے پینے والوں جھوٹوں خوشامدیوں کے گرد جمع ہو جانے کی دعوت دیتا ہے۔ بعض معاشرے کا مصاحبین کا کردار رہا ہے۔ جب کوئی سر پر بڑا بوڑھا نہ رہے تو یہ کردار اپنا رنگ دکھاتا ہے اور تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔ اور اس حقیقت کو ثابت کر دیتا ہے "آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ معاشرے میں ایسے لوگوں کا یہی کردار رہا ہے۔" دو آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور جہاں جہ خون اپنا ہر بات میں نثار کرتے تھے) کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے۔"

بہن کے بھائی کے تئیں کیا احساسات اور جذبات ہوتے ہیں اور وہ سسرال میں بھی اپنے ماں باپ اور عزیزوں کے لیے کس قدر تڑپتی ہے اور جب کوئی آ پہنچتا ہے تو ہر طرح اس پر نچھاور ہوتی ہے۔ یہ اس زمانے کی معاشرت تھی۔ بے تو آج بھی لیکن آج اس کی مثال خال ہی پائی جاتی ہے۔ دنیا میں جب کوئی ٹھکانہ نہ رہ جائے تو بھی وہ ٹھکانا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں کہاوت کچھ اور ہی ہوگی۔ (٦) غالباً اس معاشرے میں ایسا نہیں تھا۔ وہ اتنا زیادہ سائنسی اور جدید نہیں ہوا تھا۔" یہ اقتباس اس امر کی شہادت دیتا ہے۔

"وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹیکلے مجھ پر سے صدقے کیے۔"

صدقہ دینے یا صدقہ اتارنے کا رواج اس معاشرے میں عام تھا۔ اس سے ایک دوسرے کے لیے کسی کی محبت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں ناشتے میں یا کھانے میں کیا کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوشحال طبقہ ہی ہوتا تھا۔ غرباء میں یہ توفیق کسے ہوتی ہے اگرچہ وہاں بھی

بدنامی حاصل ہوگی اس پر بھی باز پرس روز قیامت کی ہوا چاہیے۔" یہاں روزِ قیامت کو ماننے والا معاشرہ تسلیم کیا جائے گا اور خدا کی ذات سے کوئی بات بڑی بات نہیں . . . . یہ آخری تیر نشانے پر بیٹھا کیونکہ بادشاہ خداترس تھا اور خداترسی بادشاہ کا بڑا وصف قرار پائی تھی اور دن کو بندوبست ملک کا اور انصاف عدالت غریب غرباء کی اور رات کو خدا کی عبادت اور درود پیغمبر روح پاک کو نثار کر کر . . . . . . وزیر کا فرض ادا ہوا اور بادشاہ گوشہ نشینی سے نکلا اور دوسرے دن سے دربار کرنے کا حکم دیا۔

دنیا سے بے رخی دل میں بیٹھی تھی کہ ایک رات چپکے قلعے سے باہر نکلے اور ایک گورستان میں جا پہنچے اور درود میں مصروف تھے کہ دور ایک شعلہ سا دکھائی دیا۔ اس جانب ہو لیے۔ نزدیک پہنچنے پر چار فقیروں کو کفنیاں گلے میں ڈالے خاموش بیٹھے دیکھا۔ تحمل کو مناسب جانا اور ایک کونے میں چپکے جا بیٹھے کہ ایک فقیر کو چھینک آئی (چھینک آنے پر خدا کا شکر ادا کرنا یہ کسی زمانے سے رواج پائے ہوئے ہے۔ لیکن یہ معاشرت اور تہذیب کی شائستگی کو ظاہر کرتا ہے) اور رات کے پہاڑ ہونے کا احساس نے سرگذشتیں کہنے کی ترغیب دی۔

سیر پہلے درویش کی

بات کہنے کا مہذب اور شائستہ طریقہ یہی ہوا کرتا تھا کہ دوزانو ہو جائے اور مناسب لہجے میں کہنے والی بات کہی جائے۔

"پہلا درویش دوزانو ہو بیٹھا اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔ "یا معبود اللہ ذرا ادھر متوجہ ہو اور ماجرا اس بے سروپا کا سنو۔"

اس زمانے میں تجارت کا جو انداز ہوتا تھا اس بیان سے معلوم ہوتا ہے۔

"اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے۔"

سوداگرزادوں کی تربیت اور تعلیم میں پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب فن، سوداگری

بساط بھر بلکہ بساط سے بھی زیادہ کیا جاتا رہا ہوگا۔ جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔

صبح کو شربت اور لوازمات حلوا سوہن، البتہ مقوی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک تو پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان قلیے، کباب تحفہ۔ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلایا کرتی۔

اور یہ بہن ہی کے احساسات ہیں جس کی نظر میں ماں باپ ہمیشہ ہی اونچی رہنی چاہیے۔ یہ ہندوستانی معاشرے ہی کی بہن ہو سکتی ہے کوئی اور معاشرہ اس قسم کے جذبات کہاں پیدا کر سکتا ہے۔ یہ روحانیت پر مبنی معاشرے ہی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

"ایک دن وہ بہن (جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی) کہنے لگی اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی ـــــ نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے ایسا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر جیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے سب کے سب تمہارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت کو کھا کر اب بہن کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی ہے اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔"

بہن کے وہ کلمات جو اس نے اپنے بھائی کے لیے استعمال کیے ہیں محاورے کے طور پر بہت مشہور ہیں اور ایسے موقعوں پر اس کی اپنی ایک الگ اہمیت سمجھی جاتی ہے۔ اور ایک بہن کے دلی جذبات اور احساسات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں کہ وہ اپنے بھائی کو اپنی نگاہوں سے دور کرنے کے لیے تیار نہیں مگر روایات دنیوی سے پریشان ہو کر اپنے بھائی کو خود سے جدا کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور کمانے کے لیے آمادہ کرتی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں وہی معاشرہ نہیں بلکہ کوئی بھی معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مرد بغیر کسی کام کے یعنی روزی کمائے بغیر گھر پر بیٹھے رہیں۔

اور رخصت کرنے کا کیا منظر ہے اچھے اچھوں کا دل دہل جاتا ہے۔

"جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سیر پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہودے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو بھر کر بولی۔ سدھارو۔ انھیں خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا۔ تمہارا بھی اللہ حافظ ہے میں نے قبول کیا۔"

کسی کو رخصت کرنے کا منظر اس سے بہتر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شر پاؤ بھاری ایک گھوڑا جڑاؤ ساز کھانے پینے کا سامان یہ سب چیزیں اس دور کی تہذیبی اور معاشرتی قدروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس زمانے میں ریل گاڑی نہیں تھی اس لیے عام طور پر گھوڑوں پر ہی سفر کیا جاتا تھا اور مسافت کا خیال رکھتے ہوئے راستے کا بندوبست کیا جاتا ہوگا۔

دہی کا ٹیکا کرنا نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں یہ عام ہوگا اس لیے داستان نگار کا ذہن اس طرف رجوع ہوا اس کے ساتھ ساتھ امام ضامن کا روپیہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے تم کو خدا کے حوالے کیا۔ یہ رسم آج بھی بہت سے گھرانوں میں پائی جاتی ہے۔

رات کا ایک حصہ گذر جانے پر شہر کے پھاٹک بند کر دیے جاتے تھے اور پھر کسی کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی یہ پہلے زمانے میں شہروں کے انتظام کا ایک ضروری حصہ ہوا کرتا تھا۔ دیر سے آنے والوں کو شہر پناہ سے باہر ہی رہ کر صبح کرنی پڑتی تھی

بھلائی اور محبت کا بدلہ ظلم اور بے وفائی ہونے پر انصاف خدا کو سونپا جاتا[۷] تھا۔ ایک خدا پرست معاشرے میں مظلوم کا شیوہ یہی ہوا کرتا تھا مگر یہاں تو اس ظلم کا شہزادی خود ہی انتقام لے لیتی ہے۔ شاید اس لیے کہ شہزادی اس وقت مظلوم اور مجبور نہ رہی تھی۔ یہ ہر زمانے ہی کا دستور رہا ہے۔ یقیناً اس معاشرے میں بھی رائج رہا ہوگا۔

برے بھلے کی زبان سے نجات یعنی رسوائی اور بدنامی سے چھٹکارا پانے کا خیال سب ہی کو رہتا تھا۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی خصوصیت ہے۔ خصوصاً شرفا کے طبقے میں اس کا احساس کہیں زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اور کوئی سماجی لغزش ہو جانے پر چرچا ہو جاتا تھا کہ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا) اس جانکنی میں شہزادی زخمی حالت میں مبتلا رہی ہے۔ (۸)

کہیں جراح کی رحمدلی اور خدا پرستی سے بھی معاشرے کے اس غالب عنصر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ فقیر نے کچھ اس انداز سے بات بتائی کہ اس کی رحمدلی اور خدا پرستی جوش میں آگئی اور وہ ساتھ ہو لیا۔ زخموں کو دیکھ کر صحت یابی کی نوید دی۔ لیکن ایسے باکمال روپے پیسے سے تو بے نیاز ہوتے ہیں۔ انھیں صرف خدا پرستی ہی کسی جانب مائل کرتی ہے۔ اس نے مریضہ کی قوت کے لیے مرغ کا شوربا اور گلاب کے ساتھ عرق بید مشک دینے کو کہا اور اسے عطر پان دے کر رخصت کیا۔

غالبًا اس دور میں بھی مہمان کی خاطر تواضع اور رخصت کے وقت عطر پان دینے کا رواج رہا ہوگا۔ یہ قدیم معاشرے ہی کی باتیں ہیں۔ اب تو محض تکلف اور تصنع میں شمار ہونے لگی ہیں۔

شہزادی کو شفا ہوتے ہی غسل شفا دیا گیا اور عیسٰی جراح کو خلعت اور اشرفیوں کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ اس خوشی میں خیر خیرات بھی کی اور شہزادی کی خوشی کو معمول بنایا گیا۔ چونکہ شہزادی بھی اس لیے اول تو التفات سے دیکھتی ہی نہیں تھی۔ اگر کبھی دیکھتی تو یہی کہتی "خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ ماریو۔ جو ہم کہیں سو بلا عذر کیے جائیو۔ اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو نہیں تو پچھتاوے گا۔

کیونکہ شہزادی ہے اس لیے اس کا یہ اندازِ گفتگو فطری ہے لیکن معاملہ صرف اندازِ گفتگو کا نہیں ہے بلکہ ان معاشرتی اقدار کا بھی ہے جن میں امتیازات کو نمایاں طور پر دخل تھا کوئی اپنے آقا کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا اور اس کی گفتگو میں کسی کی یہ مجال نہ تھی وہ دخل دے سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری تھا کہ جو کچھ کہا جائے اس کو بے چون وچرا

تسلیم کر لیا جائے اور پورے ادب اور احترام کے ساتھ اور جذبہ وفا کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ شہزادی بہرحال جنس لطیف ہے اور غیر مرد کے ساتھ رہ رہی ہے اس لیے فاصلے کا قائم رکھنا ضروری ہے۔

اپنے مرتبے کو نظر انداز کر کے پھر فقیر صاحب تو پہلے ہی دن سے اس کے والا و شیدا ہو گئے تھے انھیں تو سب کچھ نچھاور کرتے ہوئے اس کی خوشی کرتے ہی رہنا تھا۔

جب سوداگر فقیر شہزادی کا خط لے کر اس کے بتائے ہوئے پتے پر جاتا ہے اور دربان سے خط کا ذکر کرتا ہے تو اس کی اطلاع پر حبشی جوان باہر آتا ہے۔ یہ محلوں میں حبشیوں اور حبشنوں کا غلاموں اور پہریداروں کی حیثیت سے رکھا جانا عام رواج تھا۔ یہ غلام ہی ہوتے تھے اور غلامی کی روایت افریقوں (حبشیوں) ہی سے بنیادی طور پر وابستہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مصلحت بھی ہو تو اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

محلوں سے اشیاء کا بھیجا جانا کشتیوں میں جن پر خوان پوش پڑے رہتے تھے ضروری ہوتا تھا۔ (۹) شہزادی نے وہ کشتیاں دیکھ کر کہا "لے گیارہ بدرے اشرفیوں کے لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے" بہ ذرائع اور وسائل ہوتے ہوئے "خدا رزاق ہے" کہا جانا اس پورے معاشرے کی وضاحت کرتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی عقیدہ نچلے طبقے سے اعلیٰ طبقے تک پایا جاتا ہوگا۔

شہزادی کچھ رقم جواہر کی بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لینے کو کہتی ہے (۱۰) جب سوداگر فقیر بتائی ہوئی دکان پر جاتا ہے وہاں عجیب رنگ دیکھتا ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لیے دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔

بڑھایا ہوا ہاتھ دوستی کا قبول نہ کرنا تہذیب اور شائستگی اور رواداری کے منافی جانا تھا۔ اس لیے سوداگر فقیر نے یوسف سوداگر[۱۱] سے منافرت نہ برتی اور اس کی دعوت قبول کر لی۔ اگر شہزادی کی تنہائی کا خیال کر کے چند در چند عذر کیے۔ شہزادی نے بھی کہا "وعدے کو وفا کرنا چاہیئے اور یہ سنت رسول کی ہے۔"

نا و نوش کا شغل ہوا اور دورِ جام ہو جانے کے بعد چار خوبصورت لڑکے زلفیں کھولے ہوئے شریکِ محفل ہوئے اور انھوں نے اپنے گانے بجانے میں سماں باندھ دیا (۱۲) اور یوسف سوداگر کچھ نشے کے کیف اور کچھ کافی کی یاد میں اپنے اوپر ضبط نہ رکھ سکا اور اس کی آنکھوں سے دو چار قطرے بہہ نکلے اور اپنی معشوقہ کو شریکِ محفل کرنے کی سوداگر فقیر سے اجازت چاہی (۱۳) اور سوداگر فقیر کی رضامندی پر یوسف سوداگر نے اشارہ کیا اور ایک کالی موٹی بھینس پاس آن بیٹھی (۱۴) اور تین دن تین رات شغلِ مجلس رہا۔ چوتھے دن کی صبح کو اس احساس کے ساتھ رخصت کیا۔ (۱۵)

جاگیرداروں یا امیروں کے یہاں ضیافت کا اہتمام کس طرح ہوتا تھا اس کی ایک اجمالی تصویر اس بیان میں موجود ہے۔ محفل میں رقص کرنے کے لیے صرف طوائفیں نہیں آتی تھیں بلکہ نو عمر لڑکے بھی جن کو امرد کہا جائے محفل ہائے نشاط کی زینت بنتے تھے اور اپنے ناچ رنگ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اہلِ محفل ضیافت میں شریک ہونے سے پہلے لباسِ فاخرہ زیب تن کرتے تھے اور پر تکلف دعوت کے بعد نشہ، شراب یعنی ساغر و مینا کا دور چلتا تھا۔

اس موقع پر یوسف سوداگر کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت میں بھی اپنی محبوبہ کو فراموش نہیں کرتا اور اس کی یاد میں تڑپ اٹھتا اور اس کو محفل میں بلانے کے لیے فقیر سے اجازت طلب کرتا ہے اس لیے کہ ہر کس و ناکس کو بغیر اجازت کے شریکِ محفل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں قصہ نگار یہ بھی دکھلاتا ہے کہ یوسف سوداگر کی محبوبہ انتہائی بدشکل عورت تھی۔ اس لیے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراء میں عشق پسندی اور عورت پرستی کا جذبہ رفتہ رفتہ ان حدود میں داخل ہو گیا تھا جہاں یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس حسن پرستی نے ان کے جنسی جذبے پر بے محابہ یا عورت پرستی کے علاوہ کسی جمالیاتی حس کو دخل نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ حبشی عورتیں جو پہر بیداری کے لیے ملازم رکھی جاتی تھیں رفتہ رفتہ امراء کا جنسی جذبہ یہاں تک آگے بڑھ گیا ہو کہ وہ

انھیں یا ان جیسی کسی عورت کو منظورِ نظر بنا لیں اور اپنا شریکِ خلوت کریں۔

ہم قدیم تاریخوں اور قصوں میں اس طرح کے واقعات پڑھتے بھی ہیں کہ جہاں کوئی ملکہ یا شہزادی اپنے حبشی غلام پر عاشق ہو جاتی ہے یا سلاطین امراء کالی کلوٹی عورتوں کے ساتھ عشق کرتے ہیں اور وہ ان کے شریکِ خلوت ہوتے ہیں۔

گھر پہنچنے پر شہزادی کے معذرت چاہنے پر تقصیر معاف کر دی اور کہا جب آدمی کسو کے گھر جاتا ہے اور تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے۔ (۱۶) لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چکے ہو رہو گے یا اس کا بدلہ بھی اتارو گے۔ گویا فرض ہو گیا کہ جیسی ضیافت ملی ہے اس سے دو چند ضیافت دی جائے یعنی میل جول برابر کی سطح سے ہونا چاہیئے۔ یک طرفہ تواضع میں تو دوسرے کی بات نہیں ہوتی ہے ایک تو یہ تہذیبی روایات کا تقاضہ تھا، دوسرے شہزادی کی مصلحت بھی تھی وہ یوسف سوداگر اور اس کی محبوبہ سے انتقام کا موقع بھی چاہتی تھی۔ سوداگر فقیر شہزادی کے تعمیلِ ارشاد میں جوہری کو دعوت دے گیا۔ بہت کہنے سننے پر وہ راضی ہوا۔ گھر پر پہنچا تو توقع سے باہر انتظام تھا اور خوشامدید اور خیر مقدم کے لیے لوگ آمادہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہر مکان میں فرش اور مسند ہے اور تواضع کا سامان ہے یعنی پان دان، گلاب پاش، عطردان، پیک دان، چنگیر، نرگس۔ ان سب قرینے سے دھرے ہیں اور طاقوں میں پھل پھلاری، میوے خشک و تر موجود ہیں۔ آراستگی کا وہ رنگ کہ کیا نہیں ہوگا۔ خادم اپنی اپنی جگہ مستعد۔ سب اسباب شاہانہ طے اور کنچنیاں بھانڈ، بھگتیے، کلاونت، قوال اچھی پوشاک پہنے سازوں کے سر ملاتے ہیں یہ سب کچھ تھا مگر شہزادی کہیں نہیں۔ پھرتے پھرتے باورچی خانے میں سوداگر فقیر گیا تو وہ حسن کی دیوی ضیافت کی خبر گیری میں لگی ہوئی تھی۔

اس سارے ساز و سامان، آراستگی و پیراستگی اور سلیقہ و قرینہ دیکھ کر علی عباس حسینی صاحب کی یہ بات درست ہو جاتی ہے "دہلوی داستان گو اپنی داستانیں دہلی کے دربار کے ماحول سے سمجھاتا ہے اور اس معاشرت کا نمونہ پیش کرتا ہے جو قلعہ معلیٰ میں رائج تھی۔ لکھنؤ کا داستان گو جب سماں کھینچتا ہے وہی طمطراق وہی شان و شکوہ، وہی آن بان وہی

سیر و تفریح، وہی عیش و عشرت، وہی تعلق، وہی سخن طرازی جو اس وقت کے درباروں کی خصوصیت تھی۔" (١٧)

حالانکہ سوداگر فقیر تعلق اور خوشامد میں غلو کرتا ہے مگر شہزادی اسے اس کے مرتبے پر رکھتی ہے اور اسے آگے بڑھنے سے ذرا سے اندیشے پر بھی روک دیتی ہے۔ (١٨)

یوسف سوداگر کی معشوقہ کو بھی ایک خوجے کو بھیج کر بلایا گیا اور آدھی رات گئے وہ چڑیل، خاصے جوڑوں پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آپہنچی۔ گویا اس کے یہ چڑیلوں اور بھوتوں کی طرح آدھی رات گئے کا ہی آنے کا وقت تھا۔ ان دونوں کو محو اختلاط دیکھ کر ایک شخص کنارے سے بولا "یار و عشق اور عقل میں ضد ہے" اور جو کچھ عقل میں نہ آوے یہ کافر عشق کر دکھاوے لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھو۔ سبھوں نے کہا! آمنا یہی بات ہے۔

تین شبانہ روز گذرنے پر اور سوداگر فقیر کے عذر مہمان داری پر کھانے پینے میں یا سیر و تماشے میں شہزادی کے خوف سے رجوع نہ ہوئے۔ (١٩) تم بھی تو ہمارے پاس بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ چونکہ مہمان کی خاطر رکھنا ضروری تھا اس لیے شریک ہوگیا اور تھوڑی دیر میں سب بے خبر اور سوداگر فقیر بھی بے ہوش ہوگیا۔ (٢٠)

خوجے دراصل خواجہ سرا ہوتے ہیں۔ یہ وہ مرد ہوتے تھے جو امرا کے زنان خانوں اور شاہی حرم سراؤں میں کام کرتے تھے اور طبی آپریشن کے ذریعے جنھیں جنسی قوت سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ یہاں اس لیے آدھی رات کو خواجہ سرا اسے بلانے کے لیے گیا ہے۔ اس کی طرف سے امانت میں خیانت کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ یوسف سوداگر کی محبوبہ کا آدھی رات کے وقت آنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن عورتوں سے ناجائز تعلقات ہوتے تھے ان کو رات گئے اس وقت بلایا جاتا تھا جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا تھا۔

یہاں قصہ نگار نے یہ کہہ کر کہ وہ اس طرح آئی جیسے آدھی رات چڑیلیں آیا کرتی تھیں اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس زمانے میں بھوتوں اور چڑیلوں اور چھل پیریوں جیسی مخلوق پر یقین کیا جاتا تھا اور توہم پرست لوگ اسے آج بھی مانتے ہیں۔

دوسری صبح عالم ہی اور تھا۔ حویلی خالی، ایک کونے میں پڑے ہوئے کمبل میں کچھ لپٹا

ہوا دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں کے سر کٹے پڑے ہیں۔ سوداگر فقیر حیران تھا کہ وہ خواجہ سرا دکھائی دیا جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا۔ کل معاملہ دریافت کرنا چاہا خواجہ سرا نے کہا "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل۔

صبح کو بالاخانے کی ایک کھڑکی سے اس شہزادی نے دیکھا اور پھر ایک خوجے نے مسجد میں جا کر بیٹھ رہنے کو کہا۔ اور شام کو خواجہ سرا ایک باغیچے میں بٹھا کر وہیں بیٹھے رہنے کو کہہ کر چلا گیا۔ مگر ہجر کا ہر ایک لمحہ گراں ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ نہایت ناخوشی سے بولی کہ اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے اپنا اسباب درست کرکے وطن کو سدھارے۔ (٢١)

اور چالیس دن تک شہر کی کوچہ گردی یا جنگل نوردی رہی (گویا یہ بھی کوئی چلّہ کھینچا گیا ہو) آخر اپاہج ہو کر اس مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا۔ وہی خواجہ سرا آیا نماز پڑھ کر بے توجہ چلا تو سوداگر فقیر نے متوجہ کیا۔ اس نے ترس کھایا اور اپنے ساتھ شہزادی کے روبرو لے گیا۔ جب لایا گیا تو شہزادی بولی "تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا اب اور کیا کہنا چاہتا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔" (٢٢) وہ تین بار گرد پھرا اور سامنے آکر کھڑا ہوا اور کہا غریب نوازی کرکے اس عاجز کو قبول کر۔ ... اپنی قدم بوسی سے خادم کو سرفرازی دیجیے۔" ایک لمحہ تو سن کر غوطے میں گئی پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا "بیٹھو۔ تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی جو کچھ کہو سو بجا ہے اور اپنے بھی دل پر نقش ہے۔ خیر ہم نے قبول کیا۔" نکاح تو ہوگیا لیکن اس واردات عجیب سے جی میں اس سے زیادہ بے کلی تھی۔ آٹھ دن تک قرب کے باوجود قرب نہ ہوا جب شہزادی نے کچھ خفگی سے کہا "یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے اس کو کیا کہتے ہیں۔ اگر تم میں قوت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہوس لگائی۔ اس پر سوداگر فقیر نے اپنی بے کلی کا اظہار کیا۔ آخر سوداگر فقیر کی خاطر عزیز رکھ کر سب سرگزشت کہہ دی اور یوسف سوداگر اور چڑیل اس کی محبوبہ کا قصہ سنایا۔

تین کا عدد یوں بھی ہر طرح سے مقدس ہے اور سامنے کھڑے ہونے سے پیشتر طواف کے انداز میں کسی کے گرد چکر لگانا اس دور کے آداب حضور میں سے تھا اور جس سے صدقے قربان ہونے کے جذبے کا اظہار کیا جاتا تھا۔

اب سے کچھ زمانے پہلے تک جب صدقہ اتارا جاتا تھا تو صدقے میں دے جانے والے شگون یا اشیاء کو تین بار اس شخص کے گرد گھمایا جاتا تھا جس کا صدقہ اتارنا مقصود ہوتا تھا۔ آرتی اتارتے وقت بھی آرتی کے تھال کو تین بار جنبش دی جاتی تھی۔

چونکہ وہ دمشق کی شہزادی تھی اس لیے اپنی پرورش اور تربیت کا وہ حال بیان کیا جو شہزادیوں کے ہوا کرتے ہیں۔ اس میں بھی دلی کے محلوں جیسی تصویر ہے۔ قسم قسم کی خادمائیں ہوتی تھیں دائی دوا چھو چھو کر لگا۔ ہوتے ہوتے شہریت الخیال طبیعت کی بحالی کے لیے لانے والے لڑکے سے بے تکلفی ہو گی اور خواجہ سرا کو اس کی تربیت کے لیے سپرد کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ کیا سے کیا ہو گیا اور شہزادی کے دل میں اتر گیا۔ خواجہ سرا کے ذریعہ چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کروادی۔ اور محل کے قریب اچھی حویلی بنوادی اور ہر طرح کا انتظام کروادیا۔ اس نے تجارت میں بڑی ترقی کی لیکن شہزادی کو اس کی جدائی گوارا نہ ہوتی تھی اور محل سے اس کی حویلی تک ایک سرنگ لگوائی "تاکہ ملنے کی صورت ہو جائے"۔ شام سے آجانا اور ساری رات عیش عشرت میں گزارتے ہوئے صبح کے تارے کی نموداری پر واپس بھجوادیا جاتا۔

آداب محفل اور رسوم معاشرت کی بجاآوری میں سلیقہ برتنا اور خوبصورتی کو باقی رکھنا ضروری تھا اس لیے ان میں کوئی کمی یا کوتاہی ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ایسے غلاموں یا خادموں، رقاصوں، موسیقی کاروں اور خدمت گزاروں کی بھی بڑے پیمانے پر تربیت کی ضرورت ہوتی جن کو سلاطین امرا کے دربار یا خلوتوں میں باریابی کا موقع ملتا تھا۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں دوا لانے والے لڑکے سے ذرا سی غلطی ہوئی تو اس کو خواجہ سرا کے سپرد کیا گیا کہ وہ اس کی تربیت کرے۔ اسے موقع پر بھی سزا دی جا سکتی تھی اور دی جاتی تھی۔

ایک دن وہ خواجہ سرا کے ساتھ نہ آیا دوبارہ بھیجا تو وہ بھونڈی سی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا اور آخر بتایا کہ ایک سرسبز باغ ہے عمارت عالی، تالاب حوض وغیرہ کے ساتھ اور ایک لونڈی بھی۔ یہ دونوں ساتھ بکتے ہیں۔ باغ ایک لاکھ کا اور باندی پانچ لاکھ کی اور دوسرے دن خواجہ سرا سے وہ باغ اور باندی خرید وادی۔ ایک دن موسم خوش گوار

پاکر شہزادی نے سرور کیا اور اس باغ میں جانے کا خیال ہوا اور ایک دائی کو ساتھ لے کر اس لڑکے کے یہاں پہنچ گئی۔ وہاں کے عالم نے باغ کی کیفیت کو بھلا دیا۔ سارے کا سارا شاہانہ ٹھاٹھ باٹ اور پھر باغ کے بالاخانے پر گئے وہاں شہزادی خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی کہ نہایت بھونڈی سی ایک رنڈی شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے آگئی دل مکدر ہوا ناخوشی مزاج پر چھا گئی۔ دو چار پیالے اس لڑکے کو دیے اور ایک پیالہ شہزادی نے اس کی خاطر پیا۔ دونوں نامعقول حرکتیں کرنے لگے۔ شہزادی کو بڑی غیرت آئی پھر بھی اس کی دوستی کے باعث چپ ہو رہی لیکن وہ دو پیالے اور چڑھا گیا۔ (۲۳) آخر ناخوش ہو کر وہاں سے شہزادی اٹھی۔ اپنے انجام کا خیال کر کے اس کا کام تمام کرنے کے درپے ہوا۔ اور منت زاری کرنے لگا۔ اور ایسی تیز شراب کے دو پیالے خود بھی پیے اور شہزادی کو دیئے۔ وہ بے ہوش ہوئی تو اس نے شہزادی کو تلوار سے گھائل کر دیا اور مردہ جان کر چھوڑ دیا لیکن شہزادی عشق کی ماری تھی اس نے اسے پھر بھی بچانا چاہا۔ دوبارہ بے ہوشی آپڑی تو اس نے ایک صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار سے نیچے اتار دیا۔ اس کو بھی شہزادی کرم کی ریکھا کہتی ہے۔ (۲۵)

شہزادی کی اس واردات سے دو تین باتیں ذہن میں آتی ہیں سب سے پہلے یہ کہ بادشاہ زادیوں یا امرا اور روسا کی عورتوں کے ایسے لڑکوں سے بھی عشق ہوئے جو ان کے ملازم ہوتے اور ان کی ہر بات پوری کی جاتی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا ان کا داؤ دوسروں پر عیاں نہ ہو۔ اس وجہ سے خواجہ سرا یا دوسری کنیزیں ان عورتوں سے ملی ہوئی تھیں اور یہ اس زمانے کی تہذیب کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اس کے علاوہ جہاں یوسف سوداگر باغ اور اس کے ساتھ باندی خریدنے کا ذکر کرتا ہے وہاں ذہن اس طرف رجوع ہوتا ہے کہ اس طرح کی باتیں رفتہ رفتہ کہاوتوں کا درجہ اختیار کر گئی تھیں۔ ایک چیز کے حصول کے لیے دوسری چیز کو شرط قرار دیا جاتا تھا جس کی قیمت کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اب یہاں باغ کی قیمت زیادہ ہونی چاہیے مگر اس سے بھی کہیں زیادہ قیمت باندی کی رکھی گئی ہے۔ جس کی خریداری کو باغ کی خریداری کے ساتھ ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ کچھ ایسی ہی کہانی اس کہاوت سے بھی وابستہ ہے۔ جس کو (اونٹ کے گلے

میں بلّی) کہا جاتا ہے۔ اس میں اونٹ کی قیمت سو ٹکے مگر بلی کی قیمت سوا لاکھ ٹکے ہے اور یہ اونٹ بلی کے ساتھ ہی خریدا جا سکتا ہے۔

بعض مرتبہ آداب محفل کا خیال رکھتے ہوئے شہزادیوں کو بھی شراب پینا پڑتی تھی یہاں یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا اس معاشرے میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ شراب پیتی تھیں یا محض کبھی کبھی ہی ایسا کیا کرتی تھیں۔

یہاں بہت سی داستانوں اور قصوں سے عورتوں کی بے وفائی کا پتہ چلتا ہے وہیں یہ کہانی مردوں کی بے وفائی کا ایک اچھا ثبوت پیش کرتی ہے۔ یعنی معاشرے میں خاص کر عورتوں اور مردوں دونوں ہی میں برابر کا وفاداری اور بے وفائی کا جذبہ موجود تھا جو ایک فطری چیز ہے۔

جب شہزادی اس کو بھی کرم کی ریکھا کہتی ہے تو یہ خیال یقینی ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرہ تقدیر پرست معاشرہ ہی کہا جا سکتا ہے یا اس معاشرے میں مجبور اور بے بس ہی کے لیے یہ صورت تھی اور اس طرح وہ اپنے دل کی تسکین چاہتے تھے۔ یوسف سوداگر اور وہ چڑیل ہی تھے جو اس رات اپنے انجام کو پہنچے اور شہزادی کا منصوبہ ٹھیک بیٹھا۔

شہزادی نے سوداگر فقیر سے شہر سے کہیں دور چلنے کو کہا اور تھوڑی رات رہتے پر شہزادی کو مردانہ لباس میں پانچوں ہتھیار لگائے ہوئے ایک گھوڑے اور دوسرے پر سوداگر سوار ہو کر ایک راہ لی اور کئی دن سفر کرتے رہنے پر ایک دریا یکایک راہ میں پڑا۔ اگرچہ سفر صعوبت کا تھا مگر سوداگر فقیر کو شہزادی کی محبت میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ کچھ دیر کنارے پر کھڑے رہنے اور شہزادی کو وہیں بٹھا کر ناؤ کی تلاش میں گیا۔ شہزادی بھی کچھ دم لینا چاہتی تھی وہ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی جب کوئی انتظام نہ ملا تو مایوس لوٹا۔ شہزادی کو وہاں نہ پایا تو دیوانہ سا بھٹکنے لگا۔ خیال ہوا کہ کوئی جن اٹھالے گیا۔ (۲۷) طرح طرح کے گمان گزرتے تھے۔ اور شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا جینا بیکار جانا جنگل میں ایک پہاڑ پر چڑھ گیا اور اپنے تئیں گرانے کا ارادہ کیا کہ ایک سوار سبز پوش منہ پر نقاب ڈالے کہتا تھا (۲۸) خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے۔ تھوڑے دنوں میں تین درویش

تیری ہی طرح ملک روم میں ملیں گے وہاں کا بادشاہ آزاد بخت جب چاروں درویشوں کو ملے گا تو اس کی اپنی اور چاروں درویشوں کی مرادیں حاصل ہوں گی۔

اس دور کی کہانیوں میں جو کچھ ہوتا ہے اچانک ہی ہوتا ہے اور خلاف توقع ہی پیش آتا ہے۔ یہاں اس تھوڑے سے وقفے میں جب فقیر کشتی کی تلاش میں نکلتا ہے اور شہزادی دم لینے کے لیے پیپل کے درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھتی ہے تو اچانک اکیلے غائب ہو جانے کا حادثہ پیش آتا ہے۔ وہ کیسے غائب ہوئی کہاں گئی، کون اس کو اٹھالے گیا۔ یہ سب سوال ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کا ایک جواب جو فقیر کے دماغ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی جن اس کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ جواب اس معاشرے کے لیے سادہ اور آسان بھی ہے اس لیے کہ وہ جن اور بھوتوں پر یقین رکھتا ہے۔ اور سسپنس پیدا کرنے میں ان مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی میں روایتی یقین اس کا معاون ہوتا ہے۔

پیپل کا درخت ہندوؤں کے یہاں مقدس مانا جاتا ہے اور رات کے وقت جب اس کے پتے کھڑکتے ہیں تو شب کے سناٹے میں ایک پُراسرار کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہانی کہنے یا لکھنے والے کے پیش نظر یہ بات بھی رہی ہو۔ یوں بھی جن اور بھوت ویران اور تنگ و تاریک مقام پر رہتے ہیں اس کے ساتھ برگد اور پیپل جیسے درختوں کی شاخوں پر بھی ان کے رہنے کا تصور عام ہے۔

سیر دوسرے درویش کی

دوسرا درویش اپنے وطن فارس کا تعارف "اصفہان نصف جہاں" کی مثل کہہ کر کراتا ہے اور اسے ساتوں سیاروں میں برا اعظم قرار دیتا ہے۔ اس بیان کو وطن کی محبت کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ چودہ برس کا سن جسے بلوغت کا آغاز قرار دیا جاتا ہے کسب علم و فن کی بادشاہوں اور امیروں کے یہاں ایک منزل بھی مانی جاتی ہے۔ عام طور پر شہزادے اور امیرزادے اس عمر تک اپنی تعلیم و تربیت مکمل کر لیا کرتے تھے اور آداب مجلس میں باسلیقہ ہو جاتے تھے۔

شہزادہ درویش نے ایک صاحب داں سے حاتم طائی کا قصہ سنا جو انسانی خدمت کے سبب اتنا نامور ہوگیا تھا کہ اس سے نوفل بادشاہ عرب کو حسد ہوگیا اور وہ اس کے ملک پر حملہ آور ہوا۔ حاتم تو خدا ترس اور انسانوں کو تکلیفوں سے بچانے والا تھا، اپنے نام انسانوں کی تباہی کا عذاب لکھوانے کے بجائے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا اور نوفل نے اس کو پکڑ لانے کے لیے انعام کا ڈھنڈورا پھروا دیا۔

حاتم کی گپھا کے پاس ہی ایک بوڑھے اور ایک بڑھیا کو باتیں کرتے ہوئے سن لیا کہ "ہمارے دن کچھ بھلے آتے تو ہم حاتم کو کہیں دیکھ پاتے اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا اور ہم آرام سے کھاتے۔ اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔" بوڑھے کے ڈانٹ دینے پر بڑھیا نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی۔ حاتم نے مردی اور مروت سے بعید جانا کہ ان دونوں کو ان کے مقصد پر نہ پہنچائے۔ وہ گپھا سے باہر آ کر بوڑھے سے بولا۔ میں حاتم ہوں مجھے نوفل کے پاس لے چل وہ تجھے جو روپے دینے کا اقرار کیا ہے دیوے گا۔ اب بوڑھے کے دل میں خدا کا خوف آیا اس نے کہا میں کتنے دن وہ مال کھاؤں گا۔ اتنے میں اور لوگ آ گئے اور وہ حاتم کو نوفل کے پاس لے گئے۔ بوڑھا اور بڑھیا بھی پیچھے گئے۔ جب نوفل کو حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے حاتم کی ہمت اور سخاوت کی داد دی اور جھوٹے دعوے کرنے والوں کو سزا دی۔

اس قصے کی روح دوسرے درویش کی سرگزشت میں شروع سے آخر تک دوڑتی ہے اور نیکی پر یقین رکھنے والے معاشرے اور معاشرت کا پتہ دیتی ہے۔ دوسرے درویش نے اس قصے کے سبق کو پلے باندھا اور انسان کی خدمت کو اور سخاوت کو ابدی زندگی کا راز جانا۔

چالیس دروازے کی بلند اور کشادہ عمارت شہر سے باہر بنوائی اور صبح سے شام تک ضرورت مندوں کی ضرورتیں مہیا کرنے لگا۔ ان سب چالیسوں دروازوں سے لوگ آتے اور باہر واپس جاتے۔ ایک فقیر باری باری ہر ایک دروازے سے آیا اور اشرفیاں لے گیا۔ چالیسوں دروازوں سے اشرفیاں لے جانے کے بعد پھر پہلے دروازے سے آیا۔ شہزادے نے درویش سے کہا تو کیا فقیر نہیں کہ فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں فقیر کو عمل ان

پر چاہیئے (ف۔ فاقہ۔ ق۔ قناعت۔ ر۔ ریاضت) یہ خیرات احتیاج دفع کرنے کے واسطے ہے جمع کرنے کے لیے نہیں۔ فقیر کو چاہیئے ایک روز کی فکر کرے۔ وہ برہم ہوا اور جو کچھ لیا تھا سب زمین پر ڈال دیا اور بولا سخاوت کا نام پھر نہ لیجو۔ سخی ہونا بہت مشکل ہے تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اس منزل کو کب پہنچو گے سخی کے بھی تین حرف ہیں پہلے ان پر عمل کرو تب سخی کہلاؤ گے۔ (س۔ سمائی۔ خ۔ خوف الٰہی۔ ی۔ یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو) ابھی دلی دور ہے (۲۹) اس فقیر نے بہت ملکوں کی سیر کی ہے لیکن سوائے بصرہ کی بادشاہ زادی کے کوئی سخی دیکھنے میں نہ آیا۔ شہزدے درویش نے بہت منتیں کیں اور کہا جو چاہو سو لو مگر وہ فقیر یہ کہتا ہوا چلا گیا اگر اب ساری بادشاہت بھی دے تو اس پر نہ تھوکوں۔ وہ جا چکا تو بصرے کی شہزادی کا خیال دل کو بے کل کرنے لگا اور اسے دیکھنے کا جنون ہوا۔

وسطی عہد میں چالیس کا ہندسہ اور وہ بھی محلات کی صورت میں ایک عام ہندسہ رہا ہے جس کی طرف ذہن قصر چہل ستون سے بھی منتقل ہوتا ہے۔ یہ علاءالدین کا مشہور محل تھا جو بالگمان غالب جنوبی ہند کے محلات کی نقل پر بنایا گیا تھا۔ ایک اور موقع پر بھی ہم چالیس کا لفظ علامتی طور پر سامنے آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ علی بابا کے ساتھ وابستہ چالیس چور ہیں۔ چلہ کشی میں بھی چالیس دن شامل ہیں اس کے ساتھ ہم چہلم کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ جس کو چالیسواں بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ خیال بھی آتا ہے کہ وسطی عہد میں اعداد و شمار گویا بیس تک پہنچے تھے۔ اس لیے کہ ہاتھ پیروں کی انگلیاں ملا کر بیس ہوتی تھیں اس لیے دو بیسی کہہ کر تعداد کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہاں بھی گویا عدد شمار کا دو کا عدد پیش نظر رہا ہے۔

وہ عہد اشاروں پر یقین رکھتا تھا اور ہر بات کو مطلق انداز کی حیثیت سے مانتا تھا۔ اختیار کو بھی وفاداری کو بھی۔ داد دہش کو بھی اس لیے فقیر چالیس دروازوں کے باوجود اس آزمائش کو اپنے لیے جائز سمجھتا ہے کہ وہ نئے سرے سے دریوزہ گری شروع کر دے اور یہ دیکھے کہ دینے والا کہاں تک دیتا ہے۔ فقیر اور سخی کے ہر حرف کے معنی بیان

کیے گئے ہیں وہ بھی اس دور کے طریقۂ فکر کو سمجھنے میں تمہیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے تصورات صوفیانہ کتابوں میں بھی مل جاتے ہیں۔

فقیر نے جس طرح اس دولت کو پھینک دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر فیصلہ انتہا پر پہنچ کر ہوتا تھا اور پھر ذکر کیا تو یہ ہے کہ سخاوت اور داد و دہش بصرے کی شہزادی پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی وہ اس شہزادے سے بھی کوئی بڑی چیز ہے جو چالیس دروازوں سے بخشش کرتا تھا۔

یہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دریوزہ گری اس زمانے میں کوئی معیوب بات عام طور پر نہیں تھی۔ مانگنے والا اہل سخاوت پر اپنا حق سمجھتا تھا اور اہل سخاوت بھی بڑھ چڑھ کر داد سخاوت دینے کو اپنے لیے باعث فخر اور وجہ امتیاز تصور کرتے تھے۔ اس صورت حال نے اس زمانے میں درویش سے ہٹ کر فقیری اور دریوزہ گری کو بھی ایک ادارہ بنا لیا تھا۔

بادشاہ دنیا سے رخصت ہوا۔ شہزادہ درویش باپ کی جگہ بادشاہ بنا۔ وزیروں اور امیروں سے کہا بصرے کا سفر کرنا چاہتا ہوں، تم اپنے کاموں میں مستعد رہو، زندگی رہی تو جلد پھر آؤں گا۔ کوئی جانے سے خوش نہ ہوا۔ سب کو کہے بغیر وزیر کو مختار وکیل مطلق کر کے گیروا لباس تن پر کیا اور بصرے کی راہ لی اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں اس سرحد میں جا پہنچا۔ رات کو جہاں قیام کرتا اس ملک کے نوکر چاکر استقبال کرتے اور معقول مکان میں ٹھہرا کے ضیافت کے لوازمات موجود کرتے اور خدمت میں حاضر رہتے۔ ہر منزل پر یہی ہوا۔ آخر بصرے میں داخل ہوا کہ ایک شخص قریب آکر بولا میں فقیروں کا خادم ہوں، اور اس تلاش میں رہتا ہوں جو کوئی مسافر فقیر یا دنیا دار آوے اس شہر میں میرے گھر میں قدم رنجہ فرمائے۔ (۳۰) شہزادے درویش نے نام پوچھا تو بیدار بخت بتایا۔ ایک دالان میں لے جا کر بٹھایا۔ گرم پانی سے ہاتھ پاؤں دھلوائے۔ دسترخوان بچھا کر قسم قسم کے کھانے روبرو پیش کر دیئے۔ (چار۔ شقاب۔ ایک میں یخنی پلاؤ، دوسری میں قورمہ پلاؤ، تیسری میں متنجن پلاؤ، چوتھی میں کوکو پلاؤ۔ اور ایک قاب زردے کی اور کئی طرح کے قلیے، دوپیازہ،

نرگس، بادان، روغن جوش اور روٹیاں کئی قسم کی۔ باقر خانی ــــ شیرمال، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، نان، پراٹھے اور کباب کوفتے کے تکے مرغ کے۔ شیرمال، خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگی، دم پخت[1]، حلیم، ہریسہ، سموسے ورقی، ــــ فرنی، شیر، ملائی، فالودہ، ــــ آب شورہ، ساقی عروس[2]، نوزبات[3]، مربا، ساجسار، دان، دہی کی قلفیاں) ظاہر ہے اتنے کھانوں کو دیکھ کر روح ہی بھر گئی ہوگی۔ ایک ایک نوالہ ہی سے پیٹ بھر گیا لیکن وہ شخص بولا آپ نے کھایا ہی کیا ہے سب امانت ہی دھرا ہے۔

ان کھانوں کے ناموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں کھانے میں یہ تکلفات برتے جاتے تھے اور کوئی دعوت ان بیشتر تکلفات سے خالی نہ ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ امیر کے لیے ہی نہیں فقیر کے لیے بھی۔ یہ سخاوت کا اہتمام اس معاشرے میں پایا جاتا تھا۔ ان تمام کھانوں میں ایرانی کھانوں کے بھی نام شامل ہیں جن سے ہندوستان میں ایرانی کھانوں کا دستور پایا جاتا تھا۔ یعنی ہندوستانی اور ایرانی تہذیب بڑی حد تک مشترک تھی۔

دسترخوان اٹھا کر بڑے تکلف سے ہنس دان میں خوش بو بیسن دے کر گرم پانی سے ہاتھ دھلائے اور سیارے پان اور لونگ الائچیاں چاندی کے ورقوں میں بڑی ہوئی لا کر رکھیں۔ جب پانی پینے کو مانگا جاتا برف میں لگی صراحی آب دار لے آتا۔ شام کو فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن ہوتیں۔ وہ عزیز بیٹھا ہوا باتیں کرتا رہا جب پہر رات گئی بولا۔ اب اس چھپر کھٹ میں آرام کیجئے۔ شہزادہ فقیر نے کہا " اے صاحب بنایا ہے۔ وہ بولا یہ سب اسباب درویشوں کی خاطر ہے کچھ میرا مال نہیں۔

آخر میں شہزادے اور درویش کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے قطع نظر کہ وہ بھی فقیر درویش کے ارادے کے لوازمات کا اظہار کرتی ہے۔ باقی باتیں وہ ہیں جن سے اس عہد کی شاہی یا جاگیردارانہ معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے بعد ناشتے کے ذکر میں جو باتیں کی گئی ہیں وہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

امیروں کے یہاں بیسن یا کھلی سے ہاتھ دھوئے جاتے تھے اس سے مچھلی جیسی چیز کی بدبو بھی دور ہو جاتی ہے اور غریبوں کے یہاں سوندھی مٹی سے۔ راکھ سے ہاتھ دھونے

کا رواج کبھی کبھی دیکھا جا سکتا ہے

شہزادہ درویش نے کہا لیکن میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر کہو تو رقعہ سربہ مہر اپنے مطلب کا لکھ دوں وہ حضور ملکہ کے پہنچا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایک رقعہ لکھ کر دے دیا۔ "جیسی خوبیاں اور نیک نامیاں ملکہ کی سن کر اشتیاق دیکھنے کا ہوا تھا اس سے چار چند پایا ۔ ۔ ۔ ۔ میں دنیا کے مال کا محتاج نہیں اپنے ملک کا میں بھی بادشاہ ہوں۔ فقط یہاں تک آنا اور محنت اٹھانا آپ کے اشتیاق کے سبب ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ اب ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خاک نشین مطلب دلی کو پہنچنے کے لیے ہے آگے جو مرضی مبارک ۔ ۔ ۔ ۔ مجنوں اور فرہاد کی مانند جنگل میں یا پہاڑ پر مر رہے گا۔ (۳۴)

بلوایا گیا۔ محل کی ڈیوڑھی پر ایک بوڑھی عورت گئی۔ دست بستہ ایستادہ خدمتگاروں کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس مہربانی سے سلام کیا اور بیٹھنے کو کہا اور ایک ساعت کے بعد بولی۔ "بادشاہ زادی نے سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ مجھ کو خاوند کرنے سے عیب نہیں۔ تم نے میری درخواست کی لیکن اپنی بادشاہت کا بیان کرنا اور اس فقیری میں اپنے تئیں بادشاہ سمجھنا اور اس کا غرور کرنا عبث ہے چاہے اس لیے کہ سب آدمی آپس میں فی الحقیقت ایک ہیں لیکن فضیلت دین اسلام کی البتہ ہے اور میں بھی ایک مدت سے شادی کرنے کی آرزو مند ہوں اور جیسے تم دولت دنیا سے بے پروا ہو میرے تئیں بھی حق تعالیٰ نے اتنا مال دیا ہے کہ جس کا کوئی حساب نہیں۔ پر ایک شرط ہے کہ پہلے مہر ادا کر لو اور مہر شہزادی کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے دن بتائے جانے کے وعدے پر رخصت ہو کر شہزادہ درویش باہر آ گیا۔

مہر نکاح کی شرائط کا ایک حصہ ہے جس کا تعلق اب تو ہماری نظر میں صرف مذہب سے ہے اس سے بیشتر وہ گویا ازدواجی تعلقات کا ایک حصہ رہا ہے جو خلعت جنس یا کسی اور صورت میں لڑکی کے ماں باپ کو دیا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ خود لڑکی کو دیا جانے لگا۔ روایتی دستور اور روایتی طور پر آج تک رائج ہے۔

شام کو کھانے پر محل میں بلوایا گیا اور کھانے کے بعد شہزادے نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی داستان کہنی شروع کی۔ اس داستان کی تحقیق بادشاہ زادی نے اپنا مہر مقرر کیا

ہے کہ شہر نیمروز کے لوگ سیاہ پوش کیوں ہیں۔ وہ جوان پری زاد کون ہے جو زرد بیل کی سواری پر آتا ہے۔ گل اندام پری چہرہ شہر کے لوگوں کو کیا دکھاتا ہے جو وہ دہاڑ مار کر روتے ہیں۔ وہ جوان اس غلام کا سر کاٹ کر جدھر سے آتا ہے ادھر چلا جاتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے اور شہزادہ درویش سے کہا اگر اس نوجوان کی خبر لا سکو تو قصد نیمروز کے ملک کا کرو۔ نہیں تو گھر کی راہ لو۔

ملکہ سے گفتگو کے دوران اس کے ملک میں مہمان داریوں پر خرچ بے حساب کا ذکر کرتے ہوئے کہا اگر گنج قارون ہو تو بھی وفا نہ کرے۔ قارون کا خزانہ ایک کہاوت بن کر تہذیب کا حصہ بن گیا۔ ہندوستان کی تہذیب میں ایک، کہاوت کی عمر یقیناً اتنی تو ضرور ہے کہ جتنی اسلامی ادب کی ہندوستان میں آمد کی ہے۔ ملکہ نے یہ جاننے کے لیے کہ یہ سب خرچ کہاں سے پورا ہوتا ہے ایک دن اور قیام کے لیے کہا۔

دائی بیان کرنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک روز بادشاہ نے جشن فرمایا۔ ساتوں لڑکیاں سولہ سنگھار بارہ ابھرن، بال بال گج موتی پرو کر بادشاہ کے حضور میں کھڑی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ آرائش کا انداز ہندوستانی تہذیب ہی کا حصہ ہے اس طرح ہندوستانی خواتین قدیم زمانے سے حویلیوں اور محلوں میں سنگھار کرتی رہی ہیں اور شریک دربار رہتی تھیں۔ یہ ملکہ سب بہنوں میں چھوٹی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہنوں کے ساتھ ان کی گفتگو میں شریک نہ ہوئیں۔ (پوچھنے پر بولیں) اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر معاف ہو تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گذارش کرے۔ حکم ہوا کہ کہہ کیا کہتی ہے تب ملکہ نے کہا کہ قبلۂ عالم آپ نے سنا ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں ۔ ۔ ۔ جس بادشاہ خلق الخلائق نے آپ کو بادشاہ بنایا اسی نے مجھے بھی بادشاہ زادی کہلوایا اس کی قدرت کے کارخانے میں کسو کو اختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے۔ حضرت کے قدم مبارک کی خاک کو اگر سرمہ کروں تو بجا ہے۔ مگر نصیب ہر ایک کے ساتھ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بادشاہ نے طیش میں آ کر ایک جنگل میں پھنکوانے

کا حکم دے دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو پکاریں وضو کو پانی لانا اور رات کی بات اس کے ساتھ یاد آگئی۔ تیمم کرکے دوگانہ شکر کا پڑھا۔ تین دن تین راتیں گذر گئیں۔ جنگل پھنکوا دینا یا جنگل میں پیدا ہونا یا کسی ویرانے میں چھوڑ دینا ایک قدیم روایت ہے۔ حضرت سارا نے اپنی سوتن حضرت ہاجرہ اور ان کے بچے اسمعیل کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا اور حضرت اسمٰعیل اپنے بیوی بیٹے کو ایک سنسان جگہ پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں باپ نے سزا کے طور پر اپنی چھوٹی بیٹی کو ایک ویرانے میں چھڑوا دیا ہے۔ یہیں سے قدرت الٰہی کا کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس میں بیک وقت دو تہذیبیں مل گئی ہیں ایک ہندوی تہذیب یا پھر قدیم ویرانی تہذیب۔ دوسرے حصے میں جو بادشاہ کا کردار ہے بڑی حد تک ہمیں مغل بادشاہوں کے کردار کی جھلک ملتی ہے۔ جو اپنے بیٹوں کو سزا دینے پر تیار ہو جاتے تھے چنانچہ خسرو پرویز کی آنکھوں میں سلائی جانگیر کے قلم سے پھیری گئی تھی جس کے بعد یہ شہزادہ اندھا ہو گیا تھا اس میں بادشاہ کے مطلق العنانیت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کی رائے کے معاملے میں کچھ کہنے کی جراءت اس کی اولاد کو بھی نہیں ہوئی تھی اس لیے مغل شہزادے جب ایک خاص عمر کو نہیں پہنچ جاتے تھے ان کو دربار میں حاضری کی اجازت نہیں ملتی تھی کہ کہیں ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہو جائے جو شاہی آداب اور دستور کے خلاف ہو (حضرت خضر کے کردار پر اس سے پہلے گفتگو آ چکی ہے)

چوتھے روز صبح ایک درویش خضر کی سی صورت ...... آکر پیدا ہوا ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا "اے بیٹی اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی تھا..... یہاں سے اور ملکہ کے بادشاہ کو جواب سے قسمت پر عقیدہ رکھنے کا معاشرہ سامنے آتا ہے۔ اور خدا پرستی اور خدا پر بھروسہ ایمان کا جزو ٹھہرتے ہیں۔

اس کے بعد کی کہانی کچھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ جیسے ہر بات خود بخود برائے غیب سے ظاہر ہوتی ہے جس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ شہزادی جب کنگھی کر رہی تھی تو اس کے بالوں میں سے ایک سچے موتی کا جھڑنا اور پھر مکان کی تعمیر کے

وقت زمین کھودتے ہوئے خزانے کا نکل آنا اور اس کے نتیجہ میں جنگل میں منگل ہونا کئی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے اور اس خیال کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب تقدیر ساتھ دیتی ہے تو مٹی سونا بن جاتی ہے اور جب مقدر کے ستارے اپنا رخ بدلتے ہیں تو لاکھ کا گھر خاک ہو جاتا ہے۔

شہر نیمروز پہنچا تو جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ خاص و عام سب سیاہ پوش تھے۔ چاند کی پہلی کو شہر کے سب چھوٹے بڑے ایک میدان میں جمع ہوتے۔ اس طرح سے گاؤ سوار آیا اور سب کام پہلے کی طرح سے ہو جانے کے بعد سب لوگ شہر کو واپس چلے گئے۔ درویش حواس باختہ سب کچھ کھڑا دیکھتا رہا۔ ہوش آیا تو پچھتانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا اور مہینہ بھر بعد اس میدان میں پہنچ گیا۔ جوان غلام کو قتل کرکے جیسے مڑا درویش اس کے پیچھے ہو لیا۔ شہریوں نے بہت منت سماجت کی زور کیا لیکن شہریوں نے جانے نہ دیا۔ اور ایک مہینہ اور انتظار کھینچا اور نماز کے وقت ہی اس جوان کی راہ کے جنگل میں گھس کر چھپ گیا جب وہ واپس پھرا دوڑتا دھوپتا اس کے پیچھے ہو لیا اور آہٹ پاکر وہ باگ موڑ کر نعرہ لگاتا ہوا تلوار کھینچے درویش کے سر پر آ پہنچا۔ حملہ کرنے سے پہلے ادب سے نہایت جھک کر سلام کیا اور دست بستہ کھڑا رہا۔ وہ بولا "تو ناحق مارا گیا ہوتا پر بچ گیا۔ .... اور درویش کے سامنے جڑاؤ خنجر موتیوں کا اور آویزہ لگا ہوا کمر سے نکال کر پھینکا اور کہا نقد موجود نہیں جو تجھے دوں اس کو بادشاہ کے پاس لے جا جو تو مانگے گا ملے گا۔ مگر درویش جان سے ہاتھ دھو کر پھر پیچھے ہو گیا۔ اگرچہ یہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ پھر مڑا اور درویش کے قتل کا ارادہ کیا مگر کسی دھمکی کا خیال نہ کرکے پیچھے ہو لیا اور دو کوس جنگل طے کرکے ایک چار دیواری دکھائی دی جوان کے ایک نعرہ کے ساتھ دروازہ کھلا۔

جس طرح یہاں شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور ایک جوان آتا اور ایک غلام کا سر اڑا دیتا ہے۔ مغربی ملکوں میں اور خاص طور پر رومن سلطنت میں اس طرح کے کھیل عام رہتے ہیں۔ انسانی قتل کے اس تماشے کو لوگ اسی طرح شوق سے دیکھتے تھے جیسے آج

کھیل تماشے دیکھے جاتے ہیں۔ مختلف قبائل میں جانوروں کی قربانی میں بھی یہ تماشہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ اب تک تلوار چلانے کے جو کرتب اکھاڑوں میں دکھلائے جاتے ہیں ان میں بھی ان مناظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں جو نوجوان آکر غلام کو قتل کرتا ہے وہ بیل پر سوار ہوتا تھا۔ دنیا میں بیل صرف شوجی کی سواری رہا ہے اور وہ اس بیل پر سوار ہو کر نکلتے ہیں تو ان کا وہ روپ سامنے آتا ہے جو مہیش کا ہے۔

آگے چل کر جوان جس محل میں داخل ہوتا ہے اس میں بہت سی کوٹھریاں ہیں جس میں سب پر کنڈیاں چڑھی ہوئی ہیں ان میں غلام قید ہیں کنڈیاں کھلتی ہیں تو یہ غلام باہر آتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غلام اس وقت کے شاہی نظام میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں ان کا قتل بھی بہت عام ہے اور ان کے ہاتھوں قتل کے واقعات بھی تاریخ کے انوکھے واقعات میں سے نہیں ہیں یہاں ان کو اسی طرح قیدی محکوم اور مجبور دکھلایا گیا ہے جیسے کہانیوں اور داستانوں میں جن بھوت قید ہوئے ہیں۔ بڑے قلعوں میں شاہی محلات سے باہر اسے بہت سے حجرے یا چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے جاتے تھے جن میں بادشاہ کی حفاظت کے لیے فوج رہتی تھی اس طلسمی کہانی کا پس منظر یہی قلعے اور یہی غلام اور یہی مطلق العنان حکمراں ہیں۔ درویش کو بھی دیا۔ اس کے غلاموں کو رخصت دے دی۔ جب کوئی نہ رہا تو وہ بولا "اے عزیز! تجھ پہ کیا ایسی آفت آئی ہے جو تو اپنی موت کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔" درویش نے کل احوال کہہ سنایا۔ وہ سنتے ہی ٹھنڈی سانس بھر کر بے ہوش ہوا اور کہنے لگا عشق کے درد سے تیرے سوا کون واقف ہے اور ہوش میں آکر ایک آہ جگر سوز کی سارا مکان گونج گیا۔

شاہی قلعوں میں حفاظت اس پیمانے پر بھی ہوئی کہ پرندہ پر نہ مار سکے۔ آخر یہ محاورہ اسی تاریخی پس منظر سے جنم لیتا ہے اسی لیے جب درویش وہاں پہنچا ہے تو شہزادہ اس سے کہتا ہے کہ تیری موت تجھے یہاں لائی ہے۔ ایک اور اہم بات یہاں پر نعرے کے گونجنے کی ہے۔ قلعے کچھ اس طرح بنائے جاتے تھے کہ کہیں دور اگر تالی بھی بجائی جاتی تھی تو

لہریں اسے اس مقام تک پہنچا دیتی تھیں جس کو بالا حصار۔ یا فلک نما کہا جاتا تھا۔ گول کنڈے کے قلعے میں ہم اسی طرز تعمیر کے عجائبات دیکھتے ہیں۔

درویش اس کی سرگزشت معلوم کرنا چاہی تاکہ پہلے اس کے لیے کچھ سعی کی جائے اس نے اپنے عشق کا حال کہہ سنایا۔ وہ نیمروز سلطنت کا بادشاہ زادہ تھا۔ جس کی پیدائش کے بعد نجومی اور رمال نے بادشاہ کے حکم سے سوچ بچار کر کہا نیک ساعت اور سعد لگن ہے سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیرواں سا عادل ہو اور کل علم و ہنر میں کامل ہو۔ سخاوت اور شجاعت میں حاتم اور رستم سے زیادہ نام پیدا کرے مگر چودہ برس تک سورج اور چاند دیکھنے سے یہ خطرہ نظر پڑتا ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کر بہت آدمیوں کا خون کرے۔ بستی سے جنگل میں نکل جاوے۔ اس کے مطابق ایک باغ اور مکان منفرد ہر ایک نقشے کے بنوائے اور تہ خانے میں پرورش دی جانے لگی۔ اوپر ایک برج نما مکان تیار کروایا کہ دھوپ اور چاندنی اس میں پہنچے۔

دس برس کے بعد ایک روز اس گنبد کے نیچے روشن دان سے ایک پھول صورت کلی کا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ لوں۔ ہاتھ لمبا کرنے پر اونچا ہو جاتا۔ حیران تک رہا تھا کہ ایک قہقہے کی آواز آئی۔ دیکھنے کو گردن اٹھائی۔ دیکھا تو۔۔۔

۔۔۔ ایک مکھڑا چاند سا نکل رہا ہے۔ دیکھ کر عقل و ہوش بجا نہ رہے۔ ذرا سنبھلا تو دیکھا پری زادوں کے کاندھوں پر ایک تخت معلق کھڑا ہے اور ایک تخت نشین یاقوت کا پیالہ لیے اور شراب پیے بیٹھی ہے۔ تخت برج میں اتر آیا۔ پری نے نزدیک بلا کر بٹھایا اور پیار کی باتیں کیں اور منھ سے منھ لگا کر ایک جام شراب گل گلاب کا پلایا اور کہا آدمی زادہ بے وفا ہوتا ہے (۳۵) لیکن دل ہمارا تجھے چاہتا ہے۔ اس کی ناز انداز کی باتوں سے دل محو ہو گیا اور اس دن دنیا میں آیا ہوا جانا۔ یہ کیف کے لمحے تھے کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ چار پری زادے آسمان پر سے اتر کر اس پری زادے کے کان میں کچھ کہا اور خدا نگہبان کہہ کر چلی گئی اور پھر ملنے کو کہہ گئی اور بتایا جنوں کی بیٹی ہوں اور کوہ قاف میں رہتی ہوں۔ (۳۶) بادشاہ کو حیرانی اور پریشانی کی خبر ہوئی۔

اس پوری عبارت میں ہم اس زمانے کے طلسمی ماحول اور انسانوں سے جنوں اور پریوں کے عشق دلچسپی کی پرکشش واردات کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا ہوا دیکھتے ہیں. تخت یاقوت، پری زادوں کا ہجوم یہ منظر نامہ کسی نثری اور شعری داستانوں میں موجود ہے داستان بے نظیر اور بدر منیر میں بھی ہم نسبتاً ادب کا یہ روپ دیکھ سکتے ہیں. اسی کے ساتھ پیدائش کے موقع پر جنم پتری کا تیار ہونا اور شبھ لمحے کے ساتھ ایسے اشبھ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا جس میں شہزادہ کسی آفت کا شکار ہو جائے گا اور یہ خطرہ چودھویں سال میں ہوگا یہ بھی داستانوں میں عام طور پر مل جاتا ہے اور جنم پتری تیار کرنے کی رسم اب بھی جاری ہے.

باپ نے صدقہ دلوائے مگر قسمت کا لکھا ٹالے نہ ٹلتا تھا. تین سال گذر کر چوتھے میں ایک سوداگر آ نکلا. بادشاہ نے کسی ایسے حکیم کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا "ہندوستان میں دریا کے بیچ ایک پہاڑی ہے وہاں ایک گوسائیں دھاری نے بڑا مندر مہادیو کا اور سنگت اور باغ بڑی بہار کا بنایا ہے. برسویں دن شیورات کے روز اپنے استھان سے نکل کر دریا میں پیرتا ہے اور خوش کرتا ہے. اشنان کے بعد جب اپنے آسن پر جانے لگتا ہے تب برباد اور درد مند دیس اور ملک ملک کے جو دور دور سے آتے ہیں دروازے پر جمع ہوتے ہیں .... قارورہ اور نبض دیکھتا ہوا ہر ایک کو نسخہ لکھ کر دیتا ہوا چلا جاتا ہے.

مندروں کے سامنے تالابوں کا ہونا ہندوستان کی ایک عام روایت ہے ایسے جل کنڈوں کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی آتا ہے. بمبئی کے ایلیفنٹا غار اسی طرح کی ایک تعمیر ہے. آشرم بالعموم پرفضا مقام پر ہی بنائے جاتے تھے اور وہاں جسموں کے روگی چاہے نہ آتے ہوں لیکن روح کے مریض تو آتے تھے. افلاطون کے تذکرے میں بھی ہم اسی طرح کی باتیں سنتے ہیں. دلچسپ بات صرف ہندوستان کا حوالہ ہے اور یہاں کے ایک کردار کی پیش کش آشرموں میں پھل دار درخت ہوتے تھے یہاں بھی آگے چل کر اس کا ذکر آیا ہے. مگر عشق کا زور وہیں رہا اور اس پری کی صورت نظروں میں بسی رہی. وہیں طاق میں

ایک کتاب تھی جس میں دنیا اور دین کے سارے علم تھے. حکمت اور تسخیر کے علم میں قوت بہم پہنچائی. برس گذر گیا اور برسوان دن (شیورات کا روز) آیا. جوگی نے قلم دان سپرد کیا اور ساتھ چلنے کو کہا. امیر اور سوداگر جو ساتھ آئے تھے گوسائیں کے بہت شکر گذار ہوئے. جوگی کی واپسی پر ایک شکیل جوان غول میں نظر آیا. اسے ضعف سے کھڑے ہونے کی طاقت نہ تھی. کہا اسے ساتھ لے جاؤ خلوت خانے میں کھوپڑی اس کی تراش کر کنکھجورا جو مغز پر بیٹھا تھا زنبور سے اٹھا لیوے. شہزادہ بولا دست پناہ آگ میں گرم کر کے پیٹھ پر رکھیں تو آپ سے آپ نکل آوے گا اور جو یوں کھینچے گا تو مغز کے گودے کو نہ چھوڑے گا. پھر خوف زندگی کو ہے. یہ سن کر جوگی نے شہزادے کی طرف دیکھا اور چپکا اٹھا، باغ کے ایک کونے میں ایک درخت کوسے میں پکڑ جٹا کی لٹ کی گلے میں پھانسی لگا کر رہ گیا.

درخت سے الگ کرنے پر دو کنجیاں اس کی لٹوں میں سے گر پڑیں. ان کنجیوں کو سب قفلوں میں لگایا. دو حجرے کے قفل کھل گئے. دیکھا تو جواہر بھرا ہوا ہے اور ایک پیٹی مخمل سے مڑھی سونے کے پتر لگی قفل دھری ہے. اس میں ایک کتاب دیکھی اس میں اسم اعظم اور حاضرات جن و پری کے اور روحوں کی ملاقات اور تسخیر آفتاب کی ترکیب لکھی ہے.

یہ طلسمی روایت اسی نوع کی دوسری روایتوں سے کچھ زیادہ دلچسپ ہے. یہ نوعیت قصوں میں ہے کہ راستہ میں تو درویش یا پیر مرد ملا اس نے تعویذ دیا اسم اعظم بتلایا لیکن یہاں ایک ہندو درویش کا قصہ ہے جو کسی ایسے شخص کی کھوپڑی سے جس میں کنکھجورا گھس گیا تھا جو تدبیر کرتا ہے اس سے بہتر عمل کے سامنے آنے پر وہ خودکشی کر لیتا ہے اس وقت اس کی لٹوں سے جو چابیاں گرتی ہیں ان سے کھولنے والی کوٹھریوں میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے. کوٹھریوں میں ہیرے جواہرات ملنا بہت معمولی بات ہے اور داستانوں میں یہ کوئی عجوبہ واقعہ سمجھ کر اسے نہیں دیکھا جا سکتا. زیادہ دلچسپ معنی خیز اور خیال آفریں سادھو کی خودکشی اور اس کی موت کے بعد خزانوں کی کنجیاں ملنا ہے جسے ہم آج کے اعتبار سے دیومالائی کہانی کے ساتھ ایک علامتی کہانی کا روپ دے سکتے ہیں. ہندو سادھو خاص طور پر جو پہاڑوں کی گپھاؤں میں خلوت نشین ہو جاتے تھے عام طور پر جٹائیں رکھتے تھے. یہ

جتائیں برگد کی طرح ان کی لمبی زندگی کا نشان مصنوعی تھیں اور ان کے علم اور تجربے کا بھی۔ اسی میں وہ طاق بھی جس میں ایک ایسی کتاب رکھی ہے جس میں ساری دنیا کے علوم و فنون جمع ہیں اور اسم اعظم تحریر ہے اسے ہم تخیل اور تمثیل کا ایک حسین مرقع کہہ سکتے ہیں۔

اس نے باغ کو نئے سرے سے بنوایا اور جنوں کی تسخیر کے چلے کھینچے۔ چالیس دن پورے ہونے پر آدھی رات کو آندھی آئی۔ بڑے مکانات گر گئے درخت جڑ سے اکھڑ گئے اور پری زادوں کا لشکر دکھائی دیا۔ تخت اترا جس پر ایک شخص تاج اور خلعت پہنے بیٹھا تھا۔ وہ بولا یہ کیا تو نے ناحق دند مچایا۔ ہم سے تجھے کیا مدعا ہے۔ اس نے کہا یہ عاجز بہت مدت سے تمہاری بیٹی پر عاشق ہے اور اس لیے اپنی جان پر کھیلا ہوں جو یہ کام کیا ہے۔ ص (۳۹)

شیطان کے ورغلانے پر پری کو چھاتی سے لگا لیا اور قصد جماع کا کیا۔ ویسے ہی آواز آئی کہ یہ کتاب مجھ کو دے کہ اس میں اسم اعظم ہے بے ادبی نہ کر۔ اس مستی کی حالت میں وہ کتاب دے دی۔ یہ نہ دیکھا کہ کسے دی جا رہی ہے۔ وہ پری یہ حرکت دیکھ کر بولی۔ "آخر چوکا اور نصیحت بھولا" پھر وہ بے ہوش ہو گئی اس کے سرہانے ایک دیو کتاب لیے کھڑا تھا پکڑنا چاہا لیکن دو سرا کتاب لے کر بھاگا۔ افسوں پڑھنے وہ جن جو کھڑا تھا بیل بن گیا۔ پری ہوش میں نہ آئی عیش تلخ ہو گیا اور آدمیوں سے اس روز سے نفرت ہو گئی۔

خواب ہماری زندگی کا بہت ہی دلچسپ اور معنی خیز حصہ ہے جس میں انسانی نفسیات کی بہت سی پیچیدگیاں چھپی رہتی ہیں اگر دیکھا جائے تو اس طرح کے قصے خوابوں کو لفظی پیکروں میں ہمارے مشکل کر دیتے ہیں اور دیومالائی روایتیں نئی شکلیں اختیار کرے ہماری آنکھوں کے سامنے آئی ہیں جس میں انسان ہزار خواہش اور کوشش کے باوجود غلطیاں کرتا ہے۔ عشق و ہوس کا شکار ہوتا ہے اور غیبی امداد کے تحت آفتوں سے نجات پاتا ہے۔ ناممکن ممکن ہو جاتا اور ممکن باتیں ناممکنات کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ تعویذ، گنڈے، فلیتے، نقش اور اسم ایسے افکار اور ایسی قدروں کی علامت ہیں جو سیکڑوں ہزاروں برس سے انسانی زندگی کا حصہ ہیں اور آج بھی جن سے غیر معمولی

تعلق اور عقیدت کے رشتے جڑے ہوئے ہیں اکثر قصوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور اس لیے ہوتا ہے کہ سنسکرت اور ہندی میں ہر قصہ پر آخر سکھ آنت ہوتا ہے دکھ آنت نہیں۔

درویش اپنے مطلب کو چھوڑ کر اس شہزادے کو مطلب تک پہنچانے کے لیے جنگل پہاڑ ایک مدت تک بھٹکتا رہا۔ اور پہاڑ پر سے گر کر ختم ہونے کا ارادہ کیا لیکن سوار برقع پوش آ پہنچا اور جان کھونے کو منع کیا اور بامراد ہو جانے کی امید دلائی۔

سرگزشت آزاد بخت بادشاہ کی

دوسرے دن صبح چوب دار کو بھیج کر چاروں درویشوں کو بلا لیا۔ بادشاہ نے گذشتہ رات کو ساری کہانی کہہ سنائی اور چاہا کہ دو کی سن چکا اور دوسرے دو کی سننا چاہتا ہوں اور چند روز کی مہمانی قبول کریں کہ قدم درویشاں رد بلا ہے۔ چونکہ بادشاہ خدا ترس ہے اور وہ رحم خدا کا مطلوب ہے اس لیے درویشوں کا آنا درد مند ہوا۔ چونکہ درویش ساتھی رعب سے خاموش ہو رہے تھے اس لیے آزاد بخت نے اپنی داستان شروع کی تاکہ انھیں حوصلہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ اپنی داستانیں کم و کاست بغیر کسی ڈر یا خوف کے کہہ سکیں اور اس سے بادشاہ کو گذاری احوال واقعی بھی منظور ہوا۔

بادشاہ بننے پر بدخشاں سے ایک سوداگر آیا۔ طلب کیا تحفے ہر ایک ملک کی نذر کے لیے آیا۔ ایک ڈبیہ میں ایک لعل پانچ مثقال پیش کیا۔ ایسا جواہر کبھی نہیں دیکھا۔ کسی سے سنا بھی نہیں تھا۔ انعام و اکرام اور راہداری کی سند دے کر رخصت کیا۔

سوداگر کی معاشرے میں کیا حیثیت تھی اور بادشاہ بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ وہ آداب سلطنت سے واقف ہوتے تھے اس لیے تقریر اور خوش نوائی میں ہنرمند رہتے تھے کیونکہ بیشتر بادشاہوں اور درباروں ہی سے انھیں واسطہ رہتا تھا۔ پھر چونکہ وہ دیس دیس پھرنے والے تھے اس لیے دنیا کے حالات ان سے جاننے کی بھی دلچسپی رہتی تھی۔ تحفہ تحفہ چیزیں لائق بادشاہوں کے تو ان کے پاس ہوتی ہی تھیں۔ (ع۔ ز)

لعل تھا تو تحفہ لیکن ایسا نہ تھا کہ اور کہیں ویسا تھا ہی نہیں۔ دربار میں ہر ملک کے ایلچی آئے ہوئے تھے۔ وہ لعل فرنگی ایلچی کو دکھایا اس نے خوشنودی کے خیال سے بہت تعریف کی اور سب نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بات کی۔ بادشاہ کے والد بزرگوار کے وقتوں کا وزیر بھی موجود تھا۔ جان بخش کی اجازت کے بعد بولا "بادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رنگ ڈھنگ سنگ میں لافانی ہے لیکن سنگ ہے اور اس دم سب ملکوں کے ایلچی دربار میں حاضر ہیں۔ جب اپنے اپنے شہر میں جاویں گے البتہ یہ نقل کریں گے کہ عجب بادشاہ ہے کہ ایک لعل کہیں سے آیا ہے اسے ایسا تحفہ بنایا ہے کہ ہر روز روبرو منگاتا ہے اور آپ اس کی تعریف کرکر سب کو دکھاتا ہے۔ پس جو بادشاہ یا راجا احوال سنے گا اپنی مجلس میں کہے گا۔ خداوند۔ ایک ادنیٰ سوداگر نیشاپور میں ہے اس نے بارہ دانے لعل کے ہر ایک سات سات مثقال کا ہے۔ پٹے میں نصب کرکر کتے کے گلے میں ڈال دیئے ہیں۔"

یہ حقیقت تھی اور دانائی کی بات تھی جو ایک وزیر کو کرنا ہی چاہیئے تھی۔ کیونکہ اس کو دربار اور بادشاہ کا ناموس عزیز تھا اور وہ کوئی ایسی بات پسند نہ کر سکتا تھا جس سے دوسرے ملکوں میں اس کی ہنسائی ہوتی۔ لیکن بادشاہ مزاج کا بادشاہ ہوتا ہے، اپنی بات بھرے دربار میں نیچی ہوتے کیسے گوارا کرتا۔ غضب میں آکر حکم دیا۔ "اس وزیر کی گردن ماردو۔" فرنگ کے ایلچی نے دست بستہ کہا۔ جھوٹ بولنا بڑا گناہ ہے اور وہ بھی بادشاہوں کے روبرو۔ لیکن جھوٹ ثابت نہیں ہوا۔ شاید جو کچھ کہا گیا ہے سچ ہوئے گناہ کا قتل درست نہیں۔ بادشاہ نے کہا یہ بات خیال میں نہیں آتی کہ ایک سوداگر جو اتنی محنت اور مشقت کرتا ہے۔ سات سات مثقال کے لعل کتے کے پٹے میں لگوائے ایلچی نے کہا ایسے تحفے اور جواہر جو سوداگروں اور فقیروں کے ہاتھ آتے ہیں۔ یہ دونوں ملکوں ملک پھرتے ہیں جہاں سے کچھ پاتے ہیں لے آتے ہیں۔ وزیر بادشاہوں کی عقل ہوتے ہیں اور یہ حرکت بادشاہوں سے بدنما ہے قصوروار ایسا ہی ہے تو حکم قید کا ہو کہ ابھی جھوٹ سچ اس کا ثابت نہیں ہوا۔ تمام عمر کی خدمت اور نمک حلالی نہ بھول جانی چاہیئے۔

وزیر کے کیا فرائض ہوتے تھے اور ملکوں کے ایلچی بھی بادشاہ اور وزیر کے کردار سے آگاہ ہوتے تھے۔ اور بادشاہ بھی ملکوں کے ایلچیوں کی بات کو وزن دیتے تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی غضب میں کیوں نہ ہو۔ آدمی کا کردار بادشاہ کا کردار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ بنیادی طور پر آدمی ہی ہوتا ہے۔ اسے عیش میں خدا کی یاد اور غضب میں خدا کا خوف رہنا چاہیئے۔ بادشاہ تو رعایا پروری کے لیے ہوتا ہے اس بات کا ان دنوں کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ، وزیر، ایلچی، سوداگر اور ارکان دربار اس معاشرے کے اوپر والے طبقہ کے افراد تھے۔ جس کا محور اصل میں بادشاہ اور دربار ہی تھا۔ اور جس میں خون ناحق بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جس سے بادشاہ بھی بچنے کی آرزو رکھتا تھا تاکہ روز قیامت میں ماخوذ نہ ہوں۔

ایک سال کی مدت میں وزیر کے سخن کا درست ہونا شرط ٹھہرایا گیا اور اسے بندی خانے میں ڈال دیا گیا۔ وزیر کے گھر خبر پہنچی تو کہرام پڑا اور وزیر کی بیٹی جو چودہ پندرہ برس کی تھی اور اس وقت گڑیا کا بیاہ رچا رہی تھی ماں کی آہوزاری اور طعن سے وہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئی جو لڑکوں سے بھی نہ بن پڑے۔ ماں سے حقیقت جان کر بظاہر وزیر زادی نے کہا "اماں جان تقدیر سے لڑا نہیں جانا چاہیئے۔ انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور امیدوار فضل الہی کا رہے وہ کریم ہے مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا۔ رونا دھونا خوب نہیں ہمارے دشمن اور طرح سے بادشاہ کے پاس لگادیں اور چغلی کھاویں کہ باعث زیادہ خفگی ہو۔ بلکہ جہاں پناہ کے حق میں رہا کرو ہم اس کے خانہ زاد ہیں اور ہمارا خداوند ہے وہی غضب ہوا ہے وہی مہربان ہوگا۔ (۳۸)

اس گفتگو سے وزیر زادی کی سوجھ بوجھ اور عقلمندی کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ پیمانے پر تعلیم و تربیت ہوتی ہے دوسرے یہ کہ بادشاہ بیشتر کانوں کے کچے ہوتے تھے اور دوست دشمن چغلی پہ اتارو رہتے تھے۔ تیسرے یہ کہ خدا پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور معاشرہ تقدیر کے عقیدے پر مبنی تھا اور تقدیر سے لڑنا بیکار ہوتا ہے اور بدعقیدگی کا گناہگار ہوا جاتا تھا۔ اس لیے صبر ہی ضروری اور لازمی ہے۔ خدا کریم ہے اور کسی کی

شکل اُلکی نہیں رکھتا۔

رات ہوئی تو وزیر زادی نے پرانے بوڑھے ملازم کو بلایا اور نیشاپور جانے اور سوداگر کے کتے کا پتہ لگانے میں اس سے رفاقت اور اعانت چاہی اور آخر رضامند کرکے اسبابِ سفر درست کرنے کو کہا۔ اور قافلے کی تیاری رازدارانہ طور پر کرنے کی تاکید کی۔ اس نے مردانہ لباس کیا۔ گھر میں کسی کو خبر نہ ہوئی صبح ہی کو وزیر کے محل میں چرچا پایا گیا کہ وزیر زادی غائب ہے۔ ماں نے چھپایا اور وہ منزل بمنزل آخر نیشاپور پہنچی اور کارواں سرا میں اتری۔ دوسری صبح کو شہر کی سیر کے واسطے نکلی۔ چوک پہنچ کر چوراہے پر کھڑی جو ادھر ادھر دیکھا تو ایک دکان جوہری کی نظر پڑی۔ دیکھتے ہی اسے خیال ہوا کہ جس سوداگر کا اس کے باپ نے بادشاہ سے ذکر کیا کہیں یہی نہ ہو۔ دوسری طرف جو دیکھا دو پنجرے ٹنگے ہیں ان میں دو آدمی قید ہیں دو حبشی دونوں طرف مسلح کھڑے ہیں۔ ایک اور دکان میں قالیچے بچھے تھے ان پر ایک چوکی ہاتھی دانت اور اس پر گیلا مخمل کا ایک کتا جواہر کا پٹا گلے میں اور سونے کی زنجیر سے بندھا ہوا بیٹھا ہے اور دو غلام اس کی خدمت کر رہے۔ غور کرکے دیکھا تو پٹے میں بارہوں دانے لعل کے جیسے سُنے تھے موجود ہیں۔ شکر خدا کا کیا اور وزیر کو چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ لیکن خلقت اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر ہکا بکا ہو رہی تھی۔ اس جوہر سوداگر نے بھی دیکھا۔ غلام کو بھیج سوداگر بچے (وزیر زادی) کو پاس بلا لیا۔ جیسے ہی پہنچا جوہری تعظیم کی خاطر سروقد اٹھا بغل گیر ہوا۔ سوداگر بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ برابر بٹھایا اور متعلقات دریافت کیے۔ بتایا کہ سوداگری کا پہلا سفر ہے۔ خشکی کے راستے ارادہ کیا دریا کی راہ حوصلہ نہ پڑا۔ آپ کے اخلاق اور خوبیوں کا شہرہ سُنا۔ ملاقات کی آرزو میں یہاں آیا۔ تمنا دل کی برآئی اب یہاں سے کوچ کروں گا۔

جوہری خواجہ تو عقل کھو چکے تھے بولے "کوئی دن غریب خانے پر کرم فرمائیے۔" کھانا آیا پہلے کتے کے واسطے کھانا ایک لنگری میں لے جایا گیا۔ کتے نے جتنا چاہا کھایا اور سونے کی لگن میں پانی پیا۔ اس کھانے کے طباق اور پانی کے لگن کو پنجرے کے نزدیک لے گئے۔

قفس کھول کر دونوں انسانوں کو باہر نکال کئی سونٹے مارے، کتے کا جھوٹا انھیں کھلایا۔ خواجہ نے کہا میں اس سبب بدنام ہوں اور اس شہر کے لوگ خواجہ سگ پرست کہتے ہیں۔

کتا سماجی طور پر سب سے کم تر بلکہ بدتر جانور خیال کیا جاتا ہے اور نفرت آمیز اظہار کے لیے کتا ایک علامت بن جاتا ہے۔ نفرتوں کی علامت حقارتوں کا نشان۔ اسی لیے اردو میں محاورہ ہے کہ اس نے مجھے کتے کے ڈھیرے میں پانی پلا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سے زیادہ حقارت آمیز سلوک اور ذلتوں سے بھرا برتاؤ ہے جو ان بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے جنھیں خواجہ سگ پرست نے لوہے کے پنجروں میں قید کر رکھا ہے۔ اصل میں یہ سب سزائیں ہیں وہ اپنوں کے ہاتھوں ملیں یا غیروں کے ہاتھوں۔ دنیا میں ملیں یا آخرت میں۔ خواجہ سگ پرست کا بیان اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ہمارے پورے سماجی رویے کو اُلٹ دیتا ہے کہ انسان بے وفا ہے اور کتا وفادار۔ اور سب سے زیادہ بے وفائی سب سے قریبی خون کا رشتہ رکھنے والے دودھ شریک بھائیوں کی طرف سے ہوئی۔ برادرانِ یوسفؑ اسی کی ایک مثال ہے۔

اس پر سوداگر بچے نے کہا۔ سال بھر کی رخصت والد نے دی تھی۔ دیر ہو گی تو وہ رو رو مر جائیں گے۔ میں رضامندی باپ کی خوشنودی خدا کی ہے اور اگر وہ مجھ سے ناراض ہوں گے تو میں ڈرتا ہوں کہ شاید دعائے بد نہ کریں کہ دونوں جہان میں خدا کی رحمت سے محروم رہوں۔ " باپ کی رضامندی کو خوشنودی کا درجہ دینے والا معاشرہ اور اس کی دعائے بد کا اندیشہ رکھنے والی تہذیب کا پروردہ اخلاقی معاشرے کا شاہد ہو سکتا ہے۔ جو معاشرہ باپ کو یہ جانے گا وہ ماں کے لیے کیا درجہ رکھتا ہو گا اس کا قیاس آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

خواجہ جو اس پر شیفتہ تھا۔ جدائی اس کی گوارا نہ تھی۔ کہنے لگا اچھا اگر تم نہیں رہتے تو میں ہی تمھارے ساتھ چلتا ہوں، یہ کہہ کر اپنی بھی تیاری سفر کرنے لگا۔

قافلہ تیار ہو گیا۔ سوداگروں نے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی اپنی توفیق کے مطابق مال سوداگری کے ساتھ ہمراہ ہوئے اور نیک ساعت دیکھ کر کارواں روانہ ہوا۔

بغدادی اونٹ پر ایک تخت کسا گیا اور اس پر کتا مسند پر سویا اور وہ دونوں قیدی ایک شتر پر لٹکائے ہوئے۔ خواجہ اور سوداگر بچہ ایک آرام پالکی پر سوار، منزل بہ منزل قسطنطنیہ کے قریب پہنچے اور شہر کے باہر مقام کیا۔ سوداگر بچے نے اجازت چاہی ماں باپ کو دیکھنے کے لیے اور مکان خالی کرانے کے لیے تاکہ جب طبیعت میں آوے شہر جا رہیں۔

سوداگر بچہ (وزیر زادی) گھر پہنچا۔ ماں سے سب سرگزشت کہہ سنائی اور کہا۔ بابا کو قید سے چھڑانے کی خاطر یہ سب فکر کی۔ ایک روز کا کام رہ گیا ہے اسے کر کے بابا کو قید سے چھڑاتی ہوں۔ یہ ماں سے رخصت ہو کر جاتا تھا کہ ادھر سے خواجہ بے چین ہو کر ادھر آتا تھا۔ اور راستے میں ایک دوسرے کو مل گئے۔

خیمے سے باہر عصر کے وقت کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ بادشاہی قراول (بندوق کا شکاری) ادھر سے گزرا اور کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھتا تھا کہ خواجہ کے خادم نے اس سے معلوم کیا اور خواجہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور وہ شریک مجلس ہوا۔ سگ کا مرتبہ اور سب ٹھاٹھ باٹ دیکھا۔ جاتے ہوئے اسے خواجہ نے کئی تھان اور کچھ تحفے دیے۔ اس صبح کو دربار میں درباریوں سے خواجہ کا ذکر کیا۔ پھر بادشاہ نے خبر ہونے پر طلب کیا۔ کیونکہ کتے کے مرتبے اور دو آدمیوں کے پنجرے میں بند ہونے سے خفگی ہوئی لیکن اس فرنگ کے ایلچی نے قتل کے حکم سے باز رکھا اور کہا ایک خون ناحق سے بچے دوسرے گناہ کا مرتکب ہونے جا رہے ہو۔ بے تحقیق ہی ہر کسو کو قتل کا حکم کر بیٹھتے ہیں خدا جانے حقیقت کیا۔

سوداگر بچے نے ایک طلائی خوان جواہر سے بھرا پیش کیا اور آداب و کورنش ادا کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر خواجہ نے زمین چومی اور دعائیں دیں۔ خواجہ قتل کے حکم پر ماجرا کہنے پر آمادہ ہوا اور پنجرے آدمیوں کے منگوانے کے لیے کہا۔ اگر کہیں جھوٹ بیان کروں تو ان دونوں سے تصدیق کر لیں۔ بادشاہ نے ان دونوں کو پنجروں سے نکال کر خواجہ کے پاس کھڑا کیا اور ان دونوں کو اپنا سگا بھائی بتایا۔ جب خواجہ چودہ برس کا ہوا تو باپ نے رحلت کی۔ تجہیز و تکفین سے فراغت ہونے اور پھول اٹھ چکنے پر ان دونوں بھائیوں نے مال و متاع کی تقسیم چاہی۔ خواجہ نے کہا تم دونوں باپ کی جگہ ہو۔ خواجہ نے فارغ

لکھ دی۔ دوسرے ہی دن بھائیوں نے کہا تو اور کہیں رہن سہن اختیار کر۔ جب ان بھائیوں کا یہ خیال دیکھا تو مکان چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ باپ سفر سے آتا تو کوئی تحفہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے خواجہ کے لیے سوغات لے آتا۔ انھیں بیچ کر ذاتی سرمایہ فراہم کیا۔ اور کاروبار شروع کر دیا۔ ایک بار ایک لونڈی ترکستان سے لایا اور پھر ایک گھوڑا دیا اس کا دانہ گھاس اپنے پاس سے کرتا۔ دوسری خرید کر کے خواجہ وہاں جا رہا اور کتا اس کے ساتھ گیا۔ ایک دکان بزازی کی کھولی۔ تین برس میں اچھا خاصا کام ہو گیا۔ ایک روز جمعہ کا دن تھا۔ غلام بازار سے سودا سلف لینے گیا تو روتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا، بڑے بھائیوں کی چوک کے چوراہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں اور قمچیاں مارتا ہے اور تنہا ہے۔ تمھارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو۔ یہ سنتے ہی خواجہ ننگے پاؤں بازار دوڑ کر گیا۔ روپے دے کر بھائیوں کو یہودی سے چھڑایا۔

چند روز کے بعد سفر کی تیاری کروائی۔ جنس تجارت ساتھ کی سوداگروں کے قافلے کے ساتھ بخارا بھیجا۔ وہ قافلہ سال بھر بعد واپس آیا۔ بھائیوں کی خیر خبر نہ پائی۔ ایک شنا نے بتایا کہ بخارے میں ایک نے جوئے خانے میں [illegible] مال ہار دیا۔ دو دن کے بعد ان کے استقبال کو جانا چاہتا تھا۔ ایک آدمی اس گاؤں سے آیا اور اس نے فریاد کی کہ تمھارے بھائیوں کے سبب ہمارے گھر لوٹے گئے۔ رات کو ڈاکہ پڑا اور شہر کے باہر ننگے منگے خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ دو جوڑے لے کر پہنچا۔ گھر لایا۔ تین مہینے گزرنے پر اپنے ساتھ سفر میں لے جانے کا ارادہ کیا۔ جب کشتی نے لنگر اٹھایا، یہ کتا کنارے سو رہا تھا۔ جہاز کو منجدھار میں دیکھا اور دریا میں کود کر پیرتا ہوا جہاز کی طرف آنے لگا۔ خواجہ نے ایک کشتی دوڑائی اور کتے کو جہاز میں پہنچایا۔ منجھلا بھائی خواجہ کی لونڈی پر عاشق ہوا اور دونوں نے مار ڈالنے کے مشورے کیے اور سارے مال پر قابض ہو جانے کے منصوبے بنائے۔ کوٹھی سے منجھلا بھائی جلدی سے جگا کر باہر لے گیا۔ کتا ساتھ ہو لیا۔ بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے جھکا ہوا تھا۔ عجب طرح کے تماشے کا عذر کیا۔ دیکھنے کو سر جھکایا کچھ نظر نہ آیا اور غافل پا کر منجھلے نے پیچھے آ کر پانی میں دھکیل دیا۔ یکایک کسی چیز پر ہاتھ پڑا تو یہی کتا

تھا پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا۔ آٹھویں دن کنارے جا لگا۔ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ کتے کی آواز کان میں آئی۔ ہوش آیا شہر کا قریب دیکھا۔

اس طرح سے خواجہ نے کئی بار ان بھائیوں کے زندگی پر حملہ کرنے اور نشان تک مٹا دینے کے منصوبے بیان کیے۔ ہر بار مصیبت میں کتے نے ساتھ دیا اور ہر بار خدا کے فضل وکرم سے ہر مصیبت سے نجات ملتی رہی۔ بادشاہ کو ہر بات کی دونوں بھائیوں سے تصدیق ہوتی رہی۔

آزاد بخت بادشاہ نے پوچھا سوداگر یہ تمھارا فرزند نہیں۔ خواجہ نے کہا، میرا وارث مالک ہے لیکن اس کی رعیت ہے۔ سوداگر بچہ (وزیر زادی) نے سب حقیقت کہہ سنائی۔ خواجہ نے حقیقت جانی تو اسے بہت غم ہوا۔ آزاد بخت نے خواجہ کو وزیر زادی کے ساتھ عقد کرنے کی خوش خبری دی۔ وزیر نے نئے سرے سے قلمدان وزارت لیا اور کئی سال میں خواجہ کے یہاں وزیر زادی کے دو بیٹے ہوئے ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا ملک التجار ہے چھوٹا سرکار کا مختار ہے۔

سیر تیسرے درویش کی

تیسرا درویش اپنی داستان کہنے بیٹھا تو کوٹ باندھ (پلتھی مارکر)۔ دوسرا چار زانو ہوا تھا۔ یعنی دونوں ہاتھ بھی زمین پر ٹکے رکھے تھے۔ اور پہلا تو سیدھا سبھاؤ دو زانوں ہی بیٹھا تھا۔ اور چوتھے نے رو رو کر اپنی بپتا کہی۔

یہ تیسرا درویش بھی عشق ہی کا مارا ہوا ہے۔ اکلوتا بادشاہ زادہ تھا۔ ایک دن چار دوستوں کے ساتھ باز، بہری، جوہ اور باشا (شکاری پرندوں) کو سرخاب اور تیتروں کو اڑاتا ہوا دور نکل گیا۔ ایک بہاریں خطہ دکھائی دیا اور گھوڑے کو قدم قدم اس ماحول میں رکھا۔ کالا ہرن نظر پڑا عجیب رنگ روپ سے بے کھٹکے چرتا پھرتا تھا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آہٹ سنی تو سر اٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔ ساتھیوں سے وہیں ٹھہرے رہنے کو کہہ کر اسے زندہ پکڑنے کے لیے گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ شام ہونے کو آئی آخر تیر ترکش

سے نکالا اور اللہ اکبر کہہ کر اس کی ران کو تاک کر مارا۔ وہ لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی جانب چلا اور بادشاہ زادہ پیدل اس کے پیچھے ہو لیا۔ کئی اتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد دکھائی دیا۔ پاس جانے پر باغیچہ اور چشمہ دیکھا۔ ہرن نظر سے اوجھل ہو گیا۔ تھکن دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں دھوئے کہ برج کے اندر سے رونے کی آواز آئی جیسے کوئی کہتا ہو کہ اے بیٹے! جس نے تجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اس کے کلیجے میں لگے اور اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اس کو میرا سا دکھیا بناوے۔

ہرنوں، تیتروں، بٹیروں اور سرخابوں کے شکار کے بہت قصے اور منظر نامے بادشاہوں امیروں اور شکاریوں کے کہانیوں قصوں اور داستانوں میں مل جاتے ہیں انھیں ہم مغل مصوری اور راج پوت پینٹنگ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہرن کا کسی اور قالب میں بدل جانا تحول صورت کا وہ خیال یا عقیدہ ہے جو قدیم روایتوں سے ہم تک پہنچا ہے کہ روح ایک قالب سے دوسرے قالب میں آ سکتی ہے اور جن تو ہزار قالب تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہرن کا اس طرح سامنے آنا کسی شہزادے کا اسے زندہ پکڑنے کی کوشش میں اس کا پیچھا کرنا اور اس کے بعد ہرن کا غائب ہو جانا اور اس کے بعد اس کو زخمی کر دینا ہماری داستانوں کے بیشتر عناصر میں سے ہے اور زندگی کے ہزار تجربوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

درویش نے جا کر دیکھا ایک سفید ریش بزرگ مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن اس کے آگے لیٹا ہے۔ درویش نے سلام کیا اور کہا حضرت یہ تقصیر نادانستہ ہوئی ہے خدا واسطے معاف کر۔ بزرگ نے جواب دیا اگر انجانے یہ حرکت ہوئی تو اللہ معاف کرے گا۔ درویش تیر نکالنے میں معاون ہوا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ تھوڑا بہت جو اس بزرگ نے پیش کیا، درویش کھا پی کر ایک چارپائی پر دراز ہو گیا۔

پری زادی کی آواز سے آنکھ کھلی تو درویش اکیلا تھا ایک کونے پردہ پڑا تھا دیکھا تو ایک تخت پر چودہ برس کی ایک پری زادی فرنگی باس میں بیٹھی ہے اور وہ بزرگ اس کے پاؤں پر سر دھرے روتا ہے۔ بادشاہ زادہ بے ہوش ہو کر بے جان سا گر پڑا۔ اس بزرگ نے گلاب چھڑکا تو پری زادی کے سامنے جا کر سلام کیا۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ بولا

یہ غرور کس مذہب میں درست ہے۔ وہ چپکی بیٹھی رہی وہ آگے بڑھا پاؤں پر ہاتھ چلایا معلوم ہوا کہ پتھر سے تراشا ہے۔ بزرگ سے کہا اس طلسم کی کیفیت بیان کر اور جو کچھ تجھ پر گذری ہے کہہ۔ اس نے بہت مصر پایا تو بولا خدا ہر انسان کو عشق کی آگ سے محفوظ رکھے عورت عشق کے سبب ہی ستی ہو جاتی ہے اور پھر اپنی حقیقت کیا۔

حسینانِ مغرب سے مشرقی اقوام کا ذہنی رشتہ صدیوں سے بنا چلا آتا ہے۔ وہ یونانی دوشیزائیں ہوں یا رومی پری پیکر خواتین مزید اس کا ذکر اس وقت آنا شروع ہوا جب صلیبی جنگیں ہوئیں یا ترک سلاطین اور اسپین کے بادشاہوں کے محل میں مغرب کی نازنین اور پری جمال عورتوں کی رسائی ہوئی۔ اکبر کے آخری دور سے ہندوستان میں بھی شاہی درباروں میں ان کا اثر اور رسوخ شروع ہو گیا تھا۔ اکبر کی ایک بیگم مریم زمانی بیگم تھی۔ اسی صورت حال نے انھیں داستانوں میں فرنگی حسیناؤں کے تذکرے کو داخل کیا۔

یہ حسینہ دراصل ایک بُت ہے۔ بالکل LIFE LIKE STATUE دلچسپ بات یہ ہے یہاں کسی ایسے مجسمے کا ذکر آیا ہے جس کو بزورِ سحر انسانی وجود سے پتھر کے بُت میں بدل دیا گیا ہے۔ روم میں اس طرح کے مجسمے بنائے جاتے تھے۔ اور گوا کے گرجاؤں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ داستانوں میں ان کا تذکرہ ایک دوسرے انداز سے آیا۔ لیکن اس سے اس عہد کی مجسمہ تراشی پر روشنی پڑتی ہے اور انسانی فکر وفن کے رشتہ سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت کے تجارتی قافلے کس طرح سفر کرتے ہیں۔ اپنے اپنے بیش قیمت سامان اور تحفہ تحفہ چیزوں کے ساتھ۔ تجار آتے ہیں اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر روسا کے دیوان خانوں، شاہی درباروں، شہزادوں اور شہزادیوں تک پہنچ کر ان چیزوں کو پیش کرتے ہیں اور وہاں سے حسب مراد یہ کہیے منھ مانگی قیمت پاتے ہیں۔ یہ کہانی مصنف نے جس طرح پیش کی اس میں عطر و پان کا ذکر بھی آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسم فرانس اور انگلستان میں تو نہیں رہی ہوگی یہ ہندوستان میں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت کے انگریز امراء اور سرکار کمپنی بہادر کے

افسرانِ اعلیٰ جب ہندوستانیوں سے ملتے تھے تو ان کی تواضع عطر و پان سے کرتے تھے۔ غالب کے فارسی خطوط میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی طرح شقہ کا لفظ بھی اس وقت کے مغل درباروں کی طرف اشارہ ہے کہ بادشاہ کی تحریر کو شقہ کہا جاتا ہے۔

میرے استاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مجھے بتایا کہ غلام قادر روہیلے کو جب مرہٹوں نے گرفتار کیا اور سزائے موت دی تو اسے پنجرے میں قید کر کے بازاروں میں گھمایا گیا تھا۔

اس کہانی میں آگے چل کر فرنگی سپاہیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ کلکتہ میں ظاہر ہے کہ فرنگی سپاہی موجود تھے اس سے پیشتر بھی ان کی موجودگی کا احساس چندر نگر گوا اور ڈمنڈ ڈیو جیسی مغرب کے تسلط میں آئی بستیوں میں ہو سکتا تھا۔ اس زمانے کے داستان نگاروں نے اس انداز سے اس کا ذکر بھی کرنا شروع کیا ہوگا۔ بعد کی داستانوں میں تو خیر ایسے کسی منظر نامہ کا آجانا عصری تاریخ کی عکاسی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس میں جو بات زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ کسی جوان شہزادے کا پنجرے میں بند ہونا ہے۔ جس سے بعد میں شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ یہ اس کے باپ کی وصیت بھی ہے۔ بعض مغل سلاطین نے اپنے بھتیجوں کو اپنی بیٹیوں سے منسوب کر رکھا تھا اور انھیں زندہ اسی لیے چھوڑا تھا کہ اگر وہ نہ ہوں گے تو شہزادیاں کنواری رہ جائیں گی۔

سلطنت کے دوسرے دعوے داروں کو ختم کر دینا، زہر دلوا دینا بھی مغل تاریخ کا حصہ ہے۔

یہ تابوت اس شہزادی مرحوم کا ہے اس کو دوسرے وزیر نے مکر سے مارا اس کا۔ کوکھا ہوں۔ میں نے اس وزیر کو مار ڈالا اور بادشاہ کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ تھا۔ بادشاہ نے اپنے آپ کے بے گناہ ہونے کی سوگند کھائی۔ اس وقت ہر مہینے نوچندی جمعرات کو (چاند کی پہلی جمعرات عملیات کے لیے فضیلت کا درجہ رکھتی ہے اس دن عامل خاص طور سے سرگرم ہوتے ہیں اگرچہ اس کا فرنگ سے تعلق نہیں یہ مشرقی تصورات کا حصہ ہے کہ میرامن کے زمانے تک آتے آتے اگر انگریزوں نے بھی ایسا کوئی رویہ یا رسم اختیار کر لی ہو۔ اس کے امکان سے کلیتاً انکار نہیں ہو سکتا کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے۔) میں اس

تابوت کو اس طرح شہر میں لیے پھرتا ہوں۔ یہ خدا کے مہربان ہونے کا نشان تھا کہ ایسا شخص مہربان ہو جائے۔

تابوت عیسائیت میں بھی ایک خاص تاریخی اور تہذیبی علامت ہے جس کا تصور اسرائیلی روایات کے ساتھ عیسائیت کو منتقل ہوا اور وہاں سے پھر مسلمانوں میں آیا۔ اس کے علاوہ عیسائی مذہب میں مردے کو تابوت میں رکھ کر ہی دفن بھی کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی اس کی حکایتیں اور روایتیں مل جاتی ہیں۔

بادشاہی باغ کے اندر داخل ہوا۔ باغ کے صحن میں ایک ہشت پہلو سنگ مرمر کا چبوترہ تھا۔ اس پر سفید بادلے ایک نم گیرہ الماس کے استادوں پر کھڑا تھا۔ ایک مسند بغلی گاؤ تکیے کے ساتھ بچھی تھی۔ تابوت اس پر رکھ دیا اور ایک درخت کے پاس بیٹھنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد مشعل کی روشنی میں آگے پیچھے کئی خواصوں کے ساتھ شہزادی آئی۔ اداس اور خفا ہوئی مسند پر آ بیٹھی۔ وہ جوان ہاتھ باندھے کھڑا رہا پھر دور فرش کے کنارے بیٹھا۔ فاتحہ کے بعد کچھ باتیں کیں۔

جب ہم کسی کہانی میں اس طرح کی کوئی رسم ادا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ بادشاہ، شہزادے اور امراء جب فاتحہ خوانی کے لیے اپنے کسی بزرگ یا بزرگانِ دین میں سے کسی مزار پہ جاتے ہوں گے تو کیا صورت ہوتی ہوگی۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں یہ داستانیں ہماری تاریخ کا تکملہ بھی ہیں۔

درویش شہزادی کو دیکھ کر خوش ہوا۔ تھوڑی دیر پیچھے شہزادی چلی گئی اور کوکا (وہ جوان) اپنے مکان کو گیا۔

کوکا بادشاہ کا دودھ شریک بھائی ہوتا تھا اور کوکی دودھ شریک بہن۔ اس طرح کے کرداروں کا داستانوں میں آنا بھی ان کے تاریخی پسِ منظر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ داستان کب اور کہاں لکھی گئی ہے یا پھر اس میں کہاں اور کس طرح کا اضافہ ہوا۔

درویش نے کہا میرے غلام کی حویلی نزدیک ہے جھوٹ بولا۔ اگرچہ دل میں حیران تھا۔

راستے میں ایک مکان مقفل دکھائی دیا۔ قفل توڑ کر اندر گئے۔ سب ساز و سامان آراستہ تھا۔ کن ہو رہی تھی پرتگالی شراب کی ایک گلابی لی اور رات بھر خوشی منائی۔ صبح کو شہر میں شور ہوا اور کوچہ کوچہ میں شہزادی کے غائب ہو جانے کی منادی ہو گئی۔ انعام اور خلعت کا اعلان کیا گیا۔ پہرے سخت کر دیئے گئے۔ درویش نے دروازہ بند نہ رکھا۔ ایک بڑھیا دروازہ کھلا پا کر اندر چلی آئی اور سامنے کھڑی ہو کر دعائیں دینے لگی اور بیٹی کے بچہ ہونے کا عذر کیا۔۔۔ زچہ کو ستّورا اور اچھوانی دینے کی توفیق نہیں۔ دو دن سے بھوکی پیاسی پڑی ہے۔ (زچہ کے لیے زچگی کے بعد یہ چیزیں اس وقت بھی ضروری خیال کی جاتی تھیں اور آج بھی ان کا رواج ہے۔ (ع۔ ز) شہزادی فریب میں آئی۔ چار نان اور کباب کے علاوہ انگوٹھی چھنگلیا سے اتار کر حوالے کی۔ نان کباب تو ڈیوڑھی میں پھینکے اور انگوٹھی مٹھی میں دبائے چل دی۔ مگر خدا نے مدد کی اور اس مکان کا مالک جوان سپاہی گھوڑے پر سوار آ پہنچا۔ بڑھیا کو نکلتے دیکھا تو اس کے جھونٹے کو پکڑ کر اٹھا لیا۔ دونوں پاؤں میں رسی باندھ کر درخت کی ٹہنی سے لٹکا دیا۔ (یہ قریب قریب وہی روایت ہے جو ہمارے قدیم معاشرے سے آج تک بدستور چلی آ رہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ طریقے بدل گئے ہیں۔ آج بھی بھیدی اور فریبی لوگ بھیس بدل کر لوگوں کو ٹھگتے ہیں اور ان کا ذریعہ معاش ہی ہوتا ہے۔ بڑھیا کے دونوں پاؤں باندھ کر درخت سے لٹکا دیا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس معاشرے کے لوگ اس طرح سے سزائیں دیا کرتے تھے۔ آج بھی بعض قبائل اور برادریوں میں اس طرح کی سزا دینے کا دستور موجود ہے۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک الٹا لٹکا کر سزا کا رواج بھی تھا۔ ایسی سزائیں پنچایتوں کی طرف سے دی جاتی تھیں۔ یہ پھانسی دینے یا سولی چڑھانے سے مختلف بات تھی اور اس کا مقصد موت کی سزا دینا نہیں ہوتا تھا۔) وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس مرد کی صورت دیکھ خوف غالب آیا لیکن اس نے بدحواس دیکھ کر تسلی دی۔ اس مرد سپاہی نے درویش کی بات کی تصدیق کی اور کہا جتنی خلق اللہ ہے بادشاہوں کی لونڈی غلام ہے۔ (اس دور کی تہذیب کا یہ ایک رویہ تھا۔ خصوصاً مشرق میں رعایا دل و جان سے بادشاہوں،

شہزادوں اور شہزادیوں پر چھاؤں رہوتی تھی۔ یہ ایک طرح سے معاشرے کی وفاداری کی علامت جانی جاتی تھی)۔

شہزادوں اور شہزادیوں کا غائب ہونا انوکھے واقعات میں سے نہیں ہے۔ راج پوت مصوری میں تو ایسی تصویریں بھی ملتی ہیں، کہانیوں میں بھی یہ روایتیں یہاں اور وہاں دُہرائی جاتی رہتی ہیں۔ سنجوگتا اور پرتھوی راج کے واقعے میں تو شہزادی کو اُڑا لانے کا قصہ صدیوں تک زبان زد عام رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ایک کہانی دوسری کہانی سے متاثر ہوتی ہے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں شہزادی دریا میں تیرتے وقت ڈوب گئی اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔ بہت ممکن ہے کہ مثنوی دریائے عشق کا واقعہ ایسے ہی کسی قصے سے ماخوذ ہو اور اسی طرح مثنوی بحرالمحبت کی کہانی بھی اسی کا ایک عکس پیش کرتی ہو۔

سیر چوتھے درویش کی

چین کے بادشاہ کا بیٹا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ سوچا کہ ہمیشہ یونہی بسر ہوگی کہ یکایک والد رحلت کر گئے اور چھوٹے بھائی کو وصیت کی کہ جب تک شہزادہ بالغ ہو اس کی جگہ ملک و مال کا خیال رکھنا۔ رعایا اور فوج کو خوشحال رکھنا، جوان ہو جانے پر تخت و تاج حوالے کر دینا اور اپنی بیٹی روشن اختر سے شادی کر دینا۔ اس سے بادشاہت خاندان سے باہر نہیں جائے گی۔

شہزادہ درویش زنانے محل میں رکھا گیا۔ چودہ برس تک بیگموں اور خواصوں میں کھیلتا کودتا رہا اور چچا کی بیٹی سے شادی کی خبر سے خوش تھا۔ والد کے وقتوں کا ایک حبشی غلام مبارک تھا۔ اس پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے پاس وقت گذارتا اور باتیں کرتا۔ ایک دن یہ حادثہ ہوا کہ ایک ادنیٰ سہیلی نے بے قصور ہی ایسا طمانچہ مارا کہ چہرے پر پانچوں انگلیوں کا نشان اُبھر آیا۔ مبارک نے تسلی دی اور بادشاہ کے پاس چلنے کو کہا چچا نے شفقت سے آنے کا سبب پوچھا اور دلگیری کی وجہ معلوم کی۔ مبارک کے کہنے پر کہ

کچھ عرض کرنے کو آئے ہیں۔ خود ہی کہہ اٹھے اب میاں کا بیاہ کر دیتے ہیں اور نجومیوں اور رمالوں کو نیک ساعت بتانے کے لیے طلب کیا۔ مگر بادشاہ کی منشا کے مطابق سارے سال ہی کو نحس بتایا اور بات آئندہ برس پر ٹل گئی۔ جب دو تین دن بعد مبارک کے پاس شہزادہ گیا تو وہ دیکھتے ہی رو پڑا۔ معلوم کرنے پر اس نے بتایا امیر امرا جو والد کے وقتوں کے تھے خوش ہوئے اور انھیں قدردانی کی امیدیں بندھیں۔ یہ خبریں تمھارے چچا کے پاس پہنچیں اور مجھے طلب کر کے کہا کہ شہزادے کو کسی فریب سے مار ڈال۔ ایک ترکیب سوجھی ہے اگر راست آئی تو کچھ پرواہ نہیں۔ یہ کہنے کے بعد شہزادے کو ساتھ لے کر جہاں مرحوم بادشاہ سوتے بیٹھتے تھے، گیا۔ ایک کرسی پڑی تھی اسے اس نے اور شہزادے نے کھسکایا اور کرسی کے تلے کا فرش اُٹھایا اور زمین کھودی۔ ایک کھڑکی دکھائی دی اس میں قفل لگا تھا۔ شہزادہ ڈرتے ڈرتے قریب گیا تو اس کھڑکی کے اندر ایک عمارت چار مکانوں پر مشتمل ہے۔ ایک دالان میں سونے کی زنجیروں میں دس دس خمیں لٹکی تھیں اور ہر ایک کولی (مٹکے) کے منھ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر جڑاؤ کا بنا ہوا بیٹھا تھا۔ کل انتالیس مٹکے تھے اور ایک مٹکا مونہا منھ اشرفیوں سے بھرا تھا۔ اس پر نہ اینٹ تھی نہ بندر تھا۔ اور ایک حوض جواہر سے بھرا ہوا تھا۔ شہزادے نے پوچھا یہ کیا طلسم ہے۔ مبارک نے بتایا کہ جنوں کے بادشاہ ملک صادق سے جوانی کے وقت سے تمھارے باپ سے دوستی تھی۔ ہر سال تحفوں کے ساتھ جاتے اور ایک مہینہ اس کے پاس رہتے۔ آتے ہوئے وہ زمرد کا ایک بندر دیتا۔ اس راز سے اور کوئی واقف نہ تھا۔ ایک بار پوچھنے پر انھوں نے بتایا یہ ایک ایک بندر کے ہزار ہزار زبردست دیو تابع ہیں۔ لیکن چالیس پورے ہونے تک بیکار ہیں۔[1] اس سال بادشاہ وفات پاگئے۔ چالیس بندر پورے کرنے کے لیے جنوں کے بادشاہ ملک صادق کے یہاں جانے کا ارادہ کیا کیونکہ اس طرح سے ملک شہزادے کے ساتھ آیا تھا اور اس کی جان بچ سکی تھی۔ مبارک

---

[1] یہاں بھی چالیس کی شرط آ پڑی ہے ورنہ انتالیس بیکار اور چالیس کار آمد۔ یہ صورت چالیس شرط کی دوسرے معاملوں میں بھی ہے۔ (ع۔ ز)

شہزادے کو ہمراہ لے کر چلا اور اتر کی سمت چلا۔ مہینہ بھر کے بعد ایک روز آنکھوں میں سلیمانی سرمے کی سلائیاں پھیریں تو اسے بھی جنوں کی بستی دکھائی دینے لگی۔

کہانیوں میں اکثر کہا جاتا ہے کہ تینوں کھونٹ جانا چھوتھی نہ جانا۔ کھونٹ اتر کی جانب جانا جاتا تھا۔ اس معاشرے کا یہ خیال تھا کہ اتر کی طرف غالباً جن یا ایسی مخلوق رہتی ہے اس لیے اتر کی طرف جانے کو منع کیا جاتا ہے۔

آج بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام اس اعتبار سے ہمارے ادب کی روایت ہے کہ جن ان کی انگشتری کے تابع تھے۔ ایک پتھر کا نام بھی سنگِ سلیمانی ہے۔ اس روایت سے ماخوذ ایک دوسری افسانوی حقیقت ہے کہ جو شخص سرمہ سلیمانی لگا لیتا ہے، بہت سی غیب کی چیزیں اس کی آنکھوں سے نظر آنے لگتی ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے اور سرمہ سلیمانی لگا کر شہزادے نے جنوں کی بستی کو دیکھا ہے جناتی قوت کو قابو میں کرنے کے لیے نقش سلیمانی کا نام بھی آتا ہے۔

بادشاہی بارگاہ میں پہنچے تو دربار کا سا عالم نظر کے سامنے آیا۔ اور ایک مرصع تخت پر ملک صادق بیٹھا تھا۔ سلام کرنے پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ کھانے کا وقت ہوا۔ کھانے سے فراغت ہونے پر مبارک نے سب احوال کہہ سنایا اور چالیسواں بندر عنایت کرنے کی درخواست کی۔ ملک صادق نے ایک کام کی شرط لگا دی۔ شہزادے نے شرط قبول کی۔ ملک صادق نے ایک کاغذ نکال کر دکھلایا اور کہا کہ اس تصویری شخص کو تلاش کرکے پیدا کر اور حضور میں لے آ۔

اس پیراگراف سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اول تو دلی، لکھنؤ کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس نقشے میں میرامن کے مشاہدے کو بھی دخل حاصل ہے۔

روشنی قرینے سے روشن ہے اور صندلیاں طرح بہ طرح دورویہ ہیں اور عالم، فاضل، درویش، امیر، وزیر، میر بخش دیوان پر بیٹھے ہیں گرز بردار، احدی، چیلے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور درمیان میں ایک تخت مرصع کا بچھا ہوا ہے اس پر ملک صادق تاج اور چار قب مروارید کی پہنے ہوئے مسند پر تکیہ لگائے بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہے۔

یہ وہی دربار ہے جو شاہی زمانے میں لگائے جاتے تھے، وہی طور طریقے، وہی آداب،

وہی تہذیب، سب کچھ دلی اور لکھنؤ دربار سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی اس تہذیب پہ میرامن نے شاہی درباروں کی منظر نگاری کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں اس کے علاوہ مشکل ترین کام کو خدا پر بھروسہ رکھ کر اختیار کر لیا جاتا تھا اور خدا ہی سے مدد چاہی جاتی تھی۔ اس یقین کامل کا ہی نتیجہ تھا کہ دشوار گذار کام بھی آسان ہو جایا کرتے تھے۔ یعنی اس معاشرے میں غیبی امداد پر یقین بڑھا ہوا تھا جو انسانوں کو ہر مرحلے میں کامیاب کرتا تھا۔ (غیبی امداد پر اس سے پیشتر بھی گفتگو کی جاتی رہی ہے۔)

سات برس گاؤں گاؤں، بستی بستی، شہر شہر، ملک ملک پھرتا رہا۔ کسی سے پتہ نہ پایا کہ ایک شہر میں داخل ہوا۔ ہر شخص اسم اعظم پڑھتا اور خدا کی عبادت کرتا شہزادے کو ایک اندھے ہندوستانی فقیر پر رحم آیا۔ ایک اشرفی اس کو دی۔ وہ فقیر بولا تو شاید اس شہر کا باشندہ نہیں، مسافر ہے۔ شہزادے نے کہا سات برس سے بھٹکتا ہوں، آج اس نگر میں پہنچا ہوں۔ شہزادہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ شہر سے باہر ایک عالی شان مکان تھا وہ اس کے اندر چلا۔ شہزادہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی چلتا رہا۔

یہاں سات کا عدد سالوں اور مدت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ سات سال کی کڑی مشقت یا سات سوال۔ یہ سب امتحانات کی صورت میں سامنے آتے ہیں گویا یہ سات بڑی استقلال اور محنت کے امتحان کی حد تھی کہ سات مرحلے ایسے ہی لوگ طے کرتے تھے جو ذہن کے پکے اور ایمان و یقین کے مستحکم ہوتے تھے۔

اسم اعظم بھی ایک افسانوی اور طلسمی چیز ہے اور اسم اعظم کے جو اثرات اور اس میں چھپی ہوئی جو قوتیں ہیں ان کی مدد سے اسم اعظم کو اپنے قابو میں کرنے والا ہوا میں اڑ سکتا ہے، آگ سے گذر سکتا ہے۔ ستاروں کو زمین پر اتار سکتا ہے اور چاند سورج کی حرکات کو روک سکتا ہے۔ یہ اسم اعظم واقعتاً کسی کے قبضے میں تھا یا نہیں یہ کہنا تو مشکل ہے اور اس کی نشاندہی کی بھی کوئی صورت نہیں کہ فلاں اسم اعظم ہے۔ لیکن ادب میں اس کی روایت برابر چلی آ رہی ہے فارسی کے ایک شعر میں آیا ہے ؎

نگینے مسلماں تابندہ بود   معین اسم اعظم بر آں کندہ بود

کھانا پکا، کھا پی کے اس سخی کے حق میں دعا دیں۔ شہزادے نے وہ عورت دیکھی جس کی تصویر ملک صادق نے دکھائی تھی۔ تصویر کو دیکھا پھر اس کو دیکھا ذرا سا بھی فرق نہ تھا۔

شہزادہ سیرت اور صورت سے اس قدر متاثر ہوا کہ پکار کے کہا اے خدا کے بندو اور اس مکان کے رہنے والو، میں غریب مسافر ہوں اگر اپنے پاس مجھے بلاؤ اور رہنے کو جگہ دو۔

یہ عشق نے رنگ دکھایا ہے کہ شہزادہ جھوٹ بولا اور امانت میں خیانت کا گناہگار ہونا چاہا جس کی نہ معاشرہ نہ تہذیب اجازت دیتی تھی۔ لیکن عشق وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ (ع۔ز)

اندھے فقیر نے آہ بھر کر اپنی اور اپنی بیٹی کی کیفیت بتائی اور کہا کسی بشر کی مجال نہیں کہ اس سے نکاح کرے۔ تفصیل ہے کہ اس ملک کے شہزادے کو دیکھے بغیر عشق ہوگیا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے حکومت میں طلب کیا اور مدعا ظاہر کیا۔ اس میں بھلائی دیکھی، فقیر نے رشتہ مان لیا اور نکاح ہوگیا۔ سب رسومات کے بعد رخصتی ہوگئی۔ رات کو نوشہ نے صحبت چاہی تو مکان میں شور ہوا پھر آواز کم ہوگئی۔ پٹ کی چول اکھاڑ کر دیکھا تو نوشہ کا سر کٹا ہے اور دلہن کے منہ سے کف جاتا ہے بے حواس پڑی ہے احوال کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ لڑکی کے سر کو کاٹ ڈالنے کا حکم بھی دے دیا گیا مگر پھر ہنگامہ اور شور و غل ہوا۔ بادشاہ جان بچا کر بھاگا اور محل سے باہر نکال دینے کا حکم دیا۔ شہزادے کے مارے جانے سے شہر کے سب لوگ دشمن ہیں۔ چہلم کے بعد بادشاہ نے ارکانِ دولت سے مشورہ کرکے باپ بیٹی کو مروانے اور گھر بار ضبط کر لینے کا مشورہ ٹھہرا۔ کوتوال حویلی کو گھیر کر اندر گھسنا چاہتا تھا کہ اینٹ اور پتھر برسنے شروع ہوگئے اور فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور بادشاہ نے محل میں آواز سنی "بھلا چاہتا ہے تو اس نازنین کے احوال کا معترض نہ ہوا...... اگر ان کو ستاوے گا تو مزا پاوے گا۔"

اس دن سے شہر کے باشندے اسم اعظم اور قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ بادشاہ کے خوف سے سب ساتھ چھوڑ گئے۔ بھیک مانگے نہیں ملتی۔ اس پر بھی شہزادے نے فرزندی میں قبول کرنے کی درخواست کی وہ راضی نہ ہوا۔ شام کو سرائے میں آیا۔ مبارک نے کہا "خدا نے اسباب درست کر دیئے اور محنت بیکار نہ گئی۔" شہزادے نے کہا "مگر وہ پیر مرد راضی نہیں ہوتا۔"

مجھی خوف آتا ہے تیری جان کو خطرہ نہ ہو۔" شہزادے نے کہا "میں نے سب طرح اپنے تئیں برباد کیا ہے۔ اپنے مرنے جینے کی مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ نا امید ہوں گا تو بن اجل مر جاؤں گا اور تمہارا قیامت میں دامن گیر ہوں گا۔"

اس رد و کد میں ایک مہینہ گذر گیا۔ وہ بیمار پڑا اور شہزادہ ہر طرح اس کے معاملے میں بھاگتا دوڑتا رہا۔ اور ہر طرح سے تیمارداری کرتا۔ ایک دن مہربان ہو کر کہنے لگا، اچھا آج اپنی لڑکی سے تیرا اندکور کروں گا۔

خدمت اور احسان کا احساس پایا جاتا ہے اور اس کا پاس مشکل اور ناممکن حالات میں بھی کیا جاتا تھا۔ اگرچہ اندھے فقیر کو نہ صرف مسافر کی زندگی کا خطرہ تھا بلکہ اسے اپنی بیٹی کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن وہ خدمت اور احسان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر معاشرہ بھی ان اقدار کا ماننے والا تھا۔ اور وہ اس معاشرے کی پیداوار تھا۔ (ع۔ز)

اس خوش خبری سے شہزادہ خوش خوش سرائے میں آیا۔ سب کچھ مبارک سے کہہ سنایا۔ مرد بزرگ کے پہنچنے کے بعد مبارک اس نازنین کو کارواں سرا میں لے آیا اور کہا یہ امانت ملک صادق کی ہے۔ شہزادے نے کہا، دل نہیں مانتا جو کچھ ہو سو ہو۔ مبارک کے ڈرانے سے شہزادہ حیران ہو کر چپکا ہوا۔ اور دو سانڈنیوں پہ ملک صادق کے ملک کی راہ لی۔ ایک میدان میں شور و غل سن کر مبارک نے کہا، ہماری محنت نیک لگی یہ لشکر جنوں کا آپہنچا۔

دن ہوا تو کئی خواص ملک صادق کے آئے۔ مبارک نے اس نازنین کو روغن مل دیا اور بناؤ سنگار کے ساتھ ملک صادق کے پاس لے چلا۔ اس نے شہزادے کو بہت سرفراز کیا اور اپنے بیٹھے کی جگہ کہا۔ لیکن جب وہ نازنین سامنے آئی تو اس روغن کی بو سے دماغ پراگندہ ہوگیا۔ اُٹھ کر باہر چلا گیا اور مبارک اور شہزادے کو بلوا کر کہا۔ کیوں جی خوب شرط بجا لائے میں نے خبردار کیا تھا کہ اگر خیانت کروگے تو خفگی میں پڑوگے۔ مبارک نے تو مارے ڈر کے دکھایا کہ اس نے اپنی علامت پہلے ہی کاٹ دی تھی اور ڈبیہ میں سرمہ بنا کرکے آپ کے خزانچی کے سپرد کر دی تھی۔

ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ قیاس میں نہیں آتا۔ غالباً تخیل کی پیداوار ہے۔

ممکن ہے ناکارہ ہوجانے پر آدمی زندہ رہ سکے۔ لیکن کاٹ دینے پر بھی زندہ رہ سکے۔ اس میں شک کی گنجائش کافی ہے۔ (ع۔ ز)

ملک صادق نے شہزادہ کو غضبناک ہو کر دیکھا۔ شہزادہ نے جان سے ہاتھ دھو کر اس کی توند میں چھری مبارک کی کمر سے کھینچ کر ماری۔ شہزادہ سمجھا، مر گیا۔ وہ حیران ہی تھا کہ وہ گیند کی صورت آسمان کی طرف اُڑا۔ پھر ایک پل بعد بجلی سا کڑکتا اور بے تحاشا سا بکتا نیچے آ کر شہزادے کو ایک لات ماری کہ وہ چاروں خانے چت گرا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا ایک جنگل ہے جہاں خاردار درختوں اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ایک طرف جن کھڑا ہوا کوئی آدمی دکھائی دیتا تو ملک صادق کا عالم پوچھتا۔ وہ دیوانہ جان کر جواب دیتا ہم نے تو اس کا نام بھی نہیں سُنا۔ آخر تنگ آ کر اس نے بھی اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن برقع پوش صاحب ذوالفقار آ پہنچا اور پچھلے دن آنے کی نوید دے کر کہا۔ جلد روم جا تجھ سے پہلے تین شخص گئے ہیں ان سے مل اور وہاں کے سلطان سے ملاقات کر۔ سب کا مطلب ایک ہی جگہ ملے گا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ محل سے اطلاع آئی کہ شاہ زادہ پیدا ہوا ہے۔ بادشاہ متعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ ماہ رو خواص جو بادشاہی غضب کی مورد ہوئی تھی اس پر یہ فضل الٰہی ہوا ہے۔ چاروں فقیروں نے دعائیں دیں۔ بادشاہ نے کہا تمھارے قدم کی برکت ہے۔ اور اجازت لے کر دیکھنے باہر گیا اور لا کر درویشوں کے قدموں میں ڈال دیا۔

درویشوں کے قدم کی برکت ہر معاشرے میں مانی جاتی ہے خصوصاً مشرق معاشرے میں۔ یہی وجہ ہے کہ دعائے فقیراں رحم خدا جیسی مثل مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے۔ (ع۔ ز)

جشن کی تیاریاں شروع ہوئیں داد و دہش سے کوڑی کوڑی محتاجوں کو مالا مال کر دیا۔ بادشاہ کی غنا اور سخاوت اور بخشش دریا اور سمندر ہو گئی تھی۔ ناچ و گانا گھر گھر تھا اور خوشی سے ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ وقت کا بادشاہ تھا کہ

یکایک رونے کا غل محل سے آیا اور بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ شہزادے کو نہلا دھلا کر دائی کی گود میں دینا تھا کہ ابر کا ٹکڑا آیا اور دائی کو گھیر لیا۔ دم بھر بعد دائی بے ہوش پڑی تھی اور شہزادہ غائب تھا۔ سارا ملک ماتم میں ڈوب گیا۔ تیسرے دن، وہی بادل آیا اور ایک ہنگھوڑہ محل میں رکھ کر آپ غائب ہوا۔ انگوٹھا چوستا ہوا شہزادہ اس میں تھا۔ بچے کے کھیل کھلونے سب کچھ اس ہنگھوڑے میں تھا۔

درویشوں کے لیے بادشاہ نے محل بنوایا اور جب سلطنت کے کام سے فرصت پاتا، ان کے پاس جا بیٹھتا۔ مگر ہر چاند کی پہلی جمعرات ابر کا ٹکڑا شہزادے کو لے جاتا اور دو دن کے بعد واپس لے آتا۔ اس معمول سے شہزادہ ساتویں برس پر لگ گیا۔

یہ ساتواں سال، ساتواں دن، ساتواں مہینہ اور اس گنتی کے سب ہی امور تہذیب کا حصّہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ کم ہی لوگ اس کے مفہوم، مقصد اور مطلب کو جانتے ہیں۔ اس وقت تک خطرے کا اندیشہ گذر جاتا ہے اور تکمیل کا ایک مرحلہ انجام پا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اس سے قبل بھی آ چکا ہے۔

سالگرہ کے دن درویشوں نے ایک شقہ شوق ملاقات کا شہزادے کے گہوارے میں لکھ کر رکھ دینے کو کہا۔

شام کو بادشاہ حسب دستور درویشوں کے پاس آ کر بیٹھا۔ بات چیت ہونے لگی کہ ایک لپٹا ہوا کاغذ بادشاہ کے پاس آ پڑا۔ کھول کر دیکھا تو اس شقے کا جواب تھا۔ سواری کے لیے تخت آیا، آزاد بخت درویشوں کے ہمراہ تخت پر بیٹھا اور تخت ایک عالی شان مکان میں جا کر اُترا۔ سلیمانی سرمے کی سلائی سب کی آنکھوں میں پھیری گئی۔ پریوں کا اکھاڑہ دکھائی دیا۔ صدر میں زمرد کے تخت پر ملک شہپال شاہ رخ کا بیٹا تکیے لگائے بڑی شان سے بیٹھا تھا اور دونوں پہلوؤں پر کرسیاں قرینے سے بچھی تھیں۔ اور ان پر عمدہ پری زاد بیٹھے تھے۔ ملک شہپال تخت

سے اُترا، آزاد بخت سے بغل گیر ہوا اور تخت پر لاکر برابر بٹھایا اور خوب راگ و رنگ کی محفل رہی۔ دوسرے دن شہپال نے بادشاہ سے درویشوں کو ساتھ لانے کی کیفیت معلوم کی۔

درویشوں کا تفصیلی بیان پیش ہوا، اور آزاد بخت نے سفارش کی۔ ملک شہپال نے بڑے بڑے جنوں کو حاضری کے پروانے بھیجے اور آدم زاد جس کے پاس ہو اپنے ساتھ لے آوے۔ پھر درویشوں سے ملک شہپال مخاطب ہوا کہ بڑی آرزو تھی بیٹا یا بیٹی ہو تو میں آدم کے بادشاہ کے بیٹے یا بیٹی سے بیاہ دوں۔ معلوم ہوا بادشاہ بیگم حمل سے ہیں۔ اور دن پورے ہونے پر بیٹی پیدا ہوئی۔ آرزو کے مطابق چار دانگ عالم میں جنیات کو تلاش کا حکم دیا اور اس شہزادے کو لے آئے۔ بیٹی سے زیادہ اس کی محبت دل میں ہے۔ اب اس کی کتخدائی کردیتا ہوں اور جیتے جی ان کا سہرا دیکھ لیتا ہوں۔

کسی شہزادے کا کسی پری پر عاشق ہوجانا ہندوستانی قصے کہانیوں کی ایک عام روایت ہے مگر یہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پری کا باپ جو ایک بادشاہ اپنی بیٹی کے لیے آدم زاد کی خواہش کرتا ہے اور آزاد بخت کے بیٹے کو اُٹھا لیتا ہے اور اس کی شادی اپنی لڑکی سے کردیتا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارا یہ معاشرہ ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہے جو ممکن نہیں یعنی کسی پری کی شادی کسی آدم زاد کے ساتھ ایک غیر فطری عمل ہے اور ما فوق الفطرت عناصر سے وابستگی کے باوجود معاشرہ اس کو بالکل قبول نہیں کرتا۔ لیکن یہاں ایک دوسرے پہلو پر بھی نظر جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ شادی کی خواہش لڑکی کے باپ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے میں یہ کبھی رائج نہیں رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے چھوٹے طبقے میں اس کا رواج پہلے بھی رہا ہے اور آج بھی ہے۔

سب لوگ آموجود ہوئے۔ ملک صادق نے آدم آزاد حاضر کرنے کو کہا۔ اس نے پیچ و تاب کھاکر اس نازنیں کو پیش کردیا۔ اور ولایت عمان کے بادشاہ سے

شہزادی جن کی جس کے واسطے نیمروز ملک کا شہزادہ سودائی بنا تھا ___ فرنگ کی شہزادی اور بہزاد کو طلب کیا گیا تو سب مل کر دریائے قلزم سے معلوم کیا تو اس نے سر نیچا کرلیا اور احوال کہہ کر دونوں کو روبرو پیش کیا۔ سلطان شاہ کس شہزادی کی تلاش کے سلسلے میں کوہ قاف کا مسلسل جادوگر بلوایا گیا۔ ___ فوج تعینات کی گئی اور دست بستہ کھڑا کیا گیا۔ پھر اس نے منہ سے ہاں نہ کی۔ اس کے بند بند جدا کردینے کا حکم دیا گیا۔ پری زاد کے لشکر شہزادی کو تلاش کرکے لے آئے۔ سب درویشوں نے ملک شہپال کا حکم اور انصاف دیکھ کر دعائیں دیں اور شاد ہوئے۔

سب مرادوں کو پہنچے اور حق و انصاف سے نہ صرف خدائی قدرت کی برتری ظاہر ہوتی ہے بلکہ معاشرے کی یہ بڑی خوبی نمایاں ہوئی۔ جنات بھی خدا کی مخلوق ہیں اور وہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہوسکتے۔ یہ اعتبار مشرقی تہذیب میں اس وقت بھی پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا تھا اور آج بھی سائنس کے زمانے میں معتبر مانا جاتا ہے۔ (ر ع۔ ز)

شہزادہ بختیار (آزاد بخت کا شہزادہ) اور روشن اختر (شہزادی ملک شہپال کا عقد نیک مہورت سے ہوا۔ خواجہ یمن کو دمشق کی شہزادی ملی۔ ملک فارس کے شہزادے کو بصرے کی شہزادی۔ عجم کے بادشاہ زادے کو فرنگ کی ملکہ اور نیمروز کے بادشاہ کی بیٹی کو بہزاد خاں اور شہزادہ نیمروز کو جن کی شہزادی اور چین کے شہزادے کو پیر مرد کی بیٹی۔ اس کے بعد چالیس دن تک جشن رہا۔ آخر تحفہ اور سوغات کے ساتھ ملک شہپال نے سب کو اپنے اپنے وطن روانہ کیا۔ لیکن بہزاد خاں اور خواجہ زادہ یمن آزاد بخت کے ساتھ رہے۔ جو میر بخشی اور خانساماں کے مراتب کو پہنچے۔

کہانیوں کا انجام کبھی بھی دکھ بھرا نہیں ہوتا۔ یہ روایت غالباً ہندو قصوں اور کہانیوں سے ماخوذ ہے کیونکہ مہم جوئی کے پس منظر میں قلعوں، خزانوں اور زمینوں سے زیادہ خوبصورت شہزادیوں یا پریوں یا وزیر زادیوں کا حاصل کرنا رہتا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے میں دشواریاں ہزار ہوتی تھیں لیکن ناکامی کا تصور نہ تھا۔ اور وہ بھی حوصلہ مند مرد کے لیے۔ جن کو اس کامیابی تک پہنچانے کے لیے قصے کے تمام

ہیچ وخم بتا دیئے جاتے تھے۔

یوں بھی شادی ایک بڑی خوشی کی بات ہے۔ نکاح اور عقد جیسے لفظ کے مقابلے میں شادی کے لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔ قصے کی خوش الحانی قصہ نگار اور ہیرو دونوں ہی کی ایک بڑی کامیابی تھی اور قصہ پڑھنے یا سننے سے جس ذہنی تسکین تک پہنچانا ہوتا تھا اس تسکین کا سامان قصے کے اس انجام کے ذریعے فراہم کیا جاتا تھا۔

حوالہ جات باغ و بہار

۱۔ اب آغاز قصے کا کرتے ہوں ...... کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا۔

۲۔ نوشیرواں کی سی عدالت، حاتم کی سی سخاوت" یعنی نوشیرواں عدالت میں حاتم سخاوت میں اعتبار حاصل کیے ہوئے تھے۔

۳۔ رعیت آبا، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا، ایسے چین سے گذران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ یعنی خوشی کے لیے دن عید اور رات شب برات ہونا چاہیئے۔ اور امن و امان کی یہ انتہا، راہی مسافر، جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے تھے۔ شیر اور بکری کا ایک گھاٹ پر پانی پینا بھی اس ذیل میں آتا ہے۔

۴۔ اس بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی بندگی سے غافل نہ کرنا۔

۵۔ کسی وفات کی مدت غم چہلم کے ہونے پر ختم ہوتی ہے اور معمول کے مطابق کاروبار کیا جانے لگتا ہے جیسا کہ پہلے درویش نے بھی چہلم کے بعد باپ کی گدی سنبھالی تھی اور کاروبار میں لگا تھا۔

۶۔ بہن کے گھر بھائی کتا اور ساس کے گھر جنوائی کتا۔

۷۔ اے کم بخت بے وفا، اے ظالم، پُر جفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا

جو تو نے کیا۔ بھلا ایک زخم اور بھی لگا۔ میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔ (ص ۳۲۔ باغ و بہار)

۸۔ کوئی دم کی مہمان ہوں جب میری جان نکل جاوے تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے مجھ بدبخت کو اس صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجیو تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب کے ہو۔ باغ و بہار ۴۳۔ ایضاً

۹۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سر بمہر زربفت کے خوان پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پہ دھرے آیا کہا اس جوان کے ساتھ جاکر جو گوشت پہنچادو۔ ص ۸۷ باغ و بہار

۱۰۔ حق تعالیٰ نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو۔ اگرچہ پرانے کپڑے سے اس کی آدمیت میں فرق نہیں آیا پر ظاہر میں خلق خدا کی نظروں میں اعتبار نہیں پایا۔ (۷۸ ص۔ ایضاً)

۱۱۔ یہ وہی یوسف سوداگر ہے جس نے شہزادی سے بے وفائی کی اور زخمی کر کے صندوق میں قلعہ سے نیچے اتار دیا تھا۔

۱۲۔ اگر تان سین اس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سن کر باولا ہو جاتا۔ ص۔ ۳۹ باغ و بہار

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ یہ احساس جمال کیا تھا کہ جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جائے۔ سوداگر فقیر اس کو دیکھتے ہی ڈر گیا۔ ص ۴۰ باغ و بہار

۱۵۔ جب صبح ہوئی اس جوان کو یوسف سوداگر نے جگایا کئی پیالے خمارے کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینا ٹھیک نہیں۔

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ناول کی تاریخ و تنقید۔ ص۔ ۱۶۸

۱۸۔ ایضاً ع۔ز ایضاً ص ۴۴-۴۳ (۲۰)

۱۹۔ ایضاً ص ۴۴-۴۳

۲۰۔ ایضاً ص ۴۴

۲۱۔ ص ۴۷ باغ و بہار

۲۲۔ ص ۵۰ باغ و بہار

۲۳۔ ص ۵۰ باغ و بہار

۲۴۔ ص ۲۲ باغ و بہار

۲۵۔ مٹی نہیں کرم کی دیکھا ص ۶۳ باغ و بہار

۲۶۔ ص ۶۵ باغ و بہار

۲۷۔ ع۔ز

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ابھی دلی دور ہے۔ ہنوز دلی دور است کا ترجمہ ہے۔ یہ حضرت نظام الدین کے زمانے کا محاورہ ہے۔ اور یہ داستان بھی انہیں کے زمانے سے منسوب کی جاتی ہے *سلطان غیاث الدین تغلق شہنشاہ دہلی حضرت نظام الدین اولیا محبوب الہیٰ سے کسی بات پر خفا تھا اور اپنی دانست میں انکی تعزیر کے لیے دہلی آرہا تھا تو دہلی ابھی دور تھی کہ راستے میں بیٹے سلطان محمد تغلق نے سازش کر کے اُسے اثناء راہ میں ختم کرا دیا۔*

۳۰۔ ص ۷۹۔ باغ و بہار

۳۱۔ یہ عجب اس داستان میں پڑھنے میں آتی ہے کہ عجیب و عزیب اور غیر ممکن باتیں دوسروں کے منہ سے کہلوائی گئی ہیں اور ویسا ہی ہوا ہے جیسا کہا گیا تھا۔

۳۲۔ فقیر اور سخی کے تین حرف، مہمانی کے تین حرف، ہر ایک شعبے کے تین اہم پہلوؤں والے معاشرے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ پہلو مختلف تو ہو سکتے ہیں لیکن غیر انسانی نہیں ہو سکتے۔ (ع۔ز)

۳۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہریوں کی ترتیب ہی اس رخ پر ہوتی ہے کہ ہر ایک مہمان ہونا چاہتا ہے اور شہزادی کی نظر میں اچھا بننے کی آرزو رکھتا ہے۔ ع۔ز

۳۴۔ ص ۸۴/۸۳۔ باغ و بہار

۳۵۔ پری زاد آدمی زاد پر یہ الزام داستانوں میں شروع سے رکھتے آئے ہیں اور آدمی زاد پری زادوں کی تلاش میں زمین و آسمان بھر میں بھٹکتے رہتے ہیں اور کہانی کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ص ۱۰۷/۱۰۶ باغ و بہار

۳۸۔ ص ۱۰۸۔ ایضاً

۳۹۔ ص ۱۱۱۔ باغ و بہار

۴۰۔ ص ۱۸۹۔ باغ و بہار

بیتال پچیسی کا تہذیبی مطالعہ

بیتال پچیسی فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی ایک طلسمی کہانی ہے اور بنیادی طور پر ہندو MYTHOLOGY میتھلوجی سے ماخوذ ہے۔ ہندوستان میں علم و حکمت کی بہت باتیں جانوروں، دیوؤں اور اپسراؤں سے لی گئی ہیں اور ان کی زبانی کہلا دی گئی ہیں۔ بیتال ایک بھوت ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ بھوت ماضی کو بھی کہتے ہیں۔ ہماری تمام یادداشتیں اسی بھوت کے حصے میں آئی ہیں جو آخر شجر حیات سے جا کر لٹک جاتا ہے۔ ہم اسے یاد کرکراتے اپنی زندگی میں شامل کرتے ہیں اس سے سبق لیتے ہیں۔ اس سے کہانیاں سنتے ہیں اور جب کوئی کہانی ختم ہو جاتی ہے تو یہ بھوت پھر اسی طرح شجر حیات میں جا کر لٹک جاتا ہے جو خود شاخ در شاخ۔ برگ در برگ ہے۔ ہزاروں پتے، صدہا پتیاں، ان گنت تھرتھراہٹیں اور بھیدوں بھری سرسراہٹیں اس کا حصہ ہیں۔ درخت ہمارے یہاں علم کا نشان بھی اور علم ہماری یادوں کا نشان ہوتا ہے۔ اور یادیں اسی طریقے سے بدلتی اور نیا روپ اختیار کرتی ہیں جیسے ایک درخت سے پچھلے پتے اور پتیاں جھڑ جاتی ہیں اور انہی شاخوں میں، انہی ٹہنیوں اور ڈالیوں میں نئی پتیاں پھوٹ آتی ہیں۔ یہاں بھی شاخوں سے اتارا ہوا بھوت نئی کہانی سناتا ہے ایک نیا تجربہ پیش کرتا ہے اور حقیقت کو نئے معنی پہناتا ہے۔

بکرم اگر دیکھا جائے تو ایک بادشاہ ہے جو تمام دنیا پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور اس

معنی کروہ انسانی دل یا دماغ کی نمائندگی کرتا ہے۔ دل بھی خواہشات کا مرکز ہوتا ہے جذبات اور احساسات کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے اور دماغ تمام حسیات کا مرکز ہے۔ فکر کا سوجھ، تجربوں اور تجزیوں کا۔ یہاں بکرم کے ساتھ ایک دیو بھی ملا ہوا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیو خود اس کا دماغ ہے۔

اس کہانی کا ایک اور معاشرتی پہلو بھی ہے وہ یہ کہ اس کی چار رانیاں ہیں قدیم ہندؤں میں اور بعد کے راجپوت معاشرے میں ایک سمراٹ یا راج پوت ۴ بیویاں رکھ سکتا تھا ان میں سے پٹ رانی ایک ہی ہوتی تھی۔ یہاں چار رانیوں کا تصور ذہن کو اس طرف مائل کرتا ہے کہ یہ کہانی بھی مسلمان تہذیب کے اثرات کی پرچھائیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ چار بیویوں کا تصور مسلمانوں کی آمد سے پہلے قدیم ہندو معاشرت میں اس انداز سے شاید موجود تھیں۔

بیتال پچیسی کی تمہید یا بنیادی کہانی سنگھاسن بتیی میں دوسری کہانی کے طور سے شامل ہے لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ کچھ موجود ہے۔ یعنی جزوی باتوں کا اضافہ بھی سامنے آتا ہے۔ معاشرے میں برہمن کا بڑا مرتبہ تھا۔ لیکن بھیک مانگ کر زندگی گزارنے کو بھی حقارت سے دیکھتے تھے۔ اسلئے امر پھل دیوتا سے ملنے کے بعد برہمن کے مشورے پر راجہ کو دے دیتا ہے اور اس سے دھن لیتا ہے تاکہ زندگی دنیا اور دھرم میں سرخرو رہے۔ لیکن راجہ کو اس پھل سے ایسا تجربہ ہوتا ہے کہ اس پر اپنی چہیتی رانی کی بے وفائی ظاہر ہوتی ہے اور راج پاٹ چھوڑ کر سنیاس لے لیتا ہے۔

جوگی کا جوگ کھونے کے لیے راجہ اندر ہی ایسے منصوبے بناتے رہے ہیں۔ یہاں راجہ کے ایک لاکھ روپے انعام پر ایک عورت جاتی ہے اور اسے ایسے سامنے پڑے آتے ہیں، اس جوگی سے اس کا ایک لڑکا ہو جاتا ہے اور جوگی اس لڑکے کو اپنے کاندھے بٹھائے ہوئے اس عورت کے ساتھ دربار میں چلا آتا۔ جب اسے یہ گمان گذرتا ہے کہ یہ اس کا جوگ بھنگ کرنے کے لیے کیا گیا وہ لڑکے کو لیئے واپس آتا ہے اور شہر سے باہر نکل کے لڑکے کو مار ڈالتا ہے اور خود جنگل میں جا کر جوگ میں لگ جاتا ہے۔

اس کہانی میں جادو ٹونے اور جنتر منتر کی فضا کچھ زیادہ ہے اور اس طرح کا ماحول ہے جیسے سفلی علم کرنے والوں کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ لاش کا درخت سے الٹا لٹکنا ایسی ہی پُر اسرار فضا میں ذہن کو پہنچا دیتا ہے۔ ساعت گھڑی کے نیک یا بدشگون میں یقین معاشرے میں عام تھا۔ اور یہ کہ جوگ کے ذریعے بڑے بڑے کام کیے جا سکتے ہیں جیسے پاتال کے راجہ تیلین کو جوگ سادھ کر مار ڈالا۔ اور مرگھٹ میں بھوت بنا کر سرسی کے درخت سے لٹکا دیا۔ اور وکرم کو مارنے کی فکر کرنے لگا۔ یہ جوگ ہی کا کرشمہ تھا کہ پھل جو جوگی نے راجہ کو دیئے ان میں سے کئی ویسے ہی لعل نکلے۔ راجہ نے جوگی کی یہ معلوم ہونے پر یہ قدردانی کہ گدی پر اپنے ساتھ بٹھایا۔

بعض باتیں مجلس میں کہنے کی ہوتی ہیں اور بعض نہیں۔ جو نہیں ہوتیں انھیں جنتر منتر اوکھد دھرم، گھر احوال، حرام کا کھانا، بری بات سنی ہوئی نمایاں تھیں کیونکہ معاشرے میں یہ یقین پایا جاتا تھا کہ تین آدمی سنیں تو یہ چھپی نہیں رہتیں۔ دو آدمی سنیں تو کوئی سنتا ہے۔ اور اگر ایک آدمی تک ہی رہیں تو ان باتوں کو برہما بھی نہ جانیں۔ غالباً بھادوں کی چودھویں ایسی ساعت مانی جاتی تھی اس میں بڑے بڑے منتر سدھ کیے جاتے تھے۔ جوگ اور جنتر منتر سدھ کرنے کے لیے نہایت ڈراؤنے کام انجام دیئے جاتے تھے اور کسی بُرے کام کو بھی بُرا نہیں جانا جاتا تھا جس کے پس منظر میں محض خود غرضی اور مفاد پرستی کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا تھا۔ اس ضمن میں ایسے ایسے واقعات ہونے والے بیان کیے جاتے ہیں جن پر یقین بھی کرنا مشکل ہوتا ہے۔

پنڈت ہوشیار اور عقلمند لوگوں کے دن گیت اور شاستر کے لطف اور آنند میں کٹتے ہیں اور بیوقوفوں کے دن کل کل اور نیند میں۔ اس لیے بیتال نے کہا اچھی باتوں کے چوچے میں راہ کٹ جائے اے راجہ میں کہتا ہوں اور اسے تو سُنے جا۔ اگر شرط کے خلاف بولے گا تو پھر درخت سے جا لٹکوں گا۔ جو راجہ کے لیے بڑی مشکل شرط تھی۔ کیونکہ وہ دھرمی کرمی تھا، ہوشیار تھا، عالم تھا اور دانا تھا جیسے کہ بڑے اور اچھے راجہ ہوتے تھے کسی بات کے کہنے کے موقع پر ان کا خاموش رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا اسے وہ اتپائے

جانتے تھے کہ دل میں یا زبان پہ آئی بات نہ کہی جائے، چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ ہو۔

بیتال نے پہلی کہانی کہی۔ بنارس راج کا کنور دیوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو گیا۔ جنگل میں بہت دور جا نکلا۔ درخت جن کی گھنی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ اس تالاب کے کنارے نیچے منہ ہاتھ دھوکر اوپر آئے وہاں مہادیو کا مندر تھا۔ گھوڑوں کو باندھ ادھر جاکر مہادیو کے درشن کے بعد باہر نکلے۔ اس بیچ میں کسی راجہ کی بیٹی اپنی سہیلیوں کو ساتھ لیے ہوئے تالاب کے دوسرے کنارے اشنان کرنے لگی۔ اور اشنان دھیان پوجا کے بعد درختوں کی چھاؤں میں ٹہلنے لگی۔ اچانک راجہ کے بیٹے اور راجہ کی بیٹی کی نظریں چار ہوئیں اور راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوگیا۔ راجکماری نے پوجا کر کے کنول کا پھول جو سر ہی میں رکھا تھا کنور کو دیکھ کر وہ پھول ہاتھ میں لے کان سے لگا پھر دانت سے اٹھا چھاتی سے لگا لیا۔ اور سہیلیوں کے ساتھ اپنے راج محل کو گئی۔ یہ نہایت ناامید اور عشق زدہ ہوکر دیوان کے بیٹے کے پاس آیا اور اس سے کل حقیقت کہی اور بولا اگر وہ مجھے نہ ملے گی تو اپنی جان کھو دوں گا۔

دیوان کا بیٹا اسے اپنے گھر لے آیا مگر راجہ کا بیٹا بہت بے چین تھا۔ کنور بولا اب سکھ ہو یا دکھ مجھے عشق ہوگیا ہے۔ دیوان کے بیٹے نے پوچھا آپ نے جاتے وقت اس سے کچھ کہا تھا وہ بولا کچھ نہیں۔ دیوان کے بیٹے نے کہا اس کا ملنا مشکل ہے کنور بولا اگر وہ نہ ملی تو ہماری جان گئی دیوان کے بیٹے نے کہا اس کے اشارے میں سمجھ گیا اور نام اور پتہ سب جان گیا۔ سر کا پھول کان سے لگانے کا مطلب ہے کہ وہ کرناٹک کی رہنے والی ہے اور پاؤں سے جو دبایا تو کہا نام پدماوتی ہے۔ اور دانت سے سو کترا تو بتایا کہ میں نت دبکو راجہ کی بیٹی ہوں پھر جو چھاتی سے لگایا تو کہا تم میرے دل میں بسے ہو۔

پہلی کہانی میں بیتال کنور دیوان کے بیٹے اور پدماوتی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس میں جو بہت دلکش اور پُر اثر منظر نامہ ہے وہ ہیرو اور ہیروئن کا پہلی بار ملنا ہے۔ یہ ملاقات مندر میں پوجا کے وقت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ آغاز عشق کا یہ انداز بھی مسلمانوں کے دَور کی داستان ہے۔ اگرچہ اس کے کچھ

نمونے ہمیں ان قدیم ہندو قصوں میں بھی مل جاتے ہیں، جن میں گندھروا بیادہ کی صورت سامنے آتی ہے۔ یہ بات اس لیے بھی ذہن میں آتی ہے کہ مسلمانوں کے دَور کی عشقیہ داستانوں میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

کنور نے یہ سن کر کہا مجھے اس کے دیس لے چلو اور پھر تیار ہوکر زادِ راہ لے گھوڑوں پر اس سمت روانہ ہوگئے۔ انھوں نے ایک بڑھیا کے یہاں قیام اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد بڑھیا ان کے پاس آ مہربانی سے باتیں کرنے لگی۔ بڑھیا نے کہا میرا بیٹا راجہ کی خدمت میں نہایت ہی آسودہ ہے اور میں راجہ کی بیٹی پدماوتی کو دودھ پلاتی ہوں۔ کنور نے کہا کل جاتے وقت ایک پیغام ہمارا بھی لیتی جانا۔ بڑھیا بولی کل ہی کیوں آج ہی کہو میں جا کہوں گی کنور نے کہا اتنا کہہ دینا کہ جیٹھ کی پنچمی کو تالاب کے کنارے جس کنور کو تم نے دیکھا تھا وہ آ پہنچا۔

اس کے بعد بڑھیا ہاتھ میں لاٹھی لیے راج محل گئی وہاں راج کنیا کو اکیلے بیٹھا دیکھا سلام اور دعا کے بعد کہا جی چاہتا ہے کہ تیری جوانی کا سکھ دیکھوں اور ایسی ہی باتوں میں کہہ دیا وہ پیغام بھی اور بولی وہ کنور تیرے ہی لائق ہے۔ یہ سن کر خفا ہوئی اور صندل ہاتھوں میں لگا بڑھیا کے گالوں میں طمانچے مار کہنے لگی۔ کمبخت تیرے گھر سے نکل۔ بڑھیا حیران پریشان اٹھتی بیٹھتی کنور کے پاس آئی اور سا احوال کہا۔ وہ سن کر ہکا بکا ہوگیا۔ دیوان کے بیٹے نے کہا فکر نہ کیجیے۔ کنور بولا مجھے سمجھا تا کہ مجھے چین آئے۔ اس نے کہا جو صندل سے بھر کر دسوں انگلیاں منھ پر ماریں تو اس نے یہ بتایا کہ دس روز چاندنی کے ہو جائیں تو اندھیرے میں ملوں گی۔ دس روز کے بعد بڑھیا گئی تو اس نے تین انگلیاں کیسر سے بھر کر اس کے گال پر ماریں اور ویسے ہی سخت کلامی سے پیش آئی۔ بڑھیا نے آکر یہ حال بھی کہا۔ کنور غم زدہ ہوا لیکن دیوان کے بیٹے نے کہا کہ اس کا مدعا یہ ہے کہ وہ کپڑوں سے ہے اس لیے تین روز کا وعدہ کیا جو تھے روز تجھے بلائے گی۔ تین روز بعد بڑھیا نے کنور کی طرف خیر و عافیت معلوم کی تو اس نے خفا ہوکر بڑھیا کو پچھم کی کھڑکی سے نکال دیا۔ دیوان کے بیٹے نے اس کا مطلب بتایا کہ آج رات کے وقت تم کو اس کھڑکی کی راہ بلایا ہے۔

اودے رنگ کے جوڑے پگڑیاں باندھ کپڑے پہن ہتھیار لگا تیار ہوئے۔ دو پہر

رات گذر گئی۔ سنسان کا عالم تھا کہ چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ جب کھڑکی کے پاس پہنچے دیوان کا بیٹا باہر کھڑا رہا اور کنور کھڑکی سے اندر گیا۔ دیکھا راج کنیا کھڑکی راہ دیکھتی ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں راج کنیا ہنسی اور کھڑکی بند کرکے کنور کو اپنے ساتھ رنگ محل میں لے گئی جا بجا شمعیں روشن اور سہیلیاں رنگ رنگ کی پوشاکیں پہنے ہاتھ باندھے باادب کھڑی ہیں۔ ایک طرف پھولوں کی سیج بچھی اور قرینے سے عطر دان، گلاب پاش، چنگیری، پوگڑے، ارگجا، مشک، زعفران کٹوریوں میں بھرا ہوا موجود ہے۔ کہیں معجون کی ڈبیاں ہیں، کہیں طرح طرح کے پکوان ہیں۔ در و دیوار نقش و نگار سے آراستہ اور ان پر ایسی مورتیں بنی ہوئی کہ کوئی دیکھتے ہی محو ہو جائے۔ مختصر یہ کہ سب عیش و طرب کے ساز و سامان مہیا ہیں۔ راجکماری نے کنور کے پاؤں دھلوا، بدن میں صندل لگا، پھولوں کا ہار پہنا، گلاب چھڑک، پنکھا اپنے ہاتھ سے جھلنی لگی۔ کنور بولا تمہارے نازک نازک ہاتھ پنکھے کے لائق نہیں ہیں پنکھا دو۔ پدماوتی بولی آپ بڑی محنت اور مشقت اٹھا کر ہمارے لیے آئے ہیں ہم پر آپ کی خدمت لازمی ہے۔ پھر ایک سہیلی نے پدماوتی کے ہاتھ سے پنکھا لے لیا اور کہا یہ ہمارا کام ہے، اور وہ دونوں پان کھاتے لگے اور محبت کی باتیں کرتے رہے، اتنے میں صبح ہو گئی۔ پدماوتی نے اسے چھپا رکھا اور جب رات ہوئی پھر عیش میں مشغول ہو گئے۔ یوں کئی دن گذر گئے۔ جب کنور جانے کا ارادہ کرتا تو پدماوتی جانے نہ دیتی۔ ایک مہینہ گذر گیا تو کنور بہت گھبرایا اور ایک رات اکیلا بیٹھا ہوا تھا یہ سوچتا تھا کہ گھر بار راج پاٹ سب کچھ چھوٹا لیکن ایک دوست جس کی وجہ سے یہ عیش و راحت پایا۔ مہینہ بھر سے نہیں ملے۔ وہ کیا کہتا ہوگا۔ اس سوچ میں تھا کہ پدماوتی آ گئی اور حالت دیکھ کر پوچھنے لگی تمہیں کیا دکھ ہے۔ کنور نے کل حقیقت کہہ سنائی۔ پدماوتی بولی آپ کا خیال تو وہاں ہے آپ یہاں کیا سکھ پائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اس وقت جائیے۔ میں کل تیاری کیے دیتی ہوں۔ اسے کھلا پلا اس کی خاطر جمع کرکے بالکل بے فکری سے آئیے۔ کنور اٹھ کر باہر آیا اور پدماوتی نے زہر ملوا کر طرح طرح کی مٹھائی بنوا کر بھجوائی۔ کنور جا کر دیوان کے لڑکے کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ پکوان آ گیا۔ دیوان کے بچے نے معلوم کیا یہ مٹھائی کیسے آئی۔ کنور نے حقیقت بتائی دیوان کا بیٹا

تر زہر لائے ہو اچھا ہوا کہ تم نے نہیں کھائی۔ اور بتایا کہ عورت اپنے دوست کے دوست کو نہیں چاہتی۔ آپ کو میرا نام وہاں نہیں لینا تھا۔ کنور نے کہا یہ انہونی بات تم کہتے ہو۔ اگر آدمی آدمی سے ڈرے تو خدا اسے تو ڈرے گا۔ یہ کہنے کے بعد ایک لڈو کتے کے آگے ڈال دیا۔ کتا کھاتے ہی مر گیا۔ یہ دیکھ کر کنور کے دل میں غصہ آیا اور وہ کہنے لگا ایسی بری عورت سے ملنا لازم نہیں۔ دیوان کا بیٹا بولا جو ہوا سو ہوا۔ اب ایسی بات ہو جس سے اس کو اپنے گھر لے چلیے۔ کنور نے کہا یہ بھی تم ہی کرو گے۔ دیوان کے بیٹے نے کہا آج ایک کام کیجیے وہاں جائیے پہلے تو اس سے بہت سا اخلاص پیار کرو۔ جب وہ سو جائے تب اس کا زیور اتار یہ ترشول اس کی بائیں ران میں مار فوراً چلے آؤ۔

کنور رات کو پدماوتی کے پاس گیا اور اس طرح سے کیا جیسا کہ دیوان کے بیٹے نے کہا تھا۔ اور سارا زیور گھر آ کر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ زیور لے راج کو ساتھ لے جوگی بن ایک مرگھٹ میں جا بیٹھا۔ خود گرو ہوا اور کنور کو چیلا بنا کر اس سے کہا اسے بازار جا کر بیچ آؤ۔ اگر کوئی پکڑے اسے میرے پاس لے آؤ۔ کنور نے زیور کو لے جا کر راجہ کی ڈیوڑھی کے متصل ایک سنار کو دکھایا۔ اس نے پہچان لیا یہ راجکماری کا زیور ہے... وہ اس سے معلوم کرنے لگا کہ دس بیس آدمی اکٹھے ہو گئے۔ کوتوال نے یہ خبر سنی آدمی بھیج کر راجکمار کو مع زیور اور سنار پکڑوا منگوایا۔ جب کنور نے کہا مجھے گورو نے بیچنے کو دیا۔ کوتوال نے گورو کو بھی پکڑوا منگوایا۔ دونوں کو کوتوال نے زیور سمیت راجہ کے سامنے پیش کیا۔ راجہ نے جوگی سے پوچھا کہ ناتھ جی یہ زیور تم نے کہاں سے پایا۔ جوگی بولا کالی چودس کی رات کو میں مرگھٹ میں ڈاکنی منتر کو سدھ کرنے کو گیا۔ جب وہ ڈاکنی آئی تو میں نے اس کا زیور اور کپڑا اتار لیا اور بائیں ران میں اس کے ترشول کا نشان کر دیا۔ یہ سن کر راجہ محل میں گیا۔ راجہ نے رانی سے کہا تو پدماوتی کی بائیں جانگھ میں دیکھ ترشول کا نشان ہے کہ نہیں۔ رانی نے آ کر راجہ سے کہا تین نشان برابر ہیں جیسے کسی نے ترشول مارا ہے۔ راجہ یہ سن کر باہر آیا اور کوتوال سے کہا جوگی کو لے آؤ۔ کوتوال گیا اور راجہ اپنے دل میں حیران ہو کر کہنے لگا۔ گھر کا احوال، دل کا ارادہ اور جو کچھ نقصان ہوا وہ کسی پر ظاہر کرنا مناسب نہیں۔

کوتوال کے جوگی کو حاضر کرنے پر راجہ نے جوگی کو کنارے لے جا کر پوچھا گسائیں جی دھرم شاستر میں عورت کے لیے کیا سزا ہے۔ جوگی نے کہا برہمن، دوسری عورت کا لڑکا اور جو کہ اپنے ہی آسرے میں ہو اگر کسی سے کھوٹا کام ہو تو دیس نکالا دیجیے۔ راجہ نے اس بات پر عمل کرتے ہوئے پدماوتی کو ڈولی سوار کروا ایک جنگل میں چھڑوا دیا۔ ادھر کنور اور دیوان کا بیٹا گھوڑوں پر سوار اس جنگل میں جا پدماوتی کو اپنے ساتھ اپنے شہر روانہ ہوئے اور چند روز بعد دونوں اپنے اپنے باپ سے ملے۔ اس سے چھوٹے بڑوں کو نہایت خوشی ہوئی اور عیش و آرام کرنے لگے۔

بیتال نے راجہ بکرماجیت سے معلوم کیا ان چاروں میں گناہ کس کا ہوا۔ اگر تم انصاف کی بات نہ کہو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ بکرماجیت نے کہا راجہ کو ـــــ بیتال نے پوچھا وہ کیسے ـــــ بکرماجیت نے کہا دیوان کے بیٹے نے تو اپنے مالک کا کام کیا اور کوتوال نے راجہ کا حکم مانا۔ راجکماری نے اپنا مقصد حاصل کیا۔ اس لیے راجہ کو پاپ ہوا کہ بغیر غور کیے راجکماری کو دیس نکالا دیا۔ اس بات پر بیتال پھر اس درخت پر جا لٹکا۔

قدیم ہندو معاشرت میں سال کے کچھ دن ہوتے تھے جن میں لوگ حسب توفیق تیرتھ یاترا کیا کرتے تھے اور دور دور کے تیرتھوں پر جاتے تھے۔ ہر سال کی تیرتھ یاترا کے دن کے علاوہ تیسرے سال، ساتویں، بارہویں سال کے بڑے اور خاص تیرتھوں کے دن ہوتے تھے۔ جیسے کاتک کا نہان یا بیساکھی کا تیرتھ تہوار ـــــ جیٹھ کی پنچمی بھی ایک ایسا ہی تیرتھ کا دن تھا۔

تجارت اور سوداگری بھی انسانی معاشرت کا ایک حصہ رہی ہے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں تاجر اور سوداگر جاتے تھے اور ایک ملک کے سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتے تھے۔ بعض مقصد کے لیے لوگ اسے حیلہ بھی بنا لیا کرتے تھے۔ سرائے میں اترتے تھے یا مناسب مقصد مقام کا انتخاب کر لیتے تھے۔

چندن اور کیسر اس معاشرے کی ایک طرح سے تہذیبی علامتیں ہیں۔ یہ خوشبودار چیزیں جن میں سے ایک کشمیر اور دوسری کرناٹک میں ہوتی ہے۔ اس دور کے ہندو معاشرے کو جوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کنور کے خیر مقدم کے لیے جو آراستگی کا سامان کیا گیا تھا وہ اعلیٰ معاشرت کے جز ہی سمجھے جاتے تھے ـــــ رنگ برنگ کی پوشاکیں پہنے باادب خادمائیں، عطردان، گلاب پاش، چنگیری، چوگھڑے، ارگجا، مشک زعفران کو ڑیوں میں بھرا ہوا، ہر کہیں دھرا ہوا، اچھی اچھی معجون کی ڈبیاں، پکوان علاوہ بریں در و دیوار منقش، ایسے نقش کہ جنھیں دیکھتے ہی ہر دل خوش ہو جائے۔ سجی ہوئی پھولوں کی سیج، صندل بدن میں لگانا، پھلوں کا ہار پہنانا، گلاب چھڑکنا اور خود پنکھا جھلنا معاشرت میں کسی محبوب شخصیت کے لیے ضروری خیال کیے جاتے تھے۔

عورت اپنے لیے محبت میں کسی کے دل میں کسی اور کا خیال بھی شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ شاید شروع معاشرت ہی سے عورت کا چلن رہا ہے اور اس کی بڑی خصوصیت مانی جاتی رہی ہے۔ اس لیے پدماوتی زہریلی مٹھائی اور زہر سے تیار کیے ہوئے پکوان دیوان کے بیٹے کے لیے بھیجتی ہے۔ مگر وہ عورت کی فطرت کو جانتا تھا۔ اس لیے جب جانچا گیا تو اس کے کھانے سے کتا مر گیا۔

پدماوتی کو ساحرہ (ڈاکنی) بنانے کے لیے دیوان کے بیٹے نے عجیب و غریب ترکیب سوچی اور اس خیال کو راجہ کے دل میں بٹھا دیا کہ پدماوتی ساحرہ ہے اس لیے راجہ اسے جنگل میں چھوڑوا دیتا ہے اور یہ دونوں اسے لے کر اپنے دیس کو لوٹتے ہیں۔ تینوں اپنے اپنے مقصد کو پہنچتے ہیں۔ دیوان کے بیٹے نے اپنے مالک کنور کے تئیں اپنا فرض ادا کیا۔ کوتوال نے راجہ کا حکم مانا۔ پدماوتی نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ لیکن راجہ نے غور نہیں کیا اور اسے دیس نکالا دے دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کی ترتیب کے وقت مسلم اور راجپوت معاشرے میں جو نئے رویے آ گئے ہیں ان کے بھی اثرات موجود ہیں مثلاً زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش اور اس سے بچنے کے لیے کھانا کتے کے آگے ڈال دینا قدیم ہندو معاشرت میں کتا موجود ہے مگر اتنا قریب نہیں کہ جو بعد کی راجپوت معاشرت میں دیکھنے کو ملتا ہے نہ مغل دور کے بعض راجاؤں کے دربار میں کتا بیٹھا ہوا ہے۔ قدیم کہانیوں میں ہم ایسی کوئی روایت بھی نہیں پڑھتے جن میں دھوکے سے زہر ملایا گیا ہو۔ یہ بعد کے اثرات معلوم ہوتے ہیں اور

قدیم ہندو معاشرت میں ان برتنوں کی بھی نہیں دیکھتے تو ایسے پتھر سے بنائے جاتے ہیں جن میں زہر کا اثر فوراً ظاہر ہو جاتا ہے۔

نرک میں جانے کا خوف اس معاشرت میں بھی سب سے بڑی سزا مانی جاتی تھی، اور لوگوں کو بہت سی برائیوں اور بدیوں سے روکتا تھا۔ بکرم واپس گیا اور درخت پر سے مردہ کو باندھ کاندھے پر رکھ کر لے چلا۔ پھر بیتال نے دوسری کہانی کہی دھرم استھل کا راجہ تھا۔ جو جمنا کے پاس ایک نگر ہے اس نگر میں کیشورام برہمن رہتا تھا وہ جمنا کے کنارے ریاضت کیا کرتا تھا۔ مدھماوتی اس کی بیٹی نہایت خوبصورت تھی۔ جب وہ شادی کے قابل ہوئی تو ماں باپ اور بھائی اس کی شادی کی فکر کرنے لگے۔ برہمن کسی مہمان کے ساتھ ایک روز کہیں شادی میں گیا تھا اور اس کا بھائی گاؤں گورو کے یہاں پڑھنے کو گیا تھا کہ گھر میں ایک برہمن کا لڑکا آیا۔ ماں نے لڑکے کی صورت سیرت دیکھ کر کہا میں اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے کروں گی۔ برہمن جہاں گیا تھا وہاں ایک اور برہمن کے بیٹے کو بیٹی دینی قبول کی۔ اور اس کے بیٹے نے جہاں پڑھنے گیا تھا وہاں ایک برہمن کو قول دیا۔ کئی دنوں بعد وہ دونوں ان دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر آئے۔ تیسرا لڑکا پہلے سے موجود تھا۔ ان کے نام تھے تو بکرم، بامن اور مدھوسودن۔ وہ خوبصورتی، علم و ہنر میں برابر تھے۔ برہمن سوچ میں پڑ گیا کہ کنیا کسے دوں اور کسے نہ دوں اور تینوں نے ان سے قول ہارا ہے۔ اس فکر میں تھا کہ اس لڑکی کے سانپ نے کاٹا اور مر گئی ـــــ وہ تینوں لڑکے اور باپ بھائی جتنے جنتر منتر والے تھے سب کو لے آئے۔ ان سب نے دیکھ کر کہا یہ زندہ ہونے کی نہیں۔ پہلا کہتا تھا پنچمی، چھٹ، اشٹمی، نومی اور چودس میں سانپ کا کاٹا جیتا نہیں۔ دوسرا بولا سنیچر، منگل وار کا ڈسا ہوا بھی زندہ نہیں رہتا۔ تیسرا بولا روہنی، مگھا، اشلیکھا، بساکھا، مول، کرتکا نچھتروں کا زہر چڑھا ہوا اترتا نہیں۔ چوتھے نے کہا اندری، ادھر، کپول، گلا، کوکھ، ناف، رگوں میں کاٹا ہوا نہیں بچتا۔ پانچواں بولا کہ برہما بھی نہیں جلا سکتا۔ یہ کہہ کر سب گئے اور برہمن اس کو مرگھٹ لے چلا۔ ان تینوں جوانوں نے اس کو پھونک دیئے جانے اور برہمن کے چلے جانے کے بعد یہ باہم طے کیا کہ ایک تو اس کی جلی ہڈیوں کو چن فقیر ہو جاوے اور بن بن پھرے۔ دوسرے اس کی راکھ کی

گٹھری باندھ وہیں جھونپڑی بنا رہنے لگے۔ تیسرا جوگی ہو جھولی کھولے دیس دیس پھرنے لگے۔

تیسرا ایک دن کسی مقام پر ایک برہمن کے گھر بھوجن کے لیے گیا۔ وہ برہمن اسے دیکھ کر کہنے لگا آج یہیں بھوجن کیجیے۔ جب رسوئی تیار ہوئی اس کے ہاتھ پیر دھلوائے اور لے جا کر چوکے میں بٹھایا اور آپ بھی اس کے پاس بیٹھا۔ برہمن نے کھانا دیا۔ کچھ دیا تھا اور کچھ باقی تھا کہ چھوٹے لڑکے نے رو کر اپنی ماں کا آنچل پکڑا وہ چھڑاتی تھی اور وہ نہ چھوڑتا تھا۔ جتنا وہ بہلاتی اتنا وہ مچلتا۔ برہمنی نے خفا ہو کر لڑکے کو جلتے چولھے میں اٹھا کر ڈال دیا اور وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جوگی کھائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ گھر والا بولا کہ تو کھانا کیوں نہیں کھاتا۔ وہ بولا جس گھر میں دیونی ہو اس گھر میں کس طرح کوئی کھانا کھائے۔ یہ سن کر وہ گھر میں ایک اور طرف جا سنجیونی ودیا کی کتاب لا اور اس میں سے ایک منتر نکال پڑھ کر لڑکے کو زندہ کر دیا۔ وہ جوگی اس عجوبے کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچنے لگا، اگر یہ کتاب میرے ہاتھ لگے تو میں اس اپنی پیاری کو زندہ کروں۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے کھانا کھایا اور وہیں سو رہا۔ جب رات ہوئی تو کافی دیر کے بعد سب نے بکوان پوریاں وغیرہ کھایا اور اپنی اپنی جگہ لیٹے (جوگی) برہمن بھی ایک طرف جا کر پڑ گیا۔ لیکن پڑا پڑا جاگتا تھا۔ جب یہ جانا کہ سب سو گئے ہیں وہ چپکے سے اٹھا اور اس گھر میں جا وہ کتاب لے چلا اور کئی دنوں بعد اس مرگھٹ میں جا پہنچا۔ ان دونوں برہمنوں کو وہیں پایا۔ آپس میں بیٹھے باتیں کرتے تھے یہ دونوں اس کو پہچان کر اس کے پاس آئے اور ملاقات کی۔ انھوں نے پوچھا دیس بدیس پھرے کہو کوئی ودیا بھی سیکھی ہے۔ وہ بولا میں نے موت سنجیونی ودیا سیکھی ہے۔ وہ بولے تو ہماری پیاری کو زندہ کرو۔ اس نے کہا راکھ اور ہڈیوں کا ڈھیر کرو۔ پھر اس نے پوتھی میں سے ایک منتر نکال جپا۔ وہ کنیا جی اٹھی۔ ان تینوں کو خواہش نفسانی نے اندھا کیا اور وہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ یہاں تک کہانی کہہ کر بیتال بولا اے راجہ وہ استری کس کی ہوئی۔ راجہ بکرم بولا جو منڈھی باندھ کر رہا تھا اس کی۔ اگر وہ ہڈیاں نہ رکھتا تو کیسے زندہ ہوتی۔ اور دوسرا ودیا نہ سیکھ آتا تو کیونکر زندہ

کی جا سکتی۔ راجہ نے کہا جس نے ہڈیاں رکھی تھیں وہ تو اس کے بیٹے کی جگہ ہوا، اور جس نے زندگی بخشی وہ اس کا باپ ہوا۔ اس سے وہ استری اس کی ہوئی جو راکھ سمیٹ جھونپڑی باندھ رہا۔ یہ سنتے ہی بیتال پھر اس درخت میں جا لٹکا اور راجہ بھی اس کے پیچھے گیا۔ علاوہ بریں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں یہ معاشرہ کئی انوکھی روایتوں پر یقین رکھتا تھا۔ سانپ کے کاٹے کا زہر اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک اور جنتر منتر کو نہایت موثر مانتا تھا۔ اس کے ماسوا یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ پنچمی، چھٹ، اشٹمی، نومی، چودس کو سانپ کے کاٹے کا آدمی بچتا نہیں یا سنیچر اور منگل کا ڈسا ہوا بھی زندہ نہیں رہتا۔ یا روہنی، پکھ اشلیکھا، بشاکھا، مول کرتکا نچھتروں کا چڑھا ہوا زہر اترتا نہیں یا اندری ادھر کیول تلا کوکھ نابہ رگوں ہیں سانپ کا کاٹا نہیں بچتا بلکہ یہ بھی کہ برہما بھی ان حالتوں میں نہیں بچا سکتا۔ جھاڑنے پھونکنے والے کیا بچا سکتے ہیں۔

یہ تصورات اب بھی موجود ہیں اور قدیم عقیدوں کا عکس پیش کرتے ہیں کہ فلاں روز شروع ہونے والی بارش اتنے دنوں رہتی۔ فلاں وقت کی لگی ہوئی چوٹ اچھی نہیں ہوتی اور اسی طرح فلاں لمحے کی پیدائش انسان کو خوش قسمت یا بدقسمت بتاتی ہے یہی تصور ہمیں زہر کے اثر کے ساتھ بھی ملتا ہے اور اس کہانی میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ پھر اس کا پلٹ برہما بھی نہیں کر سکتا۔ یہ شاید اسی لیے ہے کہ ہندو دیوتا اپنے عمل میں آزاد ہوتے ہیں اسی لیے سانپوں کی دیوی منسا بھی ایک ایسی قوت کی مالک ہے جس کا توڑ کسی کے پاس نہیں۔

معاشرے میں مہمان اور برہمن کا بڑا خیال کیا جاتا تھا اور کسی صورت میں اسے بنا کھائے اور بھوجن کیے نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جب کوئی موت ہو جاتی تھی تو کھانے پرسے بنا کھائے اُٹھ جایا کرتے تھے لیکن میزبان عجب حالت میں ہوتا تھا خصوصاً جب مہمان برہمن ہو۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گرہستن کا برتاؤ گھر کے بچوں سے ایسا ہو جیسا دیوتی کا ہوتا ہے تو اس گھر میں کھانا دھرم کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ دیوتی کا لفظ بھی مسلمانوں میں رائج رہا ہے۔ ہندوؤں میں دیوا یے حد قوت کی نشاندہی

کرتا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ طاغوتی قوت کا نشان بھی ہے۔ اسی طرح دیوتی بھی ہندوؤں میں مہادیو، شیوجی مہاراج کو کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ادب میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں جو دیو کے ساتھ بڑھائی اور خدائی قدرت کو مختص کرتا ہو۔

اس کے علاوہ کسی جاندار کو زندہ کرنے یا جل بھن کر راکھ ہوئے کو پہلے جیسا کر دینا ہندو معاشرت میں غالباً یہ تصور راکھ ہو جانے کے بعد اصل جسم کو زندگی دی جا سکتی ہے یہ تصور نیا نہیں ہے۔ بزرگوں کے کرشمے یا پیغمبروں کے معجزے بیان میں بھی ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ اقبال نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ سمندر کے لیے خاکستری سامان موجود ہے۔ اس میں بھی کچھ ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی تصورات پر ایسے واقعات کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ بہرحال اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ انسان مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد بھی زندگی پا جانے پر یقین رکھتا ہے۔

اگرچہ بعض قبائلی گروہوں اور معاشرتوں میں ایسے رسوم و رواج بھی ملتے ہیں جہاں عورت ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کرتی ہے یا ان کی بیوی ہو کر رہتی ہے۔ لیکن اس کے خلاف بھی انسانی جذبات بہت عام ہیں۔ جب وہ مرد یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی صرف اس کی ہو کر رہے اور کسی دوسرے کو اس پہ اختیار نہ ہو۔ بعض جانوروں میں بھی جبلّی طور پر یہ رجحان ملتا ہے کہ وہ اپنی مادہ کو کسی دوسرے نر کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہاں بھی اس جذبے کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ویسے ان تینوں کی خواہش کو ناجائز نہیں سمجھا گیا۔ اس موقع پر راجہ نے جو فیصلہ دیا وہ عجیب و غریب تھا اور جسے کہانی کا ایک بہت ہی غیر معمولی رُخ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں میں راکھ یا پھول بہانے کے لیے بیٹا ہی جاتا ہے۔ لیکن یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس کی وہ راکھ تھی وہ تو کنواری تھی اسی طرح جس نے جنم دیا وہ باپ کا درجہ رکھتا ہے لیکن یہاں وہ جنم نہیں دے رہا ہے بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت میں لا رہا ہے۔ اور اپنے منتر سے اچھا کر رہا ہے۔ اس لیے کسی ایک کے حق میں فیصلہ واقعی مشکل ہے۔ کہانی ہندو تہذیب کے مطالعے کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم کبیر داس اور ہندو تہذیب سے وابستگی رکھنے والے بعض دوسرے بزرگوں کی کہانیوں میں یہ قصہ بھی پڑھتے ہیں کہ موت کے بعد ان کے دفنانے اور جلانے پر جھگڑا ہوا تو ان کی لاش پھولوں میں بدل گئی جسے دونوں پارٹیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا یہاں بھی یہی ہوا ہے۔ ہم کسی کہانی کے جنم لینے یا ایک خاص روپ اختیار کرنے کو جب تہذیب و تاریخ کے منظر میں دیکھتے ہیں تو اس کی توجیہہ ہمیں اسی طرح کے تعبیری افکار کی طرف لاتی ہے۔

بردوان میں روپ سین راج کرتا ہے۔ ایک دن وہ اپنی ڈیوڑھی کے قریب ایک مکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ دروازے کے باہر سے کچھ اوپری لوگوں کی آواز آنے لگی۔ راجہ نے کہا دروازے پر کون ہے اور کیا شور ہے۔ دربان نے بتایا۔ دولت مند کی ڈیوڑھی پر بہت سے لوگ جان و مال کے لیے آ بیٹھے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں راجہ سن کر چپ ہو رہا۔ اس بیچ میں دکن کی طرف سے بیربر نامی ایک راجپوت راجہ کے پاس نوکری کے لیے ڈیوڑھی پر آیا۔ دربان نے راجہ کو خبر دی اور راجہ کے حکم پر اسے راجہ کے روبرو لا حاضر کیا۔ راجہ نے پوچھا کہ تجھے روز کے لیے خرچ کے واسطے کیا دوں وہ راجپوت بولا ہزار تولے سونا۔ راجہ نے معلوم کیا تمھارے ساتھ کتنے لوگ ہیں، اس نے بتایا ایک بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی ــــــ یہ سن کر راجہ کے دربار کے لوگ منھ پھیر پھیر کر ہنسنے لگے۔ لیکن راجہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اتنا مال اس نے کس واسطے مانگا۔ مگر آپ ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اتنا مال دیتا ہوں شاید کسی روز کام آوے اور بھنڈاری کو کہا ہزار تولے سونا ہمارے خزانے سے بیربر کو روز دیا کرو۔ بیربر نے ہزار تولے سونا اس روز کا لیا اور اپنی جگہ لا اس کے حصّے کو آدھا تو برہمنوں کو بانٹا اور آدھے کے پھر دو حصّے کرکے ایک حصّہ انیت بیراگی وشنو سنیاسیوں کو بانٹ دیا اور جو رہا باقی کا ایک حصّہ، اس کا کھانا پکوا کر غریبوں کو کھلا دیا اور جو بچا وہ آپ کھایا۔ اس طرح کئی روز تک سلسلہ چلتا رہا۔ اور شام کو ڈھال تلوار لے کر راجہ کے پلنگ چوکی میں حاضر رہتا اور جب راجہ چونک کر پکارتا تو وہ جواب دیتا کہ بیربر حاضر ہے۔ جو حکم ہو۔ راجہ جو حکم دیتا وہ کام راجپوت انجام دیتا اور رات بھر ہوشیار رہتا۔ بلکہ آٹھوں پہر اپنے آقا کی یاد میں رہتا۔

مختصر یہ کہ ایک دن رات کے وقت مرگھٹ سے رونے کی آواز آئی۔ راجہ نے کر پکارا۔ اور بیربر حاضر ہوا۔ راجہ نے حکم دیا جہاں سے رونے کی آواز آئی ہے وہاں جاؤ اور رونے کا سبب معلوم کرکے جلد آؤ۔ یہ کہہ کر راجہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ کسی کو اپنا نوکر آزمانا ہو تو وقت بے وقت اس سے کام کو کہے۔ اس طرح سے بھائیوں اور دوستوں کو بُرے وقت میں پرکھنا چاہیئے اور عورت کو مفلسی میں جانچنا چاہیئے۔

راجپوت رونے کی آواز پر گیا اور راجہ بھی کالے کپڑے پہن کر اس کی ہمت دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ بیربر وہاں پہنچا جہاں عورت بیٹھی رو رہی تھی۔ دیکھا کہ سر سے پاؤں تک زیوروں سے لدی ایک خوبصورت عورت دہاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ کبھی ناچتی کبھی کودتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں۔ مگر سر پیٹ ہائے ہائے کرتے ہوئے زمین پر پٹکیاں کھاتی ہے۔ بیربر نے اس سے پوچھا تو کیوں اتنا روتی ہے۔ تجھے کیا دکھ ہوا ہے۔ وہ بولی میں راج لکشمی ہوں میں اس لیے روتی ہوں کہ راجہ کے راج میں شور دکرم ہوتا ہے اس سے اس کے گھر میں لکشمی آوے گی اور میں اس کے گھر سے جاؤں گی۔ راجہ ایک مہینہ بعد بہت دکھ پائے گا اس دُکھ سے روتی ہوں۔ میں نے اس کے گھر میں بہت سُکھ پایا۔ اس لیے یہ پچھتاوا ہے بیربر نے پوچھا اس کا کوئی ایسا علاج ہے کہ راجہ بچے اور سو برس جیے۔ وہ بولی مشرق کی طرف چار کوس پر دیوی کا مندر ہے تو اس دیوی کو اپنے بیٹے کا سر اپنے ہاتھ سے کاٹ کر دے۔

بیربر یہ سنتے ہی اپنے گھر گیا اور راجہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گھر میں آکر بیربر نے اپنی بیوی کو جگایا اور کُل احوال بیان کیا۔ اس نے سنتے ہی بیٹے کو جگایا اور اس سے کہا، بیٹا تمھارا سر دینے سے راجہ کی زندگی بچتی ہے اور راج بھی قائم رہتا ہے۔ وہ لڑکا بولا ماں، ایک تو آپ کا حکم دوسرے آقا کا کام تیسرے یہ دیوتا کے کام آوے تو اس سے اچھی کون بات۔ بیٹا

---

[1] سنگھاسن بتیسی کی ایک کہانی میں راجہ بکرما جیت ایک لاکھ روپیہ روزینہ طلب کرتا اور اسے بالکل اسی انداز سے اٹھاتا رہتا۔ مگر وہاں راجہ نہیں بلکہ ایک دولت مند تاجر ہے۔ راجہ بکرما جیت کہتا ہے کہ میں مشکل میں آتا ہوں۔ (رع۔ ت)

ہوئے تو اپنے باپ کا اور جسم تندرست علم سے نفع دوست ہوشیار اور عورت حکم بردار۔ — اگر یہ پانچ باتیں آدمی کو حاصل ہوں تو یہ سُکھ دینے والی اور دُکھ دُور کرنے والی ہیں۔ اگر نوکر بے مرتی راجہ بخیل اور دوست فریبی اور بیوی نافرمان ہو تو یہ چاروں باتیں آرام کو ختم کرنے والی ہیں۔

بیر برنے اپنی بیوی سے کہا اگر تو اپنی خوشی سے اپنے بیٹے کو دے تو میں لے جا کر راجہ کے لیے دیوی کو بل دوں۔ وہ بولی مجھے بیٹا بیٹی بھائی بند ماں باپ کسی سے کچھ کام نہیں۔ میری نجات آپ سے ہے۔ دھرم شاستر میں بھی یوں ہی لکھا ہے کہ عورت نہ دان سے سدھ ہوتی ہے نہ برت سے۔ لنگڑا، لولا، بہرا، اندھا، کانا، کوڑھی کیسا ہی اس کا شوہر ہو اس کو اس کی خدمت کرنے سے فائدہ ہے۔ اگر دنیا میں عبادت کرے اور شوہر کا حکم نہ مانے تو دوزخ میں پڑے۔

بیٹا بولا جس آدمی سے آقا کا کام ہووے دنیا میں اس کا زندہ رہنا اچھا ہے اور اس میں دونوں جہان کا بھلا ہے۔ اس کے بعد اس کی لڑکی بولی اگر ماں دیوے زہر لڑکی کو اور باپ بیچے بیٹے کو اور راجہ لے سب کچھ چھین تو پھر کس کی پناہ لے۔ یہ کہہ کر وہ چاروں آپس میں مشورہ کر کے دیوی کے مندر کو گئے۔ راجہ بھی چھپتے ہوئے ان کے پیچھے چلا۔ بیر بر وہاں پہنچ کر مندر میں جا کر دیوی کی پوجا کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا دیوی میرے بیٹے کی قربانی دینے سے راجہ کی سو برس کی عمر ہووے۔ یہ کہہ کر ایک کھانڈا ایسا مارا کہ لڑکے کا سر زمین پر جا گرا۔ لڑکی نے اپنے گلے پر ایک کھڑک ماری تو وہ گر پڑی۔ بیٹے بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر بیر بر کی عورت نے بھی تلوار اپنی گردن پر ماری اور سر دھڑ سے جدا ہو گیا۔ اور چاروں کا یہ حال دیکھ کر راجہ نے اپنے دل میں کہا میرے واسطے یہ جانیں گئیں ایسے راج کرنے کو لعنت، ایسا راج کرنا دھرم نہیں۔ یہ سوچ کر راجہ نے چاہا کہ کھانڈا مار کر مرجائے کہ دیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا بیٹے مجھے تیری ہمت سے خوشی ہوئی تو جو مانگے میں وہ تجھے دوں۔ راجہ نے کہا ماتا اگر تو خوش ہوئی ہے تو ان چاروں کو زندہ کر دے۔ دیوی بولی یہی ہوگا اور پاتال سے امرت لا کر چاروں کو زندہ کر دیا۔ اس کے بعد راجہ نے اپنا آدھا راج بیر بر کو بانٹ دیا۔

یہ کہہ بیتال بولا۔ اس نوکر کو شاباش ہے جس نے آقا کے لیے اپنی زندگی اور اپنے خاندان کا خیال نہ کیا۔ اور مبارک ہے وہ راجہ جس نے راج اور اپنی زندگی کا لالچ نہ کیا۔ اے راجہ تجھ سے پوچھتا ہوں ان سب میں کسی کا کام سب سے بڑھ کر ہوا۔ بکرما جیت نے جواب دیا۔ راجہ کا۔ بیتال نے پوچھا کس وجہ سے۔ بکرما جیت نے کہا کہ مالک کے واسطے جان دینا نوکر کو لازم ہے۔ یہی اس کا دھرم ہے۔ لیکن راجہ سے نوکر کے لیے راج پاٹ چھوڑ جان کو تنکے کے برابر بھی نہ جانا اس وجہ سے راجہ کی صداقت اور اس کا دھرم کہیں زیادہ رہا۔ یہ سنتے ہی بیتال پھر اس درخت پر جا لٹکا۔

دولت مندوں کی ڈیوڑھیوں پر جان و مال کے لیے اس وقت بہت سے لوگ آن ٹھہرا کرتے تھے اور دولت مندوں کے دان پُن سے ان کی ضرورتیں پوری ہوا کرتی تھیں یعنی معاشرہ دان پن کا خصوصی تصور رکھنے والا معاشرہ تھا۔

مغلوں کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی ملازم روزانہ کی دی جانے والی تنخواہ پر رہتے تھے اس میں بھی اس کا تصور ملتا ہے لیکن تنخواہ وہ ہے جس کا قبول کرنا کسی بادشاہ کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ لیکن بادشاہ تو بادشاہ ہوتا ہے وہ آن کی آن میں اپنا سارا ملک اور خزانہ بھی لُٹا سکتا ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اتنا بڑا روزینہ اور تنخواہ تو کوئی راجہ ہی مان سکتا تھا جو خود بھی مہادانی ہو۔ جس کا مظاہرہ آنے والے بیر بر نے کیا۔

بادشاہ سے ہزار تولہ سونا روزینہ لینے والا شخص مال و دولت سے کوئی لالچ نہیں رکھتا وہ خود بھی اس کو دان پن میں خرچ کرتا ہے اور اس سے برہمنوں، مہمانوں، سادھوؤں، سنتوں اور غریبوں کی سیوا کرتا ہے اس لیے یہی صفات سماج میں بڑی انسانی خوبیاں تھیں۔ کنجوس اور لالچی آدمیوں کو بہت بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس کہانی سے وفاداری کا جو معیار سامنے رکھا گیا ہے وہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے لکشمی خود راجہ کی طرفدار ہے اور اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے نوکر اپنے آقا کی جان مال کو باقی رکھنے کے لیے اپنے بیٹے تک کی قربانی کا خیال نہیں کرتا۔ اس کی بیوی اور بیٹی بھی اس کو مان لیتی ہے اور لڑکے کا سر مندر میں چڑھا دیا جاتا ہے۔ وہ دیوی غالباً کالی دیوی ہے اس

لیے کہ یہ واقعہ بردوان یعنی بنگال سے متعلق ہے۔ کالی دیوی کے سامنے بھینس کی قربانی اب بھی پیش کی جاتی ہے۔ اور اسی طرح کھانڈے سے اس کا سر اُڑا دیا جاتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ جو شخص آکر نوکری کرتا ہے وہ جنوبی ہندوستان سے آرہا ہے اور راجہ کی دولت مندی کا ایک غیر معمولی تصور رکھتا ہے۔ تبھی تو ایک ہزار تولہ سونا روزانہ اس سے مانگتا ہے۔ وسطی دَور کے جنوب اور شمال مشرقی ہندوستان کی ریاستیں اور راجہ اپنی دولت مندی کے لیے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

کچھ باتیں اور بھی ہیں جو اس زمانے کے معاشرتی رتبوں اور سماجی معیاروں کو پیش کرتی ہیں۔ ان میں ایک تو عورت کا تابعدار ہونا، دوسرے دوست کا ہوشیار ہونا، تیسرے بیٹے کا اپنے بس میں ہونا اور چوتھے نوکر کا وفادار ہونا ہے۔ اس طرح کی باتیں کچھ دوسری کہانیوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو کہاوتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً یار دوست بھلا، برے وقت کا۔ بیوی بھلی پاس کی۔ پیسہ بھلا گانٹھ کا۔ یعنی پیسہ وہی اچھا ہے جو ہاتھ میں ہو۔ دوست وہ اچھا ہے جو حد بھر نقصان کی حالت میں کام آئے اور بیوی وہ اچھی جو اپنے پاس رہے۔ یہ تمام باتیں اس دَور کی تہذیب کو سمجھنے میں بہت کچھ معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بھائی کے مارے جانے کا غم برداشت نہ کرنا بہن کے لیے قدرتی ہے۔ دھرم اور فرض کچھ اور ہے فطری احساسات کچھ اور ہیں اسی طرح بیٹے اور بیٹی کے مرنے پر ماں کا زندہ نہ رہنا اور تینوں کے غم میں باپ کا بھی جان دینا اس کے بعد یہ راجہ کی فرض شناسی اور اپنے دھرم کا ثبوت دینا یہ سب باتیں عقائد کے طور پر معاشرے میں عام تھیں۔ فرض اور دھرم کی ادائیگی میں قربانیاں سبھی دیا کرتے ہیں۔ اس لیے بیتال کے جواب میں راجہ بکرما جیت کہتا ہے کہ پانچوں میں سب سے بڑا کام راجہ کا ہے۔ اس لیے کہ آقا کے لیے جان دینا نوکر کے لیے لازمی ہے ماں باپ کی فرمانبرداری کو اپنا فرض ہر اولاد کے لیے ضروری رہا ہے۔ لہٰذا راجہ کے مقابلے میں ان کی قربانی بھی بڑی نہیں کیونکہ ایک نوکر کی وفاداری کے پیچھے اپنا راج پاٹ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کے بیشتر افراد فرض شناس اور فرمانبردار تھے اور اس کو اولیت کا درجہ دیا کرتے تھے۔

اس کہانی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ راجہ کو اپنی رعایا پر، آقا کو اپنے نوکر پر باپ کو اپنے بیٹے پر اور شوہر کو اپنی بیوی پر کیا کچھ حقوق اور اختیارات حاصل تھے۔

راجہ پھر جا کر بیتال کو درخت سے اتار لایا اور بیتال نے چوتھی کہانی کہنی شروع کی۔ بھوگ وتی نگر کا راجہ روپ سین ہے۔ اس کے پاس چیرامن نام کا ایک طوطا ہے۔ ایک دن اس طوطے سے راجہ نے پوچھا تو کیا کیا جانتا ہے۔ اس نے کہا میں سب کچھ جانتا ہوں اور پوچھنے پر بتاتا ہوں۔ مگدھ دیس کا جگدھیشر راجہ ہے اس کی بیٹی کا نام چندراوتی ہے تمہاری شادی اس کے ساتھ ہوگی۔ وہ نہایت خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔ پھر مگر راجہ چندر کانت نے جیوتشی کو بلایا اور پوچھا "ہماری شادی کس کنیا سے ہوگی؟" اس نے اپنے نجوم سے معلوم کیا ـــــ چندراوتی نام کی کنیا سے۔ اس کے بعد راجہ نے ایک برہمن کو بلا کر سب کچھ سمجھا کر مگدھیشر راجہ کے پاس بھیجا اور کہا اگر ہماری شادی کی بات پکی کرا دو گے تو ہم تمہیں خوش کر دیں گے۔

مگدھیشر راجہ کی بیٹی کے پاس ایک مینا تھی اس کا نام مدن منجری تھا۔ چندراوتی نے بھی ایک دن مینا سے اسی طرح پوچھا تھا اس نے بتایا تھا بھوگ وتی نگر کا راجہ روپ سین۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کو بغیر دیکھے ہی فریفتہ ہوگئے۔ جب برہمن بھوگ وتی سے مگدھ دیس پہنچا اور راجہ کا پیغام دیا تو مگدھیشر نے اس پیغام کو قبول کیا اور اپنا برہمن بلوایا اور سب رسوم کی چیزیں سپرد کیں اور اس برہمن کے ہمراہ بھوگ وتی نگری کو روانہ کیا۔

دونوں برہمن بھوگ وتی نگر پہنچے۔ راجہ کل احوال سن کر بہت خوش ہوا اور سب تیاری کر کے شادی کرنے کو چلا۔ اور چند روز بعد شادی کا جہیز وغیرہ لے وہاں سے رخصت ہو کر اپنے دیس میں واپس آیا اور مدن منجری مینا کا پنجرہ بھی چندراوتی ساتھ لائی۔

ایک دن کی بات ہے کہ طوطا اور مینا کے دونوں پنجرے گدی کے پاس رکھے تھے کہ راجہ رانی آپس میں کہنے لگے کہ اکیلے رہنے سے کسی کا دن نہیں کٹتا بہتر ہے کہ طوطا اور مینا دونوں کی شادی کر دی جائے۔ اور دونوں کو ایک پنجرے میں رکھا جائے۔ یہ مشورہ ٹھیرا تو

ایک بڑا پنجرہ منگوایا اور اس میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا۔ کچھ دنوں بعد راجہ رانی باتیں کرتے ہوئے بیٹھے تھے کہ طوطا نے مینا سے کہا کہ دنیا میں اصل بھوگ ہے جس نے بھوگ نہیں کیا اس کی زندگی بیکار ہے۔ اس لیے تو مجھے بھوگ کرنے دے۔ مینا نے جواب دیا مجھے مرد کی آرزو نہیں کہ مرد پاپی، ادھرمی، دغاباز، عورت کو مار ڈالنے والے ہوتے ہیں۔ طوطا بولا عورت بھی دغاباز، جھوٹی، بیوقوف، لالچی اور پاپی ہوتی ہے۔ دونوں میں جھگڑا بڑھا تو راجہ نے کہا آپس میں کیوں لڑتے ہو۔ مینا نے کہا مرد عورت کی ہتیا کرنے والے ہوتے ہیں اس لیے مجھے مرد کی چاہ نہیں۔ میں ایک کہانی کہتی ہوں کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ یہاں پر مینا ایک داستان بیان کرتی ہے جس میں عورت اور مرد کے دونوں کی بے وفائی کا منظرنامہ سامنے آتا ہے اور ایک چور اس کا چشم دید گواہ تھا لہذا چور وہاں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے دہائی دی۔ راجہ نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا میں چور ہوں۔ یہ آدمی بے گناہ ہے راجہ نے دھرم سے سچ کہنے کے لیے کہا۔ چور نے سب حالات کہہ سنائے۔ راجہ حقیقت سمجھا۔ ہرکارے کو بھیجا اور اس عورت کے مرے ہوئے یار کے منھ سے ناک منگوا کر دیکھی۔ چور بولا نیکوں کو پالنا اور بدوں کو سزا دینا راجاؤں کا دھرم ہے۔ یہ کہہ کر چور رامن طوطا بولا ایسی گُن کی پوری عورتیں ہوتی ہیں۔ راجہ نے جیبی کا کالا منھ کرا گدھے پر چڑھا شہر کے پھیرے دلوائے اور چور اور ساہوکار بچے کو رخصت کیا۔

بیتال یہ کتھا کہہ کر بولا۔ ان دونوں سے کسے زیادہ پاپ ہوا۔ راجہ بکرماجیت بولا۔ عورت کو ـــــ کیونکہ مرد کیسا ہی بدکار کیوں نہ ہو اسے دھرم ادھرم کا خیال رہتا ہے اس لیے عورت کو بہت سا پاپ ہوا۔

یہ سنتے ہی بیتال اس درخت پر جا پہنچا۔ نہ صرف پنڈتوں جیوتشیوں سے بلکہ طوطا مینا سے بھی شاید ایسے اور پرندوں یا جانوروں سے مستقل معلوم کرنے کا رواج اس معاشرے میں تھا۔ اس کی باقیات اس زمانے کے معاشرے میں بھی پائی جاتی ہیں۔

طوطا اور مینا کے قصے جو عورتوں اور مردوں کی بے وفائی سے متعلق ہیں نہ جانے کس زمانے سے داستانی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان جھگڑے کی بنیاد یا یوں کہیے کہ ان قصوں کی وجہ تخلیق یہ ہے کہ طوطا جو مرد کی علامت ہے بھوگ کو دنیا میں اصل جانتا ہے اور اس کے بغیر دنیا کو بے کار کہتا ہے۔ مینا جو عورت کی علامت

ہے چونکہ مردوں کے ہاتھوں جانے کیا نتیجے دیکھ چکی ہے مرد کی خواہش نہیں رکھتی کیونکہ وہ مرد کو پاپی، ادھرمی، دغاباز، عورت کی ہتیا کرنے والا بتاتی ہے۔ اس پر طوطا اس سے یہی جواب دیتا ہے اور کہتا ہے عورت بھی دغاباز، جھوٹی، بیوقوف، لالچی اور ہتیاری ہوتی ہے۔ دونوں راجہ کو اپنے اپنے خیال کی تائید میں کہانیاں سناتے ہیں۔ یہاں یہ بات حیرتناک ہے کہ راجہ اور رانی طوطا اور مینا کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور ان کو ایک جگہ رکھتے ہیں جبکہ طوطا اور مینا ایک نسل کے ہیں ہی نہیں تو ان کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ذات پات کا سوال بھی نہیں ہے۔ رنگ اور نسل کی تقسیم بھی نہیں ہے۔ یہ ایک انہونی بات ہے اور شاید داستانوں یا تخیل اور تمثیل کے ایسے راستے سے ہے جہاں تحول صورت بھی ممکن ہے اور غیر فطری طور پر ورنہ ہم جنسوں کے مابین جنسی رفاقت بھی۔

چونکہ ہر زمانے کے مشرقی معاشرے میں عورت شوہر کے عیوب کی پردہ داری کرتی ہے اس لیے مینا کی کہانی میں سیٹھ کی لڑکی اپنے ہتیارے شوہر کے عیب کو چھپاتی ہے اور اسے گھر والوں میں بھی سرخ رو رکھنا چاہتی ہے اور شوہر زیور کے حصول کے لیے اس کی جان لیتا ہے۔

طوطے کی کہانی تریا چرتر سے متعلق ہے اور عورت کے آشنا کی محبت میں اندھی ہو جانے کی داستان ہے۔ اور وہ موقع پا کر آشنا کے یہاں پہنچ جاتی اور بھوت سے بھوگ کے بعد ناک کٹوا لیتی ہے۔ کیونکہ آشنا تو سانپ کاٹے سے مردہ پڑا تھا۔ پھر سکھی کے مشورے پر تریا چرتر کا ڈھونگ رچاتی ہے اور اپنے شوہر پر الزام رکھتی ہے جسے راجہ سولی کا حکم دے دیتا ہے مگر چور کے بیان اور ثبوت پر اسے نجات ملتی ہے جو اسے آشنا کے یہاں زیوروں سے لدی ہوئی رات کو اکیلا جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے جاتا اور سارا تماشا دیکھتا ہے۔

بڑے بوڑھوں کا نہ جانے کب سے تجربے کی بنا پر ایسے قول رواج پائے ہوئے ہیں کہ شوخ دل، کالے سانپ اور مسلح دشمن کا یقین نہ کرنا چاہیے۔ شاعر بھی تریا چرتر سے ڈر کر کیا کچھ بیان کر سکتا ہے۔ جوگی سب کچھ جانتا ہے۔ شرابی کیا کچھ نہیں کہتا۔ عورت کیا نہیں کر سکتی اور گھوڑوں کا عیب بادل کا گرجنا تریا چرتر اور مرد کی قسمت دیوتا بھی نہیں جانتے

آدمی تو کیا جانے گا۔ معاشرے کا یہ عقیدہ اور یقین رہا ہے کہ راجہ نیکوں کا پالنے والا اور بدوں کو سزا دینے والا ہے۔ یہی اس کا دھرم ہوتا ہے۔

بیتال کے معلوم کرنے پر راجہ بکرماجیت کہتا ہے زیادہ پاپ عورت کو ہوا کیونکہ مرد کیسا ہی بدکار کیوں نہ ہو لیکن اسے دھرم اور ادھرم کا خیال رہتا ہے۔ اس سے ہر معاشرے کے بہت سے افراد کو اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ مرد اور عورت کی جانچ کے ایک ہی پیمانے ہونے چاہئیں کیونکہ معاشرہ شروع ہی سے مردوں کی قیادت کا معاشرہ چلا آ رہا ہے۔ اس لیے عورت ہی گناہگار ٹھہرائی جاتی رہی ہے۔ مگر اس کہانی میں واقعی قصوروار عورت ہی ہے۔ راجہ پھر بیتال کو درخت سے اتار لایا اور بیتال نے پانچویں کہانی کہی۔

اجین میں راجہ مہابل راج کرتا تھا۔ اس کا ایک ہرکارہ ہرداس تھا۔ اس کی بیٹی مہادیوی بہت خوبصورت تھی۔ شادی کے قابل ہونے پر باپ کو اس کے بیاہ کی فکر ہوئی۔ ایک دن اس لڑکی نے اپنے باپ سے کہا مجھے اسے دیجیے جو سب ہنر جانتا ہو۔ باپ نے کہا اس سے تیری شادی کروں گا جو سب علم جانتا ہوگا۔

ایک دن راجہ نے ہرداس کو بلایا اور پوچھا دکن میں ہر چند نام کا راجہ ہے جا کر میری طرف سے اس کی خیر و عافیت پوچھو۔ ہرداس راجہ کے حکم پر گیا اور وہاں کے راجہ سے اپنے راجہ کا پیغام کہا اور ہمیشہ اس کے پاس رہنے لگا۔ ایک دن اس راجہ نے اس سے پوچھا، ابھی کل جگ شروع ہوا یا نہیں۔ ہرداس نے دست بستہ عرض کی کل جگ موجود ہے کیونکہ دنیا میں جھوٹ بڑھا ہے سچائی نہیں رہی۔ منہ پر لوگ میٹھی بات کہتے ہیں اور دل میں بدی رکھتے ہیں۔ دھرم جاتا رہا گناہ بڑھ گئے۔ درخت پھل کم دینے لگے۔ راجہ جرمانہ لینے لگے۔ برہمن لالچی ہو گئے۔ عورتوں نے حیا چھوڑ دی، بیٹا باپ کا حکم نہیں مانتا۔ بھائی بھائی کا اعتبار نہیں کرتا۔ دوستوں سے دوستی جاتی رہی۔ آقا سے وفا اٹھ گئی۔ نوکروں نے خدمت چھوڑ دی اور جتنی خراب باتیں تھیں سب نظر آتی ہیں۔

راجہ اٹھ کر محل میں گیا اور ہرداس اپنی قیام گاہ میں آ پہنچا۔ برہمن اس کے پاس آیا اور کہنے لگا میں تجھ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔ ہرداس بولا مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس نے کہا اپنی بیٹی

مجھے دے۔ ہرداس نے کہا جس میں سب ہنر ہوں گے بیٹی اس کو دوں گا۔ برہمن بولا۔ میں سب علم جانتا ہوں۔ میں نے ایک رتھ بنایا ہے اس میں جہاں جانا چاہو ایک پل میں پہنچا دے۔ ہرداس نے کہا رتھ کو صبح میرے پاس لے آنا اور وہ برہمن دوسری صبح کو وہ رتھ لے کر ہرداس کے پاس آیا اور وہ دونوں رتھ پر سوار ہو اجین آ پہنچے۔ لیکن اس کے یہاں آنے سے پہلے کسی اور برہمن کے لڑکے نے بڑے بیٹے سے آ کر کہا تھا کہ تو اپنی بہن مجھے دے۔ اس برہمن کے لڑکے نے بھی کہا تھا کہ وہ سب ہنر جانتا ہے۔ اور تیسرے برہمن کے لڑکے نے لڑکی کی ماں سے بھی کہا تھا کہ وہ سب ہنر جانتا ہے اور تیر اندازی میں کمال رکھتا ہے۔ اور بغیر دیکھے آواز پر تیر مارتا ہے۔ اس طرح ہرداس کی بیٹی کے تین بر اکٹھے ہوئے۔ ہرداس اس فکر میں تھا کہ کسے دوں اور کسے نہ دوں کہ رات کو ایک راکشس اس کنیا کو اٹھا کر بندھیاچل پہاڑ پر لے گیا۔

صبح ہوئی گھر کے لوگوں نے لڑکی کو موجود نہ پایا تو طرح طرح کی فکر کرنے لگے۔ وہ تینوں برہمن کے لڑکے بھی یہ سن کر وہاں آئے ان میں سے ایک ہرداس سے پوچھتا ہے تو بتا لڑکی کہاں گئی۔ اس نے ایک گھڑی میں سوچ بچار کر بتایا کہ تمھاری لڑکی کو راکشس نے لے جا کر پہاڑ میں رکھا ہے۔ دوسرا بولا راکشس کو مار کر میں اسے لے آؤں گا پھر بولا ہمارے رتھ پر سوار ہو جاؤ، وہ جھٹ سے اس رتھ پر سوار ہوا اور دیوی کو مار کر فوراً لڑکی لے آیا۔ اب تینوں آپس میں جھگڑا کرنے لگے۔ اس کے باپ نے دل میں سوچا کہ سب نے احسان کیا ہے کسے دوں کسے نہ دوں۔

بیتال نے راجہ سے پوچھا وہ لڑکی کس کی بیوی ہے۔ راجہ نے کہا وہ جو راکشس کو مار کر لڑکی لایا۔ کیونکہ ان دونوں نے احسان کیا اس سے ان کو ثواب ہوا اور وہ لڑ کر اسے مار کر لایا۔ یہ سنتے ہی بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

اس سے اس زمانے میں اتر اور دکن کے راجاؤں کے درمیان راہ و رسم کا پتہ چلتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اپنے معتمد لوگوں کو بھیجا کرتے تھے اس کے علاوہ دیس اور دکن کے مابین جو تاریخی اور تہذیبی رشتے ملتے ہیں ان پر روشنی پڑتی ہے۔ اجین پہلے گپتا راجاؤں کی راجدھانی رہا ہے۔ چندر گپت بکرماجیت انہیں میں سے ایک تھا۔ اس کے

بعد راجا بھوج جو ہندوستان کے قدیم قصّے کہانیوں میں خاص شہرت رکھتا ہے، وہ بھی اس راجدھانی میں بیٹھ کر دیس پر راج کرتا تھا۔ اس کہانی میں دلچسپ اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی بیاہ کے قابل ہو گئی ـــــ الفاظ آتے ہیں۔ یہ دراصل انگریزی کا تاثر اور مرّوج ایبل MARRIAGABLE کا ترجمہ ہے۔

بہت سے قصّے کہانیوں میں خوبصورت راج کماریوں کی طرف سے کچھ شرطیں لگا دی جاتی تھیں یہاں ایسی کچھ شرطیں تو سامنے نہیں آئیں لیکن سب سے بڑی شرط یہ سامنے آتی ہے کہ برہمن کی اس خوبصورت لڑکی سے شرط کے مطابق وہ شادی کرے گا جس کے کردار میں سارے اعلیٰ انسانی اوصاف پائے جائیں گے۔

اس طرح کچھ برہمن زادے جنوبی ہندوستان سے آئے ہیں۔ مگر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جنوبی ہندوستان جو وندھیاچل، بہت پُرانے جنگلوں اور پہاڑوں سے دکن کی طرف سے بسا ہوا ہے وہاں اس طرح کے راجکمار اور برہمن زادے ملتے ہیں۔ بہت سی کہانیوں میں ہیرو یا ہیروئن جنوبی ہندوستان کے کسی ریاست کا راجکمار یا راجکماری یا پھر کسی ملک التجار کا بیٹا یا بیٹی ہے یا کوئی برہمن زاد ہے۔

یہاں یہ بات ایک حد تک نئی ہے کہ اس لڑکی کی مانگ کرنے والوں میں کوئی راجکمار نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ لوگوں کا طلب گار بن کر آنا سوئمبر کی رسم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہاں سوئمبر نہیں رچایا گیا۔ ایک ہی لڑکی کی طرف سے تین برہمن زادوں کی مانگ ہوتی ہے اور تینوں برہمن زادے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہی صورت اس سے پہلی کہانی میں بھی موجود ہے صرف فرق کنیا کو ایک راکشس کے اڑا کر لے جانے کا ہے۔ یہ صورت وہاں سانپ کے ڈسنے سے پیش آتی ہے۔ راکشس کا کسی کنیا کو اٹھا کر لے جانا رامائن کی کہانی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ جس کی طرف اس میں اشارہ بھی کیا گیا ہے اور ایک اخلاقی سبق بھی موجود ہے کہ ضرورت سے زیادہ اپنی مانگوں کو اور احمیان کو آگے نہیں بڑھنے دینا چاہیئے اس کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے وہاں بھی فیصلہ ایک بہت ہی نازک حالت میں راجہ نے کیا تھا اور یہاں بھی راجہ نے ہی کیا ہے۔ ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ لڑکی سے شادی کرنے کا حق اس کو حاصل ہے جس

نے راکشش کو قتل کیا۔ ایک مہم آزما اور جنگجو سماج میں یہی طریقہ صحیح سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اور داستانوں میں پائے جاتے ہیں۔ غرض جس کے یہاں کوئی بات حد سے بڑھی ہوئی پائے گی اسے مصیبتوں اور تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا سیتا، کیا راون، کیا راجہ بل۔

اس کہانی میں راجہ بکرماجیت کے فیصلے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ احسان اور استحقاق میں کیا فرق رکھتا تھا۔ احسان کا ثواب ہوتا ہے اور استحقاق جان ہتھیلی پر رکھنے اور ہمت آزما کام کرنے سے بنتا ہے۔ اس برہمن کی بیٹی پر اس کا حق ہوا جو راکشش سے لڑ کر اسے چھڑا لایا۔ اور ان دونوں برہمن زادوں کا احسان جنھوں نے اپنے علم و ہنر سے بتایا کہ لڑکی کا کیا ٹھکانا ہے اور تیسرے برہمن نے اپنے رتھ پر وہاں پہنچا دیا۔

ثواب کا لفظ پُن کا ترجمہ ضرور ہے لیکن مسلم معاشرے کے طرزِ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اس سے پیشتر دوزخ کا لفظ ـــــ نرک کے ترجمے کے طور پر آیا ہے۔

بیتال نے پھر درخت سے لائے جانے پر کہانی کہنی شروع کی۔ دھرم پور میں راجہ دھرم شیل راج کرتا تھا اس کے دیوان کا نام اندھک تھا۔ اس نے ایک دن راجہ سے کہا ایک مندر بنا کر اس میں دیوی رکھ کر ہمیشہ پوجا کیجیے کہ اس کا شاستر میں بڑا ثواب بتایا گیا ہے۔

راجہ نے مندر بنوایا دیوی کو اس میں رکھ شاستر کے مطابق پوجا کرنے لگا۔ وہ پوجا کیے بغیر پانی بھی نہ پیتا تھا۔ ایک اور روز دیوان بولا کہ بے اولاد کا گھر سونا، بیوقوف کا دل سونا اور بالکل غریب (دلداری) کا سب کچھ سونا ہے۔ راجہ نے یہ سن کر مندر میں جا دیوی سے التجا کرنے لگا کہ اے دیوی تجھے برہما، وشنو اور اندر آٹھوں پہر پوجتے ہیں اور تو نے راکشسوں کو مار دھرتی کا بوجھ کم کیا ہے۔ جہاں تیرے بھگتوں پر مصیبت پڑی وہاں تو مددگار ہوئی اور یہی امید لے کر میں تیرے دروازے پر آیا ہوں۔ اب میرے دل کی آرزو بھی پوری کر۔ اس دیوی کے مندر سے آواز آئی راجہ میں تجھ سے خوش ہوں جو تیرے دل میں ہے مانگ۔ راجہ نے کہا مجھے بیٹا عطا کر۔ دیوی نے کہا تیرے یہاں بیٹا ہوگا۔ بڑا ہی طاقتور اور بڑا ہی نام والا ـــــ راجہ نے چندن، پھول، دھوپ اور دیپ سے پوجا کی اور ہر روز پوجا کرتا تھا۔ کئی

مہینوں بعد راجہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ راجہ نے بڑی خوشی اور دھوم دھام سے پورے خاندان کے ساتھ جاکر دیوی کی پوجا کی۔

ایک دن کسی گاؤں سے ایک دھوبی اپنے دوست کے ساتھ اس شہر کی طرف آیا تھا۔ اسے دیوی کا مندر دکھائی دیا اس نے ڈنڈوت کرنے کا ارادہ کیا کہ اس نے ایک اور دھوبی کی حسین لڑکی سامنے سے آتی دیکھی۔ وہ اس پر فریفتہ ہوگیا اور دیوی کے درشن کو مندر کے اندر گیا۔ ڈنڈوت کرکے ہاتھ جوڑ اپنے دل میں کہا اے دیوی اگر اس خوبصورت لڑکی سے میری شادی ہو جائے تو میں اپنا سر تجھے بھینٹ چڑھاؤں۔

یہ کہہ کر وہ اپنے گاؤں گیا اور اس کے عشق نے اتنا ستایا کہ اس کی بھوک پیاس اور نیند سب اُڑ گئی اور اس کے خیال میں آٹھوں پہر رہنے لگا۔ اس کے دوست نے یہ حالت دیکھ کر کل کیفیت اس کے باپ سے کہہ دی۔ اس کا باپ فکر مند ہوا وہ لڑکے کے دوست کو ساتھ لے کر گیا اور لڑکی کے باپ سے جاکر کہا میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں۔ اس نے کہا، اگر میرے پاس وہ چیز ہوگی تو میں دوں گا۔ اس قول پر اس نے کہا اپنی لڑکی میرے لڑکے کو دے دے۔ لڑکی کے باپ نے یہ بات مان لی اور برہمن کو بلوا مہورت اور لگن ٹھہرا کر کہا تم اپنے لڑکے کو لے آؤ میں بیاہ کر دوں گا۔ اس نے گھر آکر سارا سامان شادی کا تیار کرکے بیاہنے کو گیا اور بہو کو گھر لے آیا۔ (ہندو قبائل میں ایسا نہیں)

کچھ دنوں بعد لڑکی کے باپ کے یہاں کچھ خوشی تھی وہاں سے دعوت آئی۔ میاں بیوی دونوں تیار ہو اس دوست کو ساتھ لے اس شہر کو چلے۔ مندر دکھائی دیا تو اسے اپنا عہد یاد آیا اور اپنے آپ کو بُرا بھلا دل میں کہا پھر دوست سے وہیں ٹھہرنے کو کہہ کر دیوی کے درشن کو مندر کے اندر گیا۔ وہاں جا تالاب میں اشنان کر دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرکے کھڑگ اٹھائی اور گردن پر ماری سر تن سے جدا ہوگیا۔ کافی دیر کے بعد اس کا دوست مندر میں گیا اس نے وہاں کی حالت دیکھ کر دل میں خیال کیا کہ یہ کوئی نہ خیال کرے گا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے دیوی کو سر بھینٹ کیا ہے۔ اس سے بہتر کہ کوئی الزام آئے یہاں مرنا ہے۔ اور تالاب میں اشنان کرکے کھانڈے سے اپنا سر جدا کر دیا۔ لڑکی بہت دیر کے انتظار سے اُکتا کر

مندر کے اندر گئی۔ وہاں دونوں کو اس حالت میں دیکھا اور جی میں سوچا سب کہیں گے یہ لڑکی بدکار تھی اس لیے دونوں کو مار آئی۔ اس خیال سے تالاب میں غوطہ لگایا اور دیوی کے سامنے آکر تلوار سے گردن کاٹ ڈالنا چاہتی تھی کہ دیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا بیٹی:— مانگ میں تجھ سے خوش ہوں۔ اس نے کہا ماتا ان دونوں کو زندہ کر دے۔ دیوی نے ان کے سروں کو دھڑوں سے لگا دے۔ اس نے خوشی کے مارے گھبراہٹ میں سر بدل دیئے اور دیوی نے امرت ان پر چھڑکا وہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ ہر ایک کہتا تھا یہ عورت میری ہے۔ اتنا کہہ کر بے تال نے راجہ بکرماجیت سے کہا۔ ان دونوں میں وہ عورت کس کی ہوئی راجہ بولا شاستر میں اس کا فیصلہ لکھا ہے۔ ندیوں میں گنگا بہت اچھی ہے اور پہاڑوں میں سمیر پہاڑ اور درختوں میں کلپ برکش، اعضا میں پیشانی۔ اس طرح جس کا عمدہ جسم ہے اس کی وہ عورت ہوئی۔

یہ سنتے ہی بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

اس زمانے میں دیوان راجاؤں کے مسائل کس انداز سے حل کیا کرتے تھے۔ اس کہانی کے پہلے حصے سے معلوم ہوتا ہے چونکہ معاشرہ بے اولاد کا گھر سونا، بیوقوف کا دل سونا اور غریب کا سب کچھ سونا جانتا تھا اور راجہ کے یہاں اولاد نہ تھی اس لیے اس کا گھر بھی سونا تھا۔ اس لئے پہلے تو راجہ نے مندر بنواکر خود کو دیوی کی پوجا میں لگایا کیونکہ شاستر میں اس کا ثواب ہے۔ جب پوجا کرنا راجہ کا معمول بن گیا اور جس کے نتیجے میں پوجا پاٹھ سے خوش ہو کر دیوی اسے اولاد ہونے کا وردان دیتی ہے۔ امیر لوگ اور راجہ مہاراجہ مندر کسی غرض سے بنواتے تھے یا اپنی ذاتی پوجا کے لیے بھی مندر تیار کرواتے تھے۔

یہ قابلِ غور بات ہے کہ وہ دیوی کا مندر ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کہانی کا مصنف خاص طور پر دیویوں کا مانتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مختلف موقعوں پر شاستروں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اور مندر تعمیر کرنے کو بہت بڑا کارِ ثواب ظاہر کیا گیا ہے۔

آگے کہانی کے دوسرے حصے میں ایک دھوبی اپنے دوست کے ساتھ اس طرف سے

جاتا تھا اسے مندر دکھائی دیا اور اس وقت ایک اور دھوبی کی خوبصورت لڑکی نظر آتی ہے وہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور مندر میں جاکر دیوی سے سر بھینٹ دینے کی منت پر اس لڑکی سے شادی کی درخواست کی۔ دیوی کی مہربانی سے اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی منت بھول جاتا ہے لیکن کئی دن کے بعد سسرال جاتے ہوئے مندر کے پاس سے گزرتا ہے۔ دوست بھی ساتھ ہے۔ منت یاد آتی ہے اور اپنے آپ کو برا کہہ کر مندر میں جاکر سر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔۔۔۔ یعنی معاشرے میں نچلے طبقے میں بھی منت کا اتنا زیادہ خیال کیا جاتا تھا اور منت پوری نہ کرنے کو گناہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور لوگ یاد آنے پر اپنے آپ کو دھتکارتے تھے۔ دوست بھی ایسے ہوتے تھے کہ وہ لوگ رنج نہ بڑا خیال رکھتے تھے، اور اپنے اوپر الزام آنے سے ڈرتے تھے۔ کہ دنیا نہ جانے کیا کیا سمجھے گی اور کیا کیا کہے گی۔ اسی طرح عورت کو بھی خیال ہونا تھا یعنی معاشرہ نیچے سے اوپر تک دھرم کے بندھنوں بندھا ہوا تھا۔ صرف درجوں کا فرق تھا۔ دیوی بھی امتحان لینے پر مہربانی کر دیتی تھی۔

اس کہانی میں ایک عجیب بات سامنے آتی ہے کہ عورت نے دیوی کے خوش ہونے پر گھبراہٹ میں شوہر کا سر اس کے دوست کے دھڑ سے اور دوست کا سر اپنے شوہر کے دھڑ سے جوڑ دیا۔ اور وہ دیوی کے امرت چھڑکنے سے زندہ ہو گئے۔ بیتال کے پوچھنے پر راجہ نے کہا۔ شاستر کی رو سے ندیوں میں گنگا بہت اچھی ہے۔ اور پہاڑوں میں سمیرو پہاڑ۔ درختوں میں کلپ برکش، انسانی جسم کے اعضا میں پیشانی۔ یعنی جس کا جسم عمدہ ہے عورت اس کی ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس معاشرے میں شاستروں کی بات کو سبھی تسلیم کرتے تھے یہاں تک کہ بھوت بیتال تک تسلیم کرتے تھے۔ جسمانی طور پر ہٹے کٹے ہونا بڑی بات خیال کیا جاتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دل و دماغ اور کردار کی دوسری خوبیوں کے مقابلے میں جسمانی خوبیوں کو اس سماج میں زیادہ اہم تصور کیا جاتا تھا اور ذہنی قوت کے مقابلے میں جسم کی قوت کو زیادہ مانا جاتا تھا۔

راجہ بیتال کو پھر درخت سے اتار لایا اور بیتال نے کہانی کہی ۔۔۔
چمپا پور کا راجہ اور اس کی رانی سلوچنا اور بیٹی کا نام ترھبون سندری ہے۔ وہ

بہت ہی حسین ہے جس کا چہرہ چاند سا، بال گھٹا سے، آنکھیں ہرن کی سی، بھنویں کمان سی، ناک طوطے کی سی، گلا صراحی کا سا، دانت انار کے سے دانے، ہونٹوں کی لالی کندوری کی سی، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں گول کنول کے سے، رنگ چمپا کا سا۔۔۔ بیاہنے کی عمر ہوئی تو راجہ اور رانی اپنے دل میں فکر کرنے لگے۔ دیس دیس کے راجاؤں کو خبر گئی تو راجاؤں نے اپنی اپنی تصویریں بنوا کر برہمنوں کے ذریعہ بھیجیں۔ راجہ نے بیٹی کو سب تصویریں دکھائیں لیکن اس کے من کو نہ بھائیں۔ راجہ نے کہا پھر صبر کرو۔ اس نے یہ بات بھی نہ مانی اور باپ سے کہا خوبصورتی زور اور عقل و ہنر جس میں یہ تینوں باتیں ہوں میری اس سے شادی کرنا۔ کئی دنوں بعد چاروں دیس سے چار بر آئے۔ راجہ نے ان سے کہا اپنا اپنا علم و ہنر میرے آگے ظاہر کرو۔ ایک بولا ایک کپڑا بنا کر میں پانچ لعل میں بیچتا ہوں۔ اس کا مول ہاتھ آتا ہے تو اس میں سے ایک لعل برہمن کو دوسرا دیوتا کو تیسرا اپنے خرچ کے لیے، چوتھا عورت کے واسطے، پانچویں کو بیچ کر روپیے ہمیشہ کھانا کھاتا ہوں۔ میری خوبصورتی ظاہر ہے۔ دوسرا بولا میں خشکی تری کے چرندوں پرندوں کی بولی جانتا ہوں۔ تیسرے نے کہا میں ایسا شاستر سمجھتا ہوں کہ دوسرا نہیں سمجھتا۔ چوتھے نے کہا میں تیر اندازی میں یکتا ہوں، آواز پر تیر مارتا ہوں۔ چاروں کی بات سن راجہ دل میں کہنے لگا کہ چاروں ہنر میں برابر ہیں کس سے شادی کروں۔ اس نے بیٹی سے چاروں کے ہنر بیان کیے اور پوچھا تجھے کس کو دوں۔ شرم سے نیچی گردن کر کے چپ ہو رہی اور کچھ جواب نہ دیا۔

بیتال بولا یہ راجکماری کس کے لائق ہے۔ راجہ بکرم نے کہا جو کپڑا بنا کر بیچتا ہے۔ وہ ذات کا شودر ہے اور وہ بولیاں جانتا ہے وہ ذات کا ویش ہے اور جو شاستر پڑھا ہے وہ برہمن ہے۔ اور جو نشانہ باز ہے اس کا ہم قوم ہے۔ یہ راجکماری اس کے لائق ہے۔ بیتال یہ بات سنتے ہی پھر درخت پر جا لٹکا۔

اس زمانے کے معاشرے میں خوبصورتی کا معیار یہ تھا کہ چہرہ چاند سا، بال گھٹا سے، آنکھیں ہرن کی سی، بھنویں کمان سی، ناک طوطے کی سی، گلا صراحی کا سا، دانت انار کے دانے کے سے۔ ہونٹوں کی لال کندوری کی سی، کمر چیتے کی سی۔ ہاتھ پاؤں گول کنول کے سے، رنگ

چمپئی کا سا۔ اور جس کے روپ کو دیکھ سر (دیوتا) تو (آدمی) فریفتہ ہو جائیں۔

راجکماری نے راجہ سے کہا کہ خوبصورتی زور اور عقل و ہنر جس میں یہ تینوں باتیں ہوں میری طرف سے شادی کرنا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرہ شہزادیوں سے شادی کے خواہش مند راجکماروں یا رئیس زادوں کے لیے خوبصورتی، ہنر مندی اور عقل ضروری سمجھتا تھا۔

لڑکی کی حیا اس معاشرے کی ایک بہت بڑی خصوصیت تھی اگرچہ اپنا بر خود چننے کی اجازت تھی۔ پھر بھی کنواری لڑکی کے لیے حیا کو اس کی شخصیت کا زیور خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ کہانی لکھنے والے کے ذہن میں یہ تصور رہا ہو کہ اس کی شادی تینوں سے کر دی جائے جبکہ ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔

راجہ بکرم کا بیتال سے پوچھنے پر یہ کہنا جو کپڑا بنا کر بیچتا ہے وہ ذات کا شودر ہے اور بھا لکھا چرند پرند کی بولیاں جانتا ہے وہ ویش ہے اور شاستر پڑھتا ہے سو برہمن ہے اور جو قادر انداز نشانہ باز ہے اس کا ہم قوم ہے یہ استری اس کے لائق ہے ــــ سے معاشرے کی اس روش کا پتہ چلتا ہے کہ ہم قوم ہی موزوں اور مناسب بر خیال کیا جاتا تھا۔

ویش تجارت کرتے تھے اور بنجاروں کے بھیس میں دیس بدیس مارے مارے پھرتے تھے۔ ممکن ہے ان میں کچھ وہ طبقات بھی ہوں جو چرندوں یا پرندوں کی تجارت کرتے ہوں اور اس نسبت سے ان کے مزاج اور ان کی بولیوں سے واقف تھے۔ یہاں خیال کے طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کہانی لکھنے والے تک کوئی روایت ایسی منتقل ہوئی ہو کہ تجارت پیشہ لوگ اس پیغمبر کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو چرندوں پرندوں کی بولی جانتا ہو ــــ یہودی جو افغانستان کے علاقے کے بعد ہندوستان میں آ کر فروکش اتر گئے تھے اور رفتہ رفتہ اس کے آس پاس بھی ان کی آبادیاں پھیل گئی تھیں۔ ممکن ہے ان لوگوں کے متعلق یہ مشہور ہو کہ تجارت کرنے والی یہ قوم جو ہمیشہ کے اعتبار سے ویش تھی چرندوں پرندوں کی آوازیں اور بولیاں سمجھتی تھیں۔

راجہ پھر اسے درخت سے اتار، باندھ، کاندھے پر لے چلا اور بیتال نے راستے

میں یہ کہانی سنائی۔ منبلاوتی نگر کا راجہ گنا رہب تھا دور دیس سے ایک راج کمار چرم دیو اس کی سیوا کرنے کو آیا وہ روز راجہ کے درشن کو جاتا لیکن ملاقات نہ ہوتی وہ جو کچھ اپنے ساتھ لے آیا تھا وہ کھانے پینے میں اٹھ گیا۔ یہاں یہ ہوا اور وہاں گھر ویران ہوا۔

ایک دن راجہ شکار کو چلا۔ چرم دیو اس کے ساتھ ہو لیا۔ یکایک جنگل میں راجہ اپنی قوم سے بچھڑ گیا لیکن چرم دیو راجہ کے پیچھے پیچھے تھا آخر اس نے پکار کر کہا۔ مہاراج لوگ پیچھے رہ گئے ہیں اور میں صرف آپ کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہوں۔ راجہ نے گھوڑا روکا چرم دیو برابر آ گیا۔ راجہ نے اس سے پوچھا تو اتنا دبلا کیوں ہو رہا ہے وہ بولا جس مالک کے پاس اور جو ہزاروں کو پالتا ہو اور اپنی خبر نہ لے تو اس میں کچھ اس کا قصور نہیں مقدر کی خطا ہے۔ جیسے دن کو سارا جہاں دیکھتا ہے لیکن وہ الو کو دکھائی نہیں دیتا اس میں سورج کا کیا گناہ۔ حسرت تو یہ ہے کہ جس نے ماں کے پیٹ میں روزی پہنچائی تھی وہ جب دنیا کی غذاؤں کے لائق ہو کے خبر نہیں لیتا۔ نہ معلوم سویا ہوا ہے یا مر گیا۔ اپنے لیے اس بڑے آدمی سے مال اور دولت کی آرزو کرنے سے جو دیتے وقت منہ بنائے اور ناک بھوں چڑھائے زہر یلا کھا کر مر جانا بہتر ہے۔ یہ چھ باتیں آدمی کی آبرو بگاڑتی ہیں۔ کھوٹے آدمی کی محبت، فضول ہنسی، عورت سے بحث، نالائق مالک کی خدمت، گدھے کی سواری، بغیر سنسکرت کے زبان اور یہ پانچ باتیں پیدا ہوتے ہی خدا آدمی کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے عمر، کرم، دولت، علم، شہرت۔ اے مہاراج! جب تک آدمی کا پُن عروج پر رہتا ہے سب اس کے غلام رہتے ہیں اور جب اس کی فیاضی گھٹ جاتی ہے تو بھائی دشمن ہو جاتے ہیں۔ یہ پران کی مقرر بات ہے اس لیے آقا کی خدمت کرنے سے کبھی نہ کبھی پھل مل جاتا ہے۔

راجہ نے یہ سن کر سب باتوں پر غور کیا لیکن اسوقت جواب کچھ نہ دیا اور اس سے کہا مجھے بھوک لگی ہے کہیں سے کچھ کھانے کو لا۔ چرم دیو نے کہا مہاراج یہاں بھوجن نہ ملے گا۔ یہ کہہ کر جنگل میں گیا۔ ایک ہرن مارا چقماق سے آگ نکال گوشت کو بھوننے لگا

راجہ کو کھلایا اور آپ بھی کھایا۔ پھر راجہ نے کہا ہمیں نگر کو لے چلو۔ اس نے راجہ کو اس کے محل لے جاکر پہنچایا۔

راجہ نے پھر اس کی نوکری مقرر کر دی۔ اور بہت سے کپڑے اور زیورات دیئے۔ وہ راجہ کی خدمت میں حاضر رہنے لگا۔ ایک دن راجہ نے کسی کام سے اسے سمندر کنارے بھیجا۔ اس نے کنارے پر ایک دیوی کا مندر دیکھا۔ اس کے اندر جاکر دیوی کی پوجا کی۔ مگر جب وہاں سے باہر آیا تو وہیں اس کے پیچھے سے ایک خوبصورت عورت اس سے پوچھنے لگی۔ اے شخص تو یہاں کس لیے آیا ہے۔ وہ بولا عیش کے لیے آیا ہوں اور تیرے روپ کو دیکھ کر فریفتہ ہوا ہوں۔ اس نے کہا اگر ہم سے کچھ ارادہ رکھتے ہو تو پہلے اس کنڈ میں جاکر اشنان کرو پھر اس کے بعد جو کہوگے کروں گی۔ وہ کپڑے اتار تالاب میں غوطہ مار کر نکلا تو دیکھا اپنے گھر میں کھڑا ہے۔ اس اچنبھے کو دیکھ ناچار اپنے گھر جا اور کپڑے پہن راجہ کے پاس آ سب حال بیان کیا۔ راجہ نے کہا مجھے بھی یہ عجب تماشا دکھا۔

دونوں سوار ہو کئی دنوں میں تالاب کے کنارے گئے۔ اس دیوی کے مندر جاکر پوجا کی۔ راجہ جب باہر نکلا تو وہی عورت ایک سہیلی کو ساتھ لیے راجہ کے پاس آن کھڑی ہوئی اور راجہ کو فریفتہ ہو کر بولی۔ اے راجہ جو مجھے حکم دے سو کروں۔ راجہ نے کہا اگر تو میرا کہنا مانے تو میرے نوکر کی عورت ہو۔ وہ بولی میں تجھ پر فریفتہ ہوئی ہوں اس کی جورو کس طرح ہوں۔ راجہ نے کہا تو نے مجھ سے کہا جو حکم کروں وہ تو کرے۔ بولی آپ کا کہا مجھے منظور ہے۔ پھر راجہ نوکر کا بغیر پھیرے اور رسم ورواج کے بیاہ کر کے دونوں کو ساتھ لے کر اپنے راج میں آیا۔

بیتال یہ کہہ کر بولا راجہ دونوں میں بھلائی کس کی زیادہ رہی۔ راجہ نے جواب دیا نوکر کی۔ کیونکہ جن کا دھرم بھلائی کرنا ہے ان کے بھلائی کرنے میں زیادتی نہیں جو اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کا کام کرے۔ اس لیے نوکر کی بھلائی زیادہ ہوئی۔ یہ بات سنتے ہی بیتال پھر درخت سے جا لٹکا۔

اس کہانی کے پہلے حصے سے تقدیر پرستی کے عقیدے کا معاشرے میں پایا جانا معلوم

ہوتا ہے اور یہ کہ راجہ سورج کی مانند ہوتا ہے۔ اگر اس سے کسی کو فیض نہیں پہنچتا تو اس میں راجہ کا گناہ نہیں اس میں اپنے مقدر کا قصور ہے۔

ایسے بڑے آدمی سے اپنے لیے مال اور دولت کی طلب کرنا جو دیتے ہوئے منہ بنائے اور ناک بھوں چڑھائے کہیں بہتر ہے کہ آدمی زہر کھا کر مر جائے۔ اس لیے اور ان چھ باتوں کے ذکر سے جو آدمی کی آبرو کھوتی ہیں ــــ کھوٹے آدمی کی محبت، فضول ہنسی، عورت سے بحث کرنا، نالائق مالک کی خدمت، گدھے کی سواری اور بغیر سنسکرت کے زبان ــ پتہ چلتا ہے کہ عزت اور آبرو کا معاشرے میں نہایت پاس کیا جاتا تھا۔ اور ہر قیمت پہ عزت مندی اور آبرو کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اور یہ کہ سنسکرت زبان اس زمانے میں اپنے عروج پر تھی۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جو یہ زبان نہیں جانتا تھا وہ ... نہیں اور وہ زبان زبان نہیں جس میں سنسکرت شامل نہ ہو۔

پانچ باتیں خدا پیدا ہوتے ہی آدمی کی تقدیر میں لکھ دیتا ہے۔ عمر، کرم، دولت، علم اور شہرت ــــ یعنی تقدیر میں نہ ہو تو یہ پانچوں باتیں حاصل نہیں ہوتیں۔ گویا ان کا دینے والا خدا ہی ہے ــــ یہ کہ جب تک آدمی سخاوت اور سلوک کرتا رہتا ہے اس کے سب غلام رہتے ہیں اور جب اس میں کمی آتی ہے تو بھائی بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ ان پہ معاشرے میں یقین پایا جاتا تھا بلکہ یہ یقین عقیدے کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

قول کا نہایت پاس کیا جاتا تھا اور اسے پورا کرنے سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جاتی تھی چاہے قول ہارنے کے بعد مرضی کے خلاف ہی بات کرنے کو کہا جائے۔ اس کو ماننا پڑتا تھا۔ سچا آدمی اسے ہی جانا جاتا تھا جو جس بات کو کہتے تھے اور اس کا نباہ کرتے تھے۔

راجہ کا کام ہی بھلائی کرنا مقرر تھا۔ اس لیے اس کا بھلائی کرنا اس کی بھلائی کی زیادتی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ راجہ کا تو دھرم ہی بھلائی کرنا ہوتا ہے۔ اس کی بھلائی میں زیادتی خیال کی جاتی تھی جو اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کا کام کرے اس کی بھلائی ہے۔ معاشرے میں اس انداز کے عقائد لیے ہوئے تھے اور شاستر اور پران کی باتوں کو سب باتوں سے برتر جانتا تھا۔

راجہ جاکر بیتال کو پھر درخت سے اتار اور باندھ کرلے چلا۔ بیتال نے کہانی کہی ــــ
مدن پور نگر کا راجہ بیر بر تھا اس نگر میں برن دت بنیا تھا اس کی بیٹی کا نام ورن سینا تھا بسنت کے موسم میں ایک دن وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے باغ میں سیر و تماشے کو گئی۔ اس کے آنے سے پہلے دھرم دت سیٹھ کا بیٹا سوم دت اپنے دوست کو لیے بن بہار کو آیا تھا۔ لوٹتے ہوئے اس باغ میں آپہنچا اور اسے دیکھ کر عاشق ہوگیا۔ اور اپنے دوست سے بولا وہ ملے تو دل کو آرام ملے ورنہ زندہ رہنا بے فائدہ ــــ اور محبت سے بے چین ہوکر بے اختیارانہ اس کے پاس جا اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا اگر تو مجھ سے محبت نہ کرے گی تو میں جان دے دوں گا۔ وہ بولی ایسا مت کرنا اس میں گناہ ہوگا۔ اس نے کہا تیرے کرشمے نے میرے دل کو چھید دیا ہے اور تیری جدائی کی آگ نے میرے جسم کو جلا دیا۔ اس درد سے میرے ہوش و حواس جاتے رہے اور اس وقت مجھے عشق کے جنون میں دھرم ادھرم کا خیال نہیں ہے۔ لیکن تو جو مجھے قول دے تو میری جان میں جان آئے۔ وہ بولی آج کے پانچویں دن میری شادی ہوگی۔ پہلے میں تجھ سے مل جاؤں گی اس کے بعد اپنے شوہر کے یہاں رہوں گی۔ یہ قول دے اور قسم کھا اپنے گھر کو گئی۔ یہ بھی اپنے گھر کو آیا۔ پانچویں دن اس کی شادی ہوئی۔ خاوند اس کا اسے بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ کئی دنوں کے بعد رات کو اس کی دیورانی اور جیٹھانی نے زبردستی اسے اس کے شوہر کے پاس پہنچایا۔ وہ چاپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں اس کے شوہر نے اسے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر سیج پر بٹھا لیا۔ اس نے جب چاہا کہ گلے لگاؤں تو اس نے ہاتھ سے جھٹک دیا۔ اور جو اس ساہوکار کے بچے سے قول و قرار ہوا تھا، سب بیان کیا۔ اس کے شوہر نے کہا اگر تو سچ مچ اس کے پاس جانا چاہتی ہے تو جا۔ وہ اپنے شوہر کی اجازت پاکر اس سیٹھ کے گھر کو چلی۔ راہ میں چور اسے دیکھ کر خوش ہوا۔ اس کے پاس آکر کہا کہ آدھی پہر رات کے وقت اس اندھیرے میں کپڑے اور زیور پہنے اکیلی کہاں جاتی ہے۔ وہ بولی جس جگہ میرا پریتم پیارا رہتا ہے۔ چور نے کہا یہاں تیرا مددگار کون ہے۔ وہ کہنے لگی دھنش بان لیے میرا ملن میرا مددگار ہے۔ پھر چور سے اپنی ساری داستان بیان کی اور کہا میرا سنگار خراب مت کر میں

تجھے قول دیتی ہوں وہاں سے لوٹوں گی تو سارا زیور تیرے حوالے کر دوں گی۔ چور نے اپنے دل میں اس کا قول مانا اور اسے جانے دیا۔ خود وہیں بیٹھ رہا۔ یہ سوم دت کے پاس گئی۔ وہ سویا تھا اسے جگایا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور کہنے لگا کہ تو دیو کنیا ہے یا رس کنیا یا ناگ کنیا۔ سچ کہہ تو کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ وہ بولی کہ میں آدم زاد ہوں اور برن دت سیٹھ کی بیٹی۔ ورن سینا میرا نام ہے اور تجھے یاد نہیں کیا کہ اس روپ بن میں تو نے میرا زبردستی ہاتھ پکڑ کے عشق کرنے کو تیار تھا اور میں تیرے کہنے پر قسم کھائی تھی کہ شادی کے بعد شوہر کو چھوڑ کر تیرے پاس آؤں گی تو میں آئی ہوں۔ اس نے پوچھا یہ حال تو نے اپنے شوہر سے کہا۔ اس نے کہا میں نے سب کچھ بتایا۔ اس نے سب دریافت کرکے تیرے پاس بھیجا ہے۔ سوم دت بولا یہ ایسا ہے کہ جیسے بغیر کپڑے کے زیور اور بغیر گھی کے کھانا یا بغیر سُر کے گانا۔ اسی طرح میلے کپڑے تیج ہرے کبھی جس بل کو بدچلن بیوی پران کو اور کائر خاندان کو ہرے اور راکشس خفا ہوتا ہے تو پران کو لیتا ہے۔ لیکن عورت کی ضد اور ان ضد دونوں میں دکھ دینے والی ہے۔ عورت جو نہ کرے سو تھوڑا کیونکہ جو بات اس کے دل میں رہتی ہے وہ زبان پر نہیں لاتی۔ اور جو زبان میں ہے وہ ظاہر نہیں کرتی۔ عورت کو خدا نے عجب چیز بنایا ہے۔ یہ کہہ کر اس سیٹھ کے بیٹے نے کہا میں پرائی عورت سے واسطہ نہیں رکھتا۔ یہ سنتے ہی وہ اپنے گھر کو لوٹی۔ راستے میں چور ملا۔ اس سے سارا احوال کہا۔ چور نے حال سن کر شاباش کہا اور چھوڑ دیا۔ اپنے شوہر کے پاس آئی اس سے سارا احوال کہا لیکن اس کے شوہر نے اسے پیار نہ کیا اور کہا کوئل کی خوبصورتی اس کا گلا ہے اور عورت کا حسن شوہر پرستی اور بدصورت آدمی کی خوبصورتی علم عابد کا حسن معافی ــــ

یہ کہہ کر بیتال نے پوچھا ان تینوں میں کس کی سچائی زیادہ ہے۔ راجہ نے کہا چور کی سچائی زیادہ ہے۔ غیر مرد پر اس کا رجوع دیکھ کر شوہر نے چھوڑ دیا اور چور کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لیے چور ہی پر زیادہ شک ہے[ا] ــــ یہ سنتے ہی بیتال اس

[ا] چور کا پتہ لگانے کے لیے یہ (کہانی) مشتبہ آدمیوں کو سنائی جاتی ہے۔ چرانے والا شخص چور کے ایثار کو سب سے بڑا بتاتا ہے۔ (صفحہ ۲۹۲ نثری داستانیں۔ ڈاکٹر گیان چند

درخت سے پھر جا لٹکا۔

سیٹھوں اور رئیسوں کے اپنے باغ ہوتے تھے۔ جیسا کہ پچھلے دنوں تک دلّی کے رئیسوں کے اپنے باغات رہے ہیں (گاؤں اور دیہاتوں میں اب تک یہ سلسلہ جاری ہے) اور ان کے گھر والے برسات کے موسم میں یا سیر و تفریح کے موسم میں باغوں کی سیر کے لیے جاتے تھے اور وہیں کچھ روز تک قیام رکھتے تھے۔ معاشرے کے اونچے طبقے کا یہ عام دستور ہوا کرتا تھا۔

پاپ (گناہ) کا تصور اس معاشرے کے بیشتر لوگوں کو لرزا دیتا تھا اور وہ اس سے بچنے کے لیے ایسے قول دے دیا کرتے تھے جنکو نبھانا ان کے لیے امتحان ہوتا تھا مگر قول کا پاس اس معاشرے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ خصوصاً سوگندھ کھا کے قول دینے کا۔ قول کا ہر ایک فرد اعتبار کیا کرتا تھا چاہے وہ چور ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ عشق کا جنون ہر معاشرے میں عاشق کو دھرم اور ادھرم سے بے نیاز کر دیتا رہا ہے اور عشق کا دیوانہ ہر حد سے گذر جاتا رہا ہے۔

دیوکنیا، رس کنیا یا ناگ کنیا آدم زاد نہیں ہوا کرتیں وہ بھوگ کی پیاسی ہوا کرتی تھیں اور جوانوں کو اپنی خوبصورتی کے جال میں پھنسا کر کسی کام کا نہیں رہنے دیتیں۔ جو جوان ان کے بارے میں جانتے ہیں وہ ان کے جال میں ہرگز نہیں پھنستے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ایسے عاشق کا جیسا کہ سوم دت اس کہانی میں ہے۔ یہ کہنا کہ میں پرائی عورت سے واسطہ نہیں رکھتا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے عشق کا بھوت اتر گیا بلکہ اس لیے کہ استری ہٹ اور بال ہٹ[۱] ـــــ دونوں ہی دکھ دینے والی ہیں۔ عورت جو ذکر ے سو تھوڑا ہے کیونکہ جو بات اس کے دل میں رہتی ہے سو زبان پر نہیں لاتی اور جو زبان پر ہے سو ظاہر نہیں کرتی۔ اسے اس حقیقت کا احساس ہو گیا کہ ورن سینا اپنے اس قول کو نبھانے

کے لیے ایسا کام کر لیتی ہے جس کا تصور ممکن نہیں۔ اور شوہر بھی اس سے مجبور ہو کر اسے غیر مرد کے پاس بھیجنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ باتیں کہ کوئل کی خوبصورتی اس کا گلا ہے اور عورت کا حسن شوہر پرستی اور بدصورت آدمی کی خوبصورتی علم، عابد کا حسن معافی۔ اس معاشرے میں مسلمات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور شاید بلکہ یقیناً اس معاشرے میں بھی۔

اس کہانی میں چور کا ایثار، شوہر، عاشق سے زیادہ بڑا بتایا گیا ہے اس لیے کہ شوہر نے غیر مرد کی جانب رجوع دیکھ کر چھوڑ دیا اور عاشق نے اس لیے کہ عورت دکھ دینے والی ہے۔ چور کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یعنی وہ معاشرہ ایثار کو جو سچا ہو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

راجہ بتیال کو پھر درخت سے اتار اور باندھ کر لے چلا۔ بتیال نے کہانی سنائی ـــــ

گوڑ دیس کے بردوان نگر میں راجہ گن شیکھر راج کرتا تھا۔ اس کا دیوان ابھے چند نام کا ایک سوداگر تھا۔ اس کے کہنے اور سمجھانے سے راجہ نے بھی سراوگ دھرم اختیار کر لیا۔ شو کی پوجا وشنو کی پوجا اور گئو دان اور بھوم دان، پنڈ دان، جوا اور مدرا (شراب) ان سب کو منع کر دیا کہ شہر میں کوئی نہ کرے۔ مُردوں کی ہڈیاں گنگا میں کوئی نہ لے جاوے اور راجہ کی اجازت سے ان باتوں کی منا ہی کے لیے دیوان نے شہر میں منادی کرا دی کہ ان باتوں کے کرنے والوں کا مال اسباب چھین کر شہر سے نکال دیا جائے گا۔

ایک دن دیوان راجہ سے کہنے لگا کہ دھرم کی بات سنیے جو کوئی کسی کی جان لیتا ہے وہ دوسرے جنم میں اس کی بھی جان لیتا ہے۔ اس گناہ سے دنیا میں آدمی کا جینا مرنا نہیں چھوٹتا اور وہ جنم لیتا ہے اور مرتا ہے اس لیے دنیا میں پیدا ہو کر دھرم کرنا بہت اچھا ہے۔ نفس، غصہ، لالچ اور کسی دنیاوی چیز سے بہت زیادہ لگاؤ بس میں ہو۔ برہما، وشنو، مہادیو کسی نہ کسی طرح دنیا میں اوتار لے کے آتے ہیں ان سے گائے اچھی ہے جو راگ، ولاس، مد، کرودھ، لوبھ، موہ سے خالی ہے اور دنیا کی خدمت اور حفاظت کرتی ہے اور اس کے جو بچے ہوتے ہیں وہ بھی دنیا میں لوگوں کو اچھی طرح سکھ دیتے ہیں اس لیے دیوتا اور منی سب گئو کو مانتے ہیں۔ اس لیے دیوتاؤں کو ماننا اچھا نہیں۔ اس دنیا میں گائے کو ماننے اور ہاتھی سے چیونٹی اور حیوان پرندوں تک ہر ایک کی جان کی حفاظت کرنا دھرم ہے۔ دنیا

ہیں اس کے برابر کوئی پاپی نہیں جو دوسرے کا گوشت کھا کر اپنا گوشت بڑھاتے ہیں، وہ آخر دوزخ میں پڑتے ہیں۔ اس لیے انسان کو ضروری ہے کہ ہر ایک جان کی حفاظت کرے اور جو لوگ دوسرے کی تکلیف کو نہیں جانتے اور غیروں کو مار مار کر کھاتے ہیں ان کی اس دنیا میں عمر کم ہوتی ہے اور لولے، لنگڑے، کانے، اندھے، بونے، کبڑے ایسے اعضا سے محروم ہو جنم لیتے ہیں۔ جیسے حیوان اور پرندوں کے اعضا کھاتے ہیں بالکل ویسے ہی اپنے اعضا کھلواتے ہیں۔ شراب پینا بہت بڑا گناہ ہے اس لیے شراب اور گوشت کا کھانا پینا درست نہیں۔

دیوان نے راجہ کو اس طرح اپنی مت کا گیان دیا کہ جو دیوان کہتا تھا وہی راجہ کرتا تھا۔ برہمن، جوگی، جنگم سیورا، سنیاسی، درویش کسی کو نہ مانتا تھا اور اس دھرم کے مطابق راج کرتا تھا۔ ایک دن وہ موت کے جنگل میں آ کر مر گیا اور اس کا بیٹا دھرم دھن راجہ ہوا۔ ایک دن اس نے ایسے جیند دیوان کو پکڑوا سر پہ سات چوٹیاں رکھوا منھ کالا کر گدھے پر چڑھوا منادی کروا دیس سے نکال دیا۔

ایک دن وہ راجہ بسنت کے موسم میں رانیوں کو ساتھ لیے ایک باغ کی سیر کو گیا۔ اس باغ میں ایک بڑا تالاب تھا اس میں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ راجہ اس تالاب کی خوبصورتی دیکھ اور اس سے متاثر ہو کر کپڑے اتار اشنان کے لیے تالاب میں اترا اور ایک پھول توڑ کنارے کے قریب آ رانی کے ہاتھ میں دے گا۔ وہ پھول چھوٹ کر رانی کے پاؤں پر گرا اور اس کی چوٹ سے رانی کا پاؤں ٹوٹ گیا۔ تو راجہ بہت گھبرایا اور ریکایک تالاب سے باہر نکل کر اس کی فکر کرنے لگا۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ چاندنی کی روشنی پھیلی، چاند کی روشنی پڑتے ہی دوسری رانی کے جسم میں پھپھولے پڑ گئے۔ اس وقت کسی دوسری گرہستی میں موسل کی آواز آئی اس سے تیسری رانی کے سر میں ایسا درد ہوا کہ اس کو غش آ گیا۔

یہ کہہ کر بیتال بولا ان تینوں رانیوں میں سب سے زیادہ نازک کون ہے۔ راجہ نے بتایا جس کے سر میں درد ہوا اور غش آیا۔ یہ سنتے ہی بیتال پھر درخت سے جا لٹکا۔

اس کہانی کے پہلے حصے میں دیوان کا عروج اور زوال کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس زمانے

میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ سراوگ دھرم تھا۔

ایک زمانہ تھا جب جین دھرم اور ہندو دھرم کے ساتھ شدید کشمکش رہی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جین یا سراوگی دھرم کو ماننے والے اپنے دھرم کے مطابق اہنسا پر زور دیتے تھے۔ اس مذہب میں شیو کی پوجا، وشنو کی پوجا اور گئو دان اور بھوم دان، پنڈ دان، جوا شراب، ممنوع چیزیں تھیں اور مُردوں کی ہڈیاں بھی گنگا میں نہیں لے جائی جاتی تھیں۔ وہ ان کو غیر ضروری سمجھتے تھے اور یہ بھی عقیدہ تھا کہ جو کسی کی جان لیتا ہے وہ دوسرے جنم میں اس کی جان لیتا ہے اور گناہ کے سبب آدمی کو جینے مرنے سے نجات نہیں ملتی اور ایسے لوگ دوسرے جنم میں اپنے مکمل اعضا سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے دھرم کا کام کرنا اچھا ہے اور نفس، غصّہ اور لالچ اور کسی دنیاوی شے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت (موہ) بس میں ہو اور دھرم میں گائے کی اہمیت سب سے زیادہ جانی جاتی تھی اور دیوتاؤں کے مقابلے میں اسے اچھا جانا جاتا تھا۔ نیز جانوروں اور پرندوں کی جان کی حفاظت کرنا دھرم کی بنیادی بات ہے۔ اور اس کے برابر کوئی پاپ نہیں کہ آدمی دوسرے کا گوشت کھا کر اپنا گوشت بڑھائے۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں عمر کم ہوتی ہے۔ اور لولے، لنگڑے، کانے، اندھے، بونے، کبڑے ایسے اعضا سے محروم ہو کر پیدا ہوتے ہیں جیسے جانوروں اور پرندوں کے اعضا کھاتے ہیں ویسے ہی اپنے اعضا کھلواتے ہیں۔

کہانی کے دوسرے حصے میں رانیوں کی نزاکت کا ذکر ہے۔ معاشرے میں رانیوں کو سب سے زیادہ نازک مزاج سمجھا جاتا تھا اور ان سے نچلے طبقے کی عورتوں کو ان سے کم یعنی یہ نزاکت طبقے کی نسبت سے کم ہوتی جاتی تھی۔ یہ صورت کم و بیش آج بھی ہے۔ رانیوں میں سب سے زیادہ نازک مزاج راجہ بکرم نے اس رانی کو بتایا ہے جو کسی گرہستی میں موسل کی آواز سے سر کے درد میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اسے غش آ جاتا ہے اور زمین کی معمولی دھم کی آواز سے سر میں درد ہو گیا۔ اگرچہ اس کی وجہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتی۔ پھول کے پیر پر گرنے سے چوٹ آنے کے مقابلے میں اس عورت کو زیادہ

نازک کیوں تصور کیا گیا۔

یہاں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے کہ راجہ کی تین رانیاں ہیں جبکہ ہندو دھرم میں صرف ایک ہی بیوی ہوتی تھی۔ یہ ہمالیائی علاقے میں مروج شادی کے قانون کے اثرات معلوم ہوتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ قانون اس علاقے سے ہمالیائی علاقوں تک پہنچا ہوگا۔

راجہ بیتال کو درخت سے اتار لایا اور کاندھے پر رکھ کر لے چلا۔ بیتال نے یہ کہانی سُنائی —— بلبھ نام کا راجہ پونے پور میں راج کرتا تھا۔ ست پرکاش نام کا ایک شخص اس کا دیوان تھا۔ دیوان کی بیوی کا نام لکشمی تھا۔ راجہ نے ایک دن دیوان سے کہا راجہ ہو کر جو خوبصورت عورت سے بھوگ نہ کرے اس کا راج کرنا بے سود ہے۔ یہ کہہ کر دیوان کو راج پاٹ سونپ خود عیش و آرام کرنے لگا اور راج کے بارے میں ہر ایک فکر سے بے نیاز ہوگیا اور دن رات بے فکری سے گذارنے لگا۔ ایک دن دیوان اپنے گھر میں اداس بیٹھا تھا کہ اس کی بیوی نے اس کی اداسی کا سبب معلوم کیا اور کہا ان دنوں آپ کو بہت دُبلا دیکھتی ہوں۔ وہ بولا مجھے رات دن راج کی فکر رہتی ہے۔ راجہ تو آٹھوں پہر عیش و آرام میں رہتا ہے۔ اس کی بیوی بولی آپ نے بہت دنوں راج کاج کیا اب تھوڑے دنوں کے لیے راجہ سے رخصت لو۔ تیرتھ یاترا کرو۔ دیوان یہ بات سُن کر چپ ہو رہا۔ اور جب وہاں سے اٹھا دربار کے وقت راجہ کے پاس جا رخصت لے کر تیرتھ یاترا کرنے نکلا۔ جاتے جاتے سمندر کے کنارے سمت بندھ رامیشور جا پہنچا۔ وہاں مہادیو کا درشن کرکے باہر آیا تو اس کی نظر سمندر کی طرف جا پڑی۔ دیکھتا ہے کہ ایک ایسا سونے کا پیڑ اس میں لگا ہوا ہے کہ جس کے زمرد کے پتے پکھراج کے پھول مونگے کے پھل نہایت خوشنما دکھائی دیتے۔ اس درخت پر ایک نہایت خوبصورت نائکہ بین ہاتھ میں لیے بیٹھی دلفریب آواز سے گاتی ہے۔ ایک گھڑی کے بعد وہ درخت سمندر میں چلا گیا۔ دیوان یہ تماشا دیکھ کر اپنے نگر لوٹ آیا۔ اور راجہ کے پاس جا ڈنڈوت کی اور بولا مہاراج میں ایک عجوبہ دیکھ آیا ہوں اور اس سے کل کیفیت بیان کردی۔ اس سے پہلے دیوان نے کہا کہ پہلے کے لوگ کہہ گئے ہیں جو بات کسی کی عقل

میں نہ آوے اور کوئی اس پر باور نہ کرے وہ بات نہ کہی جائے لیکن میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے صاف صاف دیکھا ہے۔ راجہ یہ سُن راج پاٹ دیوان کو سونپ اکیلا سمندر کی طرف چلا۔ کئی دنوں میں وہاں پہنچا اور مہادیو کے درشن کو سمندر میں گیا۔ جیسا ہی پوجا کرکے باہر آیا کہ سمندر سے وہی درخت نائکہ سمیت نکلا۔ راجہ سمندر میں کود گیا اور اس درخت پر جا بیٹھا وہ درخت راجہ سمیت پاتال کو چلا گیا۔ وہ عورت راجہ کو دیکھ کر بولی کہ اے راجہ کس واسطے تو یہاں آیا ہے۔ راجہ نے کہا میں تیرے حسن پر فریفتہ ہو کر آیا ہوں۔ اس نے کہا اگر تو کالی چودس کے دن مجھ سے نہ ملے تو میں تیرے ساتھ بیاہ کروں۔ راجہ نے یہ بات مانی اور اس سندری نے قول لے کر راجہ کے ساتھ بیاہ کرلیا۔

جب اندھیری چتر دیش آئی تو اس نے کہا اے راجہ تو میرے نزدیک مت رہ۔ یہ سن کے راجہ تلوار ہاتھ میں لے وہاں سے اٹھا اور ایک کنارے جا چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب آدھی رات ہوئی ایک دیو آیا اور اس نے آتے ہی اسے گلے لگا لیا۔ راجہ یہ دیکھ کر کھانڈا لیے ہوئے آیا اور بولا اے پاپی راکشس میرے سامنے تو عورت کو ہاتھ مت لگا۔ پہلے مجھ سے جنگ کر۔ جب تک تجھے نہیں دیکھا تھا اس وقت تک مجھے خوف تھا اور یہ کہنے کے ساتھ ایسا کھانڈا مارا کہ دھڑ سے سر جدا ہوا زمین پر تڑپنے لگا۔ یہ دیکھ وہ بولی تو نے بڑا احسان کیا اور کہا نہ تمام پہاڑوں میں لعل ہوتے ہیں نہ سب شہروں میں ستونتی عورت نہ ہر ایک بن میں چندن پیدا ہوتا ہے نہ ہر ایک ہاتھی کے ماتھے میں مکنا ہوتا ہے۔ راجہ نے اس سے پوچھا یہ راکشس کس واسطے کرشن چتر درشن کو تیرے پاس آیا تھا۔ وہ بولی میرے باپ کا نام بدیادھر ہے۔ سندری میرا نام ہے اور میرا باپ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ ایک دن کھانے کے وقت میں گھر میں نہ تھی۔ میرے باپ نے غصے میں آکر مجھے بد دعا دی کہ تجھے کالی چودس کے دن راکشس آکر گلے سے لگایا کرے گا۔ میں نے کہا۔ پتا جی آپ نے بد دعا تو دے دی لیکن اب مجھ پر مہربانی کرو —— اس نے کہا ایک مرد بہادر آکر جب اس راکشس کو مارے گا تو اس بد دعا کے اثر سے تو نجات پائے گی۔ میں اب اپنے باپ کو نمسکار کرنے جاؤں گی۔ راجہ بولا اگر تو میرے احسان کو مانے تو ایک بار میرے

راج کو چل کر دیکھو اس کے بعد اپنے پتا کے درشن کو جانا۔

راجہ اسے ساتھ لے اپنی راجدھانی میں آیا خوشیاں منائی گئیں۔ دربار میں آ کر سارے نگر کی منگلا مبارکباد دینے لگی۔ راجہ نے بہت سا دان پن کیا پھر کئی دن بعد وہ سندری بولی۔ اب میں اپنے باپ کے یہاں جاؤں گی۔ راجہ نے اداس ہو کر کہا اچھا جاؤ۔ راجہ کو اداس دیکھ کر اس نے کہا میں نہ جاؤں گی۔ راجہ نے کہا تو نے کیوں اپنے باپ کے یہاں جانا ترک کیا۔ وہ بولی اب میں انسان کی ہو چکی اور میرا باپ گندھرب ہے۔ اب میں جاؤں تو میری قدر نہ کرے گا۔ اس لیے میں نہیں جاتی۔ راجہ نے بہت خوش ہو کر لاکھوں روپے کا دان پن کیا۔ راجہ کے اس احوال کے سننے سے دیوان کی چھاتی پھٹی اور وہ مر گیا۔

یہ کہہ بیتال نے راجہ بکرم سے پوچھا اے راجہ وہ دیوان کس لیے مرا۔ راجہ بکرم نے جواب دیا۔ دیوان نے دیکھا کہ راجہ تو عیش کرنے لگا اور راج کاج کی فکر سب بھلا دی۔ رعایا بغیر سرپرست ہوئی۔ اب میرا کہنا کوئی نہ مانے گا۔ یہ سنتے ہی بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

دیوان کی بیوی کا دیوان کو دبلا دیکھ کر یہ مشورہ دینا "بہت دنوں تم نے راج کاج کیا اب تھوڑے دنوں کو راجہ سے بدا ہو اور تیرتھ یاترا کرو" ـــــ بتاتا ہے کہ اس معاشرے میں تیرتھ یاترا کا اور دھرم کرم کا بہت رواج تھا اور اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ اہمیت غالباً دو وجہوں سے تھی ایک تو عاقبت کی فکر اور دوسرے دنیا کے کاموں سے دل و دماغ کے لیے راحت کی طلب۔ سونے کے درخت کا سمندر میں دکھائی دینا اور پھر اس کا پاتال میں اتر جانا اور داستانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے اس یقین کا معاشرے میں پتہ چلتا ہے کہ یاتراؤں کے مقام پر ایسے عجوبے دکھائی دیتے رہتے تھے یا پھر جان بوجھ کر دکھائے جاتے تھے۔

راجہ کے درخت کو دیکھ کر سمندر میں کود جانے سے ایک تو راجہ کی ہمت اور دلیری کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں راجاؤں کے ساتھ اس طرح کی داستانیں وابستہ ہوتی تھیں کہ کسی خوبصورت عورت کو حاصل کرنے کے لیے طرح طرح سے وہ اپنی

زندگی پر کھیل جاتے تھے۔ رامیشورم کا مندر اڑیسہ میں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کہانی بھی وہیں تہذیب پاتی ہے۔

ہندو ادب میں بددعا یا شراپ دینے کی روایتیں اکثر ملتی ہیں۔ یہاں گویا اس نے اپنی بیٹی کو جو نہایت خوبصورت تھی۔ سزا کے طور پر ایک راکشس کے سپرد کر دیا۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو کوئی ایسا شراپ بھی دے سکتا ہے۔ چتر کے معنی چار کے ہیں رشی رس کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح چتر دسنی چودھویں رات ہوئی لیکن یہ وہ رات ہے جو پورن ماشی کے چودہ دن بعد آتی ہے اور جس دن چاند بالکل غائب ہو جاتا ہے اور اسے عام ہندی میں اماوس کی رات بھی کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ خوبصورت استری ایک ایسے باپ کی بیٹی ہے جو گندھرب ہے۔ گندھرب پریوں کی طرح پرواز کرتے ہیں اور آسمان کے موسیقی کار ہیں وہ ایسے کسی انسان کو اپنے درمیان نہیں ملاتے جلاتے جو آدم زادوں سے مل گیا ہو۔ اس لیے یہ سندر استری بھی اپنے خاندان کی طرف واپس نہیں گئی۔ اس میں چھوت چھات کا تصور بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔

یہ کہاوت کہ "نہ تمام پہاڑوں میں لعل ہوتے ہیں نہ سب شہروں میں سنتوئی ناری نہ ہر ایک بن میں چندن اپجتا ہے نہ ہر ایک ہاتھی کے مستک پر مکتا ہوتا ہے۔" معاشرے کی حقیقت پسندی کے رجحان کو ظاہر کرتی ہے۔ احسان کو ماننا معاشرے میں ایک بڑا ضروری فرض جانا جاتا تھا۔ محسن کی کسی بات کو ٹالا نہیں جاتا تھا۔ چاہے اس میں اپنی مرضی ہو یا نہ ہو اس لیے سندری راجہ کو اداس دیکھ کر باپ کے یہاں جانا موقوف کر دیتی ہے۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب آدم زاد سے مل گئی تھی۔ (اس کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے)

راجاؤں کا ایسے موقعوں پر دان پن کرنا جب ان کی دلی خوشی پوری ہوتی تھی عام تھا۔ اس سے راجاؤں کا دھرم کرم بھی ظاہر ہوتا تھا اور صدقہ بھی اس طرح سے دے دیا جاتا تھا۔ راجاؤں کے عیش و آرام میں کھو جانے اور راج کی سب فکر بھلا دینے سے پرجا اناتھ

خیال کی جانے لگی تھی اس صورت میں دیوان کی اہمیت بھی پرجا کی نظر سے گر جاتی تھی۔
اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرہ دیوان کی قدر و منزلت راجہ کے سبب ہی کرتا تھا اور پرجا بھی جب تک ہی اس کو مانتی تھی جب تک وہ ان کی دیکھ بھال راجہ کے ساتھ کرتا تھا۔ راجہ پھر بیتال کو درخت سے اتار لایا اور لے چلا۔ بیتال نے کہانی کہی۔

چوڑا پور نگر کا راجہ چوڑامن تھا۔ اس کے گرو کا نام دیو سوامی اور اس کے بیٹے کا نام ہری سوامی تھا۔ وہ کام دیو کی مانند خوبصورت شاستر میں برہسپت کے برابر اور اس کا رہن کبیر کا رہن نہایت سادہ۔ ایک برہمن کی بیٹی کو جس کا نام لاونیوتی تھا بیاہ لایا۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ حویلی کی چھت پر ایک رات دونوں سوئے پڑے تھے۔ یکایک ہری سوامی کی بیوی کے منھ پر سے اوڑھنی سرک گئی اور گندھرپ اڑن کھٹولے پر بیٹھا ہوا کہیں جاتا تھا۔ اس کی اس پر نظر پڑی وہ اڑن کھٹولے کو نیچے لایا اور اسے سوئے ہوئے اڑن کھٹولے پر رکھ کر لے اڑا۔ کچھ دیر بعد برہمن سوتے ہوئے جاگا تو اس نے بیوی کو نہ دیکھا وہ گھبرایا اور چھت سے اتر کر سارا گھر ڈھونڈھا۔ نہ ملی تو ساری نگری میں گلی گلی کوچہ کوچہ ڈھونڈھا۔ پھر اپنے دل میں کہنے لگا کون لے گیا کہاں گئی۔ جب کچھ پتہ نہ چلا تو افسوس کرتا ہوا گھر آیا۔ اور پھر ڈھونڈھا۔ اس کے بغیر گھر سونا دکھائی دیا تو بے چینی سے بے اختیار ہو کر ہائے پران پیاری ہائے پران پیاری پکارنے لگا۔ اور آخر گرہستی چھوڑ بیراگ لے لیا۔ اور تیرتھ یاترا کو نکل پڑا۔ نگر نگر گاؤں گاؤں پھرتے ہوئے ایک نگر میں دوپہر کو پہنچا۔ بھوک سے بے حد ناچار ہوا تو ڈھاک کے پتوں کا دونا بنا ہاتھ میں لے ایک برہمن کے گھر جا بھوجن کی بھکشا مانگی۔ برہمن دونا لے گھر میں جا کر کھیر سے بھرا دونا لایا۔ وہ تالاب کے کنارے گیا۔ ایک بڑے درخت کی جڑ پر دونا رکھ تالاب میں منھ ہاتھ دھونے لگا۔ درخت کی جڑ سے کالا ناگ نکلا اور اس نے دونے میں منھ ڈال دیا اور پھر چلا گیا۔ دونے میں زہر ہی زہر ہو گیا۔ برہمن ہاتھ منھ دھو کر آیا۔ اسے یہ حال معلوم نہ تھا۔ بھوک بھی بہت لگی تھی ساری کھیر کھا ڈالی۔ زہر چڑھا تو اس نے برہمن سے جا کر کہا تو نے مجھے زہر دیا ہے اور اب میں اس سے مرتا ہوں۔ یہ کہتے ہی وہ چکرا کر گرا اور مر گیا۔ برہمن نے اپنی خاص عورت کو گھر سے نکال دیا۔ اور کہا برہمہ

ہتھیاری تو یہاں سے جا۔ اتنا کہہ کر بیتال بولا اے راجہ برہمہ ہتیا کا پاپ کس کو ہوا۔ راجہ نے کہا سانپ کے منھ میں تو زہر ہوتا ہی ہے اور برہمن نے بھوکا جان کر بھکشا دی۔ اس برہمن نے سوامی کی آگیا سے بھکشا دی اور اس نے بھی انجانی کھیر کھائی۔ مختصر یہ کہ ان میں سے پاپ کسی کو نہیں ہوا اور جسے جو پاپ لگاوے وہ پاپی۔

بیتال یہ سنتے ہی پھر درخت سے جا لٹکا۔

کام دیو کی مانند خوبصورت ہونا۔ برہسپت کی مانند شاستر میں پورا ہونا اور کبیر جیسا رہن میں ہونا۔ یہ اس معاشرے میں کبھی مسلمات کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور خوبصورتی علم اور دولتمندی کی بہترین تشبیہیں یہی تھیں۔ کبیر قدیم ہندو روایات اور عقیدوں کے مطابق جکشوں کا راجہ ہے جو کیلاش کے نزدیک النکا نگری میں رہتے ہیں اور کبیر جس کا آقا ہے وہ خود دھن تیج۔

گندھرپ کا خوبصورت عورتوں کو اڑا لے جانے کا ذکر اکثر داستانوں میں آیا ہے۔ گندھرپ دیو، کنش اور پریاں طلسمی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے متعلق اس معاشرے میں بھی یہ یقین پایا جاتا تھا کہ یہ ان ہونی کو انجام دیا کرتے ہیں جو نہ کہیں دیکھنے میں آتے ہیں اور نہ کہیں سننے میں آتے ہیں۔ یہ کہاوت کہ "جب پریت کے بس میں آدمی ہوتا ہے تب اسے دھرم ذات اور کھانے پینے کا کوئی پرہیز نہیں رہتا۔ اور نر آدمی ہو جہاں پاتا ہے تہاں کھاتا ہے۔" اس کے مشاہدے ہر معاشرے پر ہو سکتے ہیں۔ برہمن کو بھکشا دینا یا دان دینا بہت بڑا اپن کا کام سمجھا جاتا تھا۔

برہمن ہتیا بہت بڑی ہتیا جانی جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں تھا۔ ایسے کسی شخص کا سایہ بھی منحوس اور بدشگون جانا جاتا تھا جو کسی برہمن کا ہتیارا ہو۔ اس کہانی میں بظاہر برہما ہتیا کا پاپ کسی کو نہیں ہوا اور کہا گیا ہے کہ ان میں کسی کو اگر کوئی برہمن ہتیا کا پاپ لگائے تو وہی پاپی ہے۔

وہ معاشرہ اس قسم کی ہتیاؤں سے اپنا دامن بچائے رکھتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا بلکہ یقین اور عقیدہ رکھتا تھا کہ اس کی سزا دوزخ میں ہی پڑتا ہے۔ اور دوزخ کا تصور ہر دور اور ہر معاشرے میں نہایت بھیانک رہا ہے۔

راجہ بکرم بیتال کو درخت سے اتار پھر اسے لے چلا اور بیتال نے کہانی کہی۔

چندر ہردے نگر میں رندھیر نام کا راجہ راج کرتا تھا۔ وہاں دھرم دھوج نام کا ایک سیٹھ تھا اس کی بیٹی کا نام شوبھی تھا۔ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ اس کی جوانی دن بدن بڑھتی تھی۔ اس کا حسن پل پل زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اس نگر میں یکایک چوریوں کا زور ہوا جب مہاجنوں نے چوروں کے ہاتھوں بہت دکھ پایا تب راجہ کے پاس جا فریادی ہوئے اور کہا اب ہم اس شہر میں نہیں رہ سکتے۔ راجہ نے تسلی دی اور کہا آگے دکھ نہ پاؤ گے۔

راجہ نے بہت سے آدمی چوکی داری کو بھیج دیئے اور حکم دیا جہاں چوروں کو پاؤ بغیر پوچھے مار ڈالو۔ اس پر بھی چوری ہوتی تھی۔ ساہوکار پھر راجہ کے پاس گئے۔ راجہ نے ان سے کہا آج سے نگر کی چوکی کے لیے میں نکلوں گا۔

رات کو راجہ اکیلا ڈھال تلوار لے کر پیادہ ہی نگری کی چوکی کرنے لگا۔ آگے جا کر دیکھا تو ایک چور سامنے سے چلا آتا تھا۔ راجہ نے اسے للکارا وہ بولا تو کون ہے۔ راجہ نے کہا، میں چور ہوں۔ وہ خوش ہو کر بولا آؤ مل کر چوری کریں گے اور باتیں کرتے ہوئے ایک محلے میں گھسے اور کتنے ہی گھروں میں چوری کر مال لے کر نگر کے باہر نکل آئے۔ کنوئیں پر آئے اور اس میں اتر کر پاتال پور پہنچ گئے۔ چور راجہ کو دروازے پر کھڑا کر دولت اپنے گھر میں لے گیا۔ اتنے میں گھر میں سے ایک خادمہ آئی وہ بولی مہاراج آپ کہاں اس ظالم کے ساتھ آئے۔ خیر اس میں ہے کہ اس کے آنے سے پہلے تم یہاں سے جہاں تک ہو سکے بھاگ جاؤ ورنہ وہ تمہیں آتے ہی مار ڈالے گا۔ راجہ نے کہا میں راستہ نہیں جانتا۔ اس خادمہ نے راستہ دکھایا اور راجہ اپنے محل میں آیا۔ دوسرے دن راجہ نے اپنی سب فوج کے ساتھ کنوئیں کی راہ جا کر پاتال پوری میں چور کا گھر بار گھیر لیا۔ وہ چور کسی اور راہ سے اس نگر کے مالک دیو کے پاس گیا اور کہا ایک راجہ مجھے مارنے کو چڑھ آیا ہے میری مدد کرو ورنہ تمہاری نگری چھوڑ دوسرے نگر میں جا بستا ہوں۔ دیو نے اس سے کہا تو میرے کھانے کو کچھ لایا ہے میں تجھ سے خوش ہوں، اور جہاں راجہ فوج لیے گھیرے ہوئے تھا وہ دیو آدمیوں اور گھوڑوں کو وہاں جا کھانے لگا۔ راجہ اس دیو کی صورت دیکھ کر بھاگا اور جو لوگ بھاگ سکے وہ بھی بھاگ گئے۔ راجہ اکیلا بھاگا

جاتا تھا کہ چور نے للکارا راجپوت ہو کر لڑائی سے بھاگتا ہے۔ راجہ یہ سنتے ہی لوٹا اور وہ دونوں لڑنے لگے۔ آخر راجہ اسے گرفتار کر کے نگر میں لے آیا اور اسے اونٹ پر بٹھلا ڈھنڈورا ساتھ کر نگری میں پھرانے کو بھیجا۔ اور اسے سولی کا حکم دیا۔ جب دھرم دھوج سیٹھ کی حویلی کے نیچے چور گیا تو سیٹھ کی بیٹی نے ڈھنڈورے کی آواز سُن خادمہ سے پوچھا کہ یہ منادی کیا ہے۔ وہ بولی جو چور اس نگر میں چوری کرتا تھا اسے راجہ پکڑ لایا ہے اب اسے سولی دی جائے گی۔ وہ بھی دیکھنے کو دوڑی۔ چور کا روپ جوبن دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی اور اپنے باپ سے راجہ کے پاس جانے کو اور چور کو چھڑا لانے کو کہا۔ سیٹھ نے کہا ایسے چور کو راجہ کیوں چھوڑے گا۔ اس نے کہا اگر سب کچھ دینے سے بھی چھوڑ دے تو فوراً چھڑا لاؤ، اگر وہ نہ آئے گا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ سیٹھ چور کے پاس گیا اور پانچ لاکھ روپے لے کر چور دے دینے کے لیے کہا۔ راجہ نے کہا اسے میں کیسے چھوڑوں۔ اس نے اتنی بڑی تباہی مچائی۔ راجہ کے نہ ماننے پر وہ مجبور ہو کر گھر آیا۔ اور بیٹی سے کہا جتنا کہنے کا دھرم تھا میں نے کہا مگر راجہ نہ مانا۔ اس عرصہ میں چور کو نگر کا چکر لگوا کر سولی کے پاس لا کر کھڑا دیا۔ چور نے سیٹھ کی بیٹی کا احوال سُنا تو خوب کھلکھلا کر ہنسا اور پھر زور زور سے رونے لگا۔ لوگوں نے اسے سولی پہ کھینچ دیا۔ سیٹھ کی بیٹی ستی ہونے کے لیے وہاں جا پہنچی۔ چتا بنوا اس میں بیٹھ چور کو سولی سے اتار اس کا سر گود میں رکھ جلنے کو بیٹھا چاہتی تھی۔ یکایک وہیں قریب کے ایک مندر سے دیوی نکل کر بولی تجھ سے میں تیری ہمت پر بہت خوش ہوئی۔ مانگ مجھ سے بر مانگ۔ سیٹھ کی بیٹی بولی اس چور کو جیون دان دے۔ دیوی نے کہا ایسا ہی ہوگا اور دیوی نے پاتال سے امرت لا کر چور کو زندہ کر دیا۔

یہ کہہ کر بیتال نے راجہ سے پوچھا کہ چور پہلے کیوں ہنسا پھر کیوں رویا۔ راجہ نے جواب دیا۔ چور نے دل میں سوچا یہ جو میرے لیے اپنا سب کچھ دیتی ہے اب اس کی میں کیا بھلائی کروں گا اور وہ رویا پھر اپنے دل میں سوچا کہ مرتے کے وقت اس نے محبت کی بھگوان کی مایا کچھ جانی نہیں جاتی۔ دیکھو وہ کلچھن کو لکشمی دے کل ہین کو علم دے۔ مورکھ کو خوبصورت عورت دے۔ پہاڑ پہ بارش کر دے۔ ایسی ایسی باتیں دل میں لا کر وہ ہنسا۔

بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

راجہ کا نگر کی چوکی دینے کے لیے خود نکلنا یہ بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں راجہ پرجا کے دکھ سکھ کا بہت خیال رکھتے تھے اور اس کے دکھ کو دور کرنے کے لیے جب وہ اپنے آدمیوں کو کامیاب نہ پاتا تھا تو خود کمر بستہ ہو جاتا تھا۔

راجہ کا چور کو اپنا چور بتانا اور کئی کہانیوں میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ یہاں چور کا پورا راز معلوم کرنے کے لیے چور کے ساتھ چوریوں میں شریک رہتا ہے اور اس کے ساتھ پاتال پوری اس کے مکان تک پہنچتا ہے اور دوسرے دن فوج کے ساتھ جا کر چور کے مکان کو گھیر لیتا ہے لیکن چور اس نگری کے مالک دیو کے پاس دوسرے راستے سے نکل کر پہنچ جاتا ہے اور دیو راجہ کی فوج اور اس کے گھوڑوں کو کھانے لگتا ہے۔ مگر راجہ چور کے للکارنے پر لڑ کر اس کی مشکیں باندھ کر اپنے نگر لے آتا ہے۔

سیٹھ کی بیٹی کا چور پر فریفتہ ہو جانا جبکہ وہ اس کی حویلی کے پاس سے تشہیر کے لیے لے جایا جا رہا تھا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہ اپنے باپ سے چور کو چھڑوانے کے لیے کہتی ہے۔ راجہ نہیں مانتا اور اسے سولی دے دی جاتی ہے۔ یہ معاشرے کے طور طریق اور راج پاٹ کے قواعد کی بات ہے۔ سیٹھ کی بیٹی کا ستی ہونے کے لیے آنا کیونکہ اس نے چور کو اپنا شوہر مان لیا اور چور کا ہنسنا اور پھر رونا یہ عام باتیں ہیں۔ ہر معاشرے میں ہوتی رہتی ہیں۔ دیوی کا سیٹھ کی بیٹی کی ہمت پر خوش ہو کر اسے بر مانگنے کے لیے کہنا اور بر مانگنے پر چور کو امرت لا کر زندہ کر دینا دیوی دیوتاؤں اور عقیدوں کی باتیں ہیں۔

کسی کے لیے کسی کو اپنا سب کچھ دینے پر اس کے اپکار کو فرض جانا جاتا تھا یہ اس زمانے کے معاشرے کی بڑی پہچان تھی۔ اس لیے کہ اس فرض کو چور نے بھی محسوس کیا۔ اس کے ساتھ معاشرے یا خدا کی ذات سے ہر قسم کی توقع رکھی جاتی تھی ہونی کی بھی اور انہونی کی بھی۔ خدا کے راز اور رموز وہی جانتا ہے آدمی کے بس کی بات نہیں۔ وہ کچھن کو لکشمی دے دیتا ہے، کل ہین کو علم دے دیتا ہے، مورکھ کو خوبصورت بیوی دے دیتا ہے، پہاڑ پر بارش کر دیتا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے یا کیا نہیں کرتا۔ ان عجوبوں کو سوچ کر چور بھی

ہنس پڑتا ہے۔ اس معاشرے اور اس کے افراد کا یہ یقین تھا اور اس یقین پر ایمان تھا۔

جب راجہ بیتال کو درخت سے اتار اور باندھ لے چلا تو بیتال نے یہ اور کہانی کہی۔

سماوتی نگر کا راجہ سوبجار تھا اور اس کی بیٹی کا نام چندر پربھا۔ جب شادی کے قابل ہوئی تو ایک دن سکھیوں کے سنگ بسنت کے موسم میں باغ کی سیر کو گئی۔ وہاں پردے کا انتظام ہونے سے پہلے ایک برہمن کا بہت خوبصورت لڑکا جس کی عمر بیس برس تھی اور جس کا نام منسری تھا کہیں سے پھرتا پھراتا اس باغ میں ایک درخت کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں میں سو رہا تھا۔ راجہ کے آدمیوں نے آ کر اس باغ میں پردے کا انتظام کیا لیکن اس برہمن کے لڑکے کو کسی نے نہ دیکھا اور راجکماری سکھیوں کے ساتھ باغ میں داخل ہوئی۔ گھومتے پھرتے وہاں آ پہنچی جہاں لڑکا سوتا تھا۔ اس کا وہاں پہنچنا تھا کہ وہ برہمن کا لڑکا پاؤں کی آہٹوں سے اٹھ بیٹھا۔ راجکماری سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ادھر برہمن کا لڑکا غش کھا کر گر پڑا، اور ادھر راجکماری کے پاؤں کانپنے لگے۔ لیکن سکھیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ تھام لیا اور آخر چنڈول میں لٹا گھر لے آئیں۔ برہمن کا لڑکا وہیں بے ہوش پڑا رہا کہ دو برہمن تعلیم حاصل کر کے کاپردیس سے آئے ہوئے وہاں آ نکلے۔ ایک برہمن نے جس کا مول دیو تھا اس نے برہمن کو بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اور دوسرے برہمن ششش سے پوچھا یہ ایسے کیوں پڑا ہوا ہے۔ اس نے کہا نائکہ نے ابروؤں کی کمان سے نظر کے تیر مارے ہیں۔ مول دیو نے کہا اسے اٹھانا چاہیئے۔ ششش بولا تمھیں کیا ضرورت۔ لیکن اس نے کہنا نہ مانا اور اس کے منھ پر پانی چھڑکا اور ہوش میں لا کر معلوم کیا یہ تیری کیا حالت ہوئی۔ اس برہمن نے کہا دکھ اس سے کہنا چاہیئے جو دکھ دُور کرے اور کسی سے کہنے سے کیا حاصل۔ اس نے کہا اپنا دکھ کہہ ہم دور کریں گے۔ برہمن نے کل کیفیت بیان کر دی اور کہا اگر وہ مجھے نہ ملے گی تو میں جان دے دوں گا۔ مول دیو بولا ہمارے یہاں چل اس کے ملنے کا جتن کریں گے ورنہ تجھے بہت سا دھن دیں گے۔ برہمن بولا دنیا میں بھگوان نے بہت سی نعمتیں پیدا کی ہیں لیکن عورت سب سے اچھی نعمت ہے۔ اس کے لیے آدمی دولت کی آرزو نہیں رکھتا۔ جب عورت نہ چاہوں گا تو دھن لے کر کیا کروں گا۔ جن کو خوبصورتی

نہ حاصل ہوان سے دنیا میں حیوان اچھے ہیں۔ دھرم کا پھل دھن ہے اور دھن کا سکھ ہے اور سکھ کا پھل ہے عورت اور جہاں عورت نہیں سکھ وہاں کہاں۔ مول دیو نے کہا جو تو مانگے گا دوں گا۔ برہمن نے کہا مجھے وہی راجکماری دلا دے۔ مول دیو نے کہا 'اچھا وہی دلا دیا ہمارے ساتھ تو چل ــــ اور اسے بہت تسلی دے کر اپنے گھر لے گئے۔ وہاں جا کر دو گٹکے بنائے۔ ایک اس برہمن کو دیا اور کہا جب تو اس کو منھ میں رکھے گا تو بارہ برس کی لڑکی ہو جائے گا اور جس وقت منھ سے نکالے گا تو پہلے کی طرح کا مرد بن جائے گا۔

اسے اپنے منھ میں رکھ اور دوسرے گٹکے کو منھ میں رکھ کر وہ خود اسی برس کا ٹھوکر بن گیا۔ اور پھر اسے لیے ہوئے راجہ کے پاس گیا۔ راجہ نے ڈنڈوت کی آسن بیٹھنے کو دیا 'اور دوسرا آسن لڑکی کو دیا۔ برہمن نے ایک شلوک پڑھ کر دعا دی۔ راجہ نے پوچھا مہاراج آپ کہاں سے آئے ہیں۔ مول دیو نے کہا گنگا پار سے۔ میں اپنے بیٹے کی بہو کو لینے گیا تھا۔ میرے گاؤں میں پیچھے بھگدڑ پڑی۔ سو میں نہیں جانتا برہمن اور میرا لڑکا کہاں بھاگ گئے.... اور اب میں اس کو لیے ہوئے ہوں۔ انھیں کسی طرح ڈھونڈوں بہتر ہے کہ اسے آپ کے پاس چھوڑ جاؤں۔ جب تک میں نہ آؤں اسے اچھے جتن سے رکھنا۔ یہ سن کر راجہ اپنے دل میں سوچنے لگا کہ ایسی خوبصورت عورت کو میں کیسے رکھوں گا۔ اگر نہیں رکھتا تو برہمن بددعا دے گا۔ پھر برہمن سے کہا آپ نے جو حکم دیا قبول ہے۔ اور اپنی بیٹی کو بلا کر کہا اس برہمن کی بہو کو اپنے پاس لے جا کر بہت خیال سے رکھنا اور کسی وقت اپنے پاس سے الگ مت ہونے دینا۔ راجکماری اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے محل میں لے گئی۔ رات کو دونوں ایک سیج پر سوئیں اور آپس میں باتیں کرنے لگیں اور برہمن کی بہو نے پوچھا اے راجکماری تو کس دکھ کی ماری ہے کہ دبلی ہو رہی ہے۔ مجھ سے کہہ۔ راجکماری نے اپنا دکھ بیان کر دیا اور کہا اس دکھ سے میرے جسم کی یہ حالت ہوئی ہے۔ برہمن کی بہو بولی اگر تجھے تیرے پیارے سے ملا دوں تو کیا دے گی۔ راجکماری نے کہا ہمیشہ تیری خادمہ رہوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے منھ سے گٹکا نکالا اور اپنی اصل شکل میں آ گیا۔ راجکماری اسے دیکھ کر اس سے شرمائی اور برہمن کے لڑکے نے اس سے گندھرپ بیاہ کیا اور ہمیشہ اس طرح رات کو مرد ہوتا اور دن کو عورت۔

چھ مہینے کے بعد راجکماری کو حمل ٹھہر گیا۔ ایک دن راجہ سارے کنبے کے ساتھ دیوان کے گھر شادی میں گیا۔ وہاں دیوان کا بیٹا عورت بنی برہمن کے لڑکے کو دیکھتے ہی عاشق ہو گیا اور ایک دوست سے کہنے لگا اگر یہ عورت مجھے نہ ملے گی تو میں جان دے دوں گا۔ اس اثناء میں راجہ دعوت کے بعد کنبے سمیت اپنے محل میں گیا اور دیوان کے بیٹے کی عشق میں حالت خراب ہو گئی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس حالت کو اس کے دوست نے دیوان سے کہا اور دیوان نے کیفیت راجہ سے جا کر کہی۔ راجہ یہ سن کر غصے میں آیا اور بولا اے بیوقوف یہ بے اصولی کرنا راجاؤں کا دھرم نہیں۔ ایک شخص کی امانت اس کی اجازت کے بغیر دینا مناسب نہیں۔ دیوان مایوس ہو کر اپنے گھر آیا۔ لڑکے کے دکھ سے اس نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا۔ تین دن کے بعد سب درباریوں نے اکٹھے ہو کر راجہ سے عرض کی کہ دیوان اور اس کا لڑکا نہیں بچنے کی حالت میں ہیں۔ دیوان کے مرنے سے راج کاج نہیں چلے گا۔ اس لیے بوڑھے برہمن کی بہو دیوان کے بیٹے کو دے دیجیے۔ اسے گئے ہوئے تو بہت دن ہو گئے۔ بھگوان جانے زندہ ہے یا مر گیا۔ اگر وہ آ بھی گیا تو گاؤں اور دھن دے کر اسے راضی کر دیں گے۔

راجہ نے برہمن کی بہو کو بلا کر کہا دیوان کے گھر جا' اس نے کہا "استری دھرم نشٹ ہوتا ہے۔ غیر خاوند کے پاس جانے سے اور برہمن کا دھرم جاتا ہے راجہ کی سیوا کرنے سے اور گائے خراب ہوتی ہے دور کی چرائی سے۔ اور دھن جاتا ہے ادھرم کرنے سے اور بولی کہ آپ مجھے دیوان کے بیٹے کو دیتے ہیں۔ تو اس سے یہ بات ٹھہرا دیں کہ جو کچھ اس سے میں کہوں وہی کچھ وہ کرے۔ راجہ نے معلوم کیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے کہا میں برہمن اور چھتری وہ سب سے پہلے یاترا کر آوے پھر اس برہمن کو تجھے دیں گے۔ دیوان کے بیٹے نے کہا۔ وہ میرے گھر جا بیٹھے تو میں تیرتھ یاترا کو جاؤں گا۔ راجہ نے برہمن سے یہ کہا۔ مجبور ہو کر راجہ کے کہنے سے وہ اس کے گھر جا رہی۔ دیوان کے لڑکے نے اپنی بیوی سے کہا تم دونوں پیار محبت سے ایک جگہ رہنا اور آپس میں لڑنا جھگڑنا نہ۔ اور پرائے گھر بھی نہ جانا۔ یہ کہہ کر وہ تیرتھ یاترا کو گیا۔ ادھر دیوان کے بیٹے کی بہو سوبھاگ سندری برہمن کی بہو کو اپنے بچھونے پر لے کر رات کو

لیٹی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد دیوان کے لڑکے کی بہو نے کہا۔ اے سکھی اس وقت میں عشق میں جلی جاتی ہوں میرا مطلب کیسے حاصل ہو۔ برہمن کی بہو بولی۔ اگر تیرے مطلب کو میں بر لاؤں تو تو مجھے کیا دے گی۔ اس نے کہا ہمیشہ تیری فرمانبردار رہوں گی۔ اس نے منہ سے گٹکا نکالا مردین ہمیشہ اس طرح رہنے لگا۔ چھ مہینے گذرے اور دیوان کا لڑکا آپہنچا۔ لوگ اس کے آنے کی خوشیاں منانے لگے۔ اور ادھر برہمن کی بہو نے منہ سے گٹکا نکال مردین کھڑکی کی راہ سے نکل اپنی راہ لی۔ اور مول دیو برہمن کے پاس پہنچا۔ اس سے سارا حال کہا اور اس نے گٹکا اس سے لے ششش کو دیا اور دونوں منہ میں گٹکے رکھ کر ایک بوڑھا اور بیس برس کا بن گیا۔ پھر دونوں راجہ کے پاس گئے۔ راجہ نے ڈنڈوت کی اور بیٹھنے کو آسن دیا۔ انھوں نے دعائیں دیں۔ راجہ نے خیریت معلوم کرکے پوچھا اتنے دن تمھیں کہاں لگے۔ برہمن نے کہا اس بیٹے کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ اب اسے ڈھونڈھ کر لایا ہوں۔ اس کی بہو دے دیں تو میں دونوں کو لے کر اپنے گھر جاؤں۔ راجہ نے برہمن سے کل حال کہا۔ برہمن سنتے ہی بے حد غصے میں آیا اور راجہ سے کہا۔ یہ کیا بیوپار ہے جو تم نے چاہا سو کیا۔ اب میری بد دعا لو۔ راجہ بولا اے دیو غصہ مت کرو۔ جو تم کہو سو کروں۔ برہمن بولا اپنی لڑکی میرے لڑکے سے بیاہ دے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے جیوتش کو بلا نیک ساعت ٹھہرائی اور اپنی لڑکی اس برہمن سے بیاہ دی۔ راجکماری کو جہیز سمیت اپنے گاؤں لایا۔ اب منوی برہمن اس سے جھگڑنے لگا کہ میری بیوی مجھے دے۔ ششش بولا میں دس پنچوں میں بیاہ کر لایا ہوں یہ میری بیوی ہے اس نے کہا اسے تو میرا حمل ہے یہ تیری کس طرح سے ہوئی۔ دونوں جھگڑنے لگے۔ مول دیو نے ان دونوں کو بہت سمجھایا لیکن کوئی نہ مانا۔

یہ کہہ کر بیتال بکرماجیت سے بولا وہ عورت کس کی ہوئی۔ راجہ نے کہا وہ عورت ششش برہمن کی ہوئی کیونکہ اس برہمن کا پیٹ رکھوایا تو کسی نے معلوم نہ کیا اور وہ دس پنچوں میں بیٹھ کر بیاہ لایا۔ اور جو لڑکا ہوگا وہ ششش کے ہی کرتا کرم کا ادھاری ہوگا۔

اس بات پر بیتال اس درخت سے جا لٹک گیا۔

اس معاشرے میں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ مول دیو جیسے جو کسی کے درد اور کسی کی تکلیف کو دور کرنے کو اپنا فرض جانتے تھے اور ششش جیسے جو کہتے کہ تمھیں کیا ضرورت ہے کہ کسی کی پریشانی اپنے سر لو۔

کسی معاشرے میں محبت کے مقابلے میں دولت کوئی اہمیت نہیں جانی جاتی رہی۔ محبت والے لوگ محبوبہ کے برابر کسی نعمت کو نہیں جانتے رہے۔ اور اس کے بغیر اپنے آپ کو حیوان جانتے رہے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کی زندگی حیوانوں کی زندگی کہی جاتی رہی ہے جنھیں کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ برہمن راجہ کو اس کے ڈنڈوت کے بعد ایسی ہی دعائیں دیتے رہے ہیں۔

"جس کی شوبھا تینوں لوک میں پھیل رہی ہے اور جس نے بامن ہو راجہ بل کو چھلا اور جس نے بندر ساتھ لے سمندر کا پل باندھا اور جن نے پربت ہاتھ پر رکھ اندر کے برسے گوال بال بچائے۔ سو ہی باسدیو تمھاری رکشا کرے۔"

برہمن کے شراپ سے کیا بڑا کیا راجہ سب ڈرتے تھے اور یہ نوبت ہی نہیں آنے دیتے تھے۔ کیونکہ اس سے سارا راج رنگ بھنگ ہو جانے کا یقین ہوتا تھا۔ یہی خوف تھا کہ راجہ نے اپنی بیٹی کی شادی ششش برہمن سے کر دی اور بہت سامال اور جہیز دے کر رخصت کیا۔

امانت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور اسے فرضوں میں سب سے اعلیٰ فرض خیال کیا جاتا تھا۔ اس کی سزا راجہ کو طوہاً و کرہاً بھگتنی پڑی کیونکہ اس نے راج کاج کے چلنے کا خیال کیا اور اپنا راج قائم رکھنے کی آرزو کی۔

اس معاشرے کی بنیاد میں استری دھرم بھی ایک بنیاد تھی کہ استری دھرم بہشت ہوتا ہے غیر خاوند کے پاس جانے سے اور برہمن کا دھرم جاتا ہے راجہ کی سیوا کرنے سے۔ اور گائے خراب ہوتی ہے دور کی چرائی سے اور برہمن جاتا ہے ادھرم کرنے سے ـــــ برہمن کی بہو راجہ سے انکار تو کر نہیں سکتی تھی لیکن دیوان کے بیٹے کے گھر اس شرط پر جانے کو تیار ہو جاتی ہے کہ وہ پہلے تیرتھ یاترا کرے کیونکہ وہ کھتری اور میں برہمن ہوں۔ لیکن راجہ کے کہنے سے دیوان کے بیٹے کے گھر میں جا کر رہنے لگتی ہے اور دیوان کے بیٹے کی بیوی تھی اور عشق میں جلتی تھی وہ اس لیے مسائل کو حل کرتی ہے منہ سے گٹکا نکال کر اور مرد کے روپ میں آکر ـــــ

اور چھ مہینے کے بعد جب دیوان کا بیٹا تیرتھ یاترا سے آجاتا ہے تو برہمن مردبن کر نکل جاتا ہے۔ اور مول دیو کے پاس پہنچ کر کل حال کہتا ہے۔

اب مول دیو ششی کو بیس سال کا نوجوان بنا کر راجہ کے پاس لے جاتا ہے اور اپنی بہو کا تقاضا کرتا ہے۔ راجہ بہت عرض معروض کرتا ہے اور پھر برہمن کے شراپ سے ڈر کر اپنی بیٹی کی شادی ششی سے کر دیتا ہے۔ بیتال کے پوچھنے پر راجہ بکرم کہتا ہے کہ وہ استری ششی کی ہوئی کیونکہ برہمن کا بیٹا رکھوایا۔ تو کسی نے معلوم نہ کیا وہ دس بچوں میں بیاہ لایا۔ اس گربھ سے جو لڑکا ہوگا وہ ششی کے کرتا کرم کا ادھاری ہوگا یعنی جو وہ بات قابل تسلیم ہوتی تھی جس کا معاشرہ شاہد ہوتا تھا اور معاشرے میں پوشیدہ حقیقت کو اہمیت حاصل نہ تھی۔ وہ حقیقت جانی اور مانی جاتی تھی جو سب کی آنکھوں کے سامنے عمل میں آئی ہو۔ اس کے علاوہ ہندوؤں میں جو بیاہ کے مختلف طریقے رائج ہیں ان میں سے بہت معروف طبقہ تو وہ ہے جس میں آگ کے چاروں طرف پھیرے کیے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے گلے میں جے مالا ڈالی جاتی ہے یہ گویا ایک طرح کی ارینج میرج ARRANGE MARRIAGE ہوتی ہے۔

ایک دوسرا طریقہ وہ بھی ہے جس کو سوئمبر کہا جاتا ہے جس میں بہت سے امیدوار ایک ساتھ پیش ہوتے ہیں اور لڑکی ان سب کو دیکھ کر جس کے گلے میں مالا پہنا دیتی ہے اور اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ یہ شادی بھی گویا سماج کے سامنے ہوتی ہے لیکن ایک طریقہ یہ بھی رائج رہا ہے کہ جنگل میں سفر میں یا کسی تنہائی میں لڑکا یا لڑکی یا مرد اور عورت ایک دوسرے سے شادی کا اقرار کرتے ہیں اس کے لیے ادھر سے یا ادھر سے کسی اور کی منظوری قرار نہیں دی جاتی۔ شکنتلا ناٹک میں جو شادی ہوتی ہے وہ اس قاعدے سے جس میں شکنتلا اور راجہ دشرتھ کے ایک دوسرے سے اپنی اپنی خواہش اور مرضی کے ساتھ میاں بیوی کا رشتہ قائم کر لیا تھا۔ (اس کو گندھرپ بیاہ کہتے ہیں)

اس کہانی میں دیوان کے بیٹے کی بہو جس طرح پہلی ہی رات میں جذبات سے بے قابو ہو جاتی ہے اور فوراً ہی اس برہمن زادے سے ہم اس کو بہت زیادہ قریب دیکھتے ہیں جو اس کے پاس منھ میں گٹکا لیے ایک نئی نویلی دلہن کی شکل میں پہنچا ہے اس سے اور خود شہزادی کے

بہت جلدی سیج پر اپنے محبوب کو پاکر اس سے جنسی تعلقات قائم کرنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت عورتوں کے متعلق یہ خیال کتنا زور پکڑ گیا تھا کہ وہ اپنی جنسی خواہش سے کس قدر مغلوب نظر آتی ہیں۔ یوں بھی ان کہانیوں میں عام طور پر جوان عورت سے ایک ہی رشتہ قائم ہوتا ہے اور وہ جنسی رشتہ ہے۔ اب کے بیتال نے یہ کہانی سنائی۔

ہماچل پہاڑ پر گندھرپ کا نگر ہے۔ راجہ جیموت کیت اس نگر میں راج کرتا تھا۔ کسی زمانے میں اس نے اولاد کے لیے کلپ برکش کی بہت پوجا کی تھی۔ کلپ برکش نے خوش ہو کر اسے پتر دیا کہ اس کا نام اور راج رہے۔ کئی دنوں بعد راجہ کے یہاں بیٹا ہوا اس نے بہت خوشی کی اور بہت سا دان پن برہمنوں کو دیا اور اس کا نام جیموت باہن رکھا گیا۔ بارہ برس کا ہونے پر شیو کی پوجا کرنے لگا۔ بہت شاستر پڑھ کر بڑا گیانی دھیانی ہوا۔ سخی، بہادر، دھرماتما اور عالم ہوا۔ اس زمانے میں اس کے برابر کوئی نہ تھا۔ لوگ اس کے راج میں اپنے دھرم میں پورے ہوشیار تھے۔ جب وہ جوان ہوا تو کلپ برکش کی بہت سیوا کی۔ کلپ برکش نے خوش ہو کر اس سے جو چاہیے مانگنے کے لیے کہا۔ اس نے کہا صرف رعایا کی محتاجی دور کر دو۔ اور میرے راج کے سب لوگ مال دولت میں برابر ہو جائیں۔

سب لوگ دھن سے ایسے آسودہ ہوئے کہ کوئی کسی کا حکم نہ مانتا تھا اور کوئی کسی کا کام بھی نہ کرتا تھا۔ جب لوگ ایسے ہو گئے تو راجہ کے بھائی بند آپس میں سوچنے لگے کہ باپ بیٹے دونوں دھرم کے بس میں ہوئے اور لوگ ان کا حکم نہیں مانتے۔ بہتر ہے کہ ان دونوں کو قید کر دیا جائے اور ان سے راج پاٹ چھین لیا جائے۔ منصوبہ بنا کر انھوں نے فوج لے راج کا محل گھیر لیا۔ راجہ نے خبر ہونے پر بیٹے سے کہا اب کیا کریں۔ راجکمار نے کہا آپ یہیں رہیے آپ کے پرتاپ سے ابھی جا کے دشمنوں کو مارے لیتا ہوں۔ راجہ نے کہا زندگی بھی فانی ہے اور دولت بھی آنی جانی ہے۔ آدمی کے ساتھ جینا مرنا ہے اس لیے راج چھوڑ کر دھرم کا کام کرنا چاہیے۔ ایسے جسم کے لیے اور اس راج کے لیے مہاپاپ کرنا مناسب نہیں۔ راجہ یدھشٹر بھی مہابھارت کے بعد پچھتائے تھے۔ راج کمار نے کہا راج بھائی بندوؤں کو دیجیے اور چل کر تپسیا کیجیے۔ یہ صلاح ٹھہرنے پر بھائی بھتیجوں کو بلا راج دے دونوں ملیاچل پہاڑ کے

اوپر گئے اور وہاں کٹیا بنا رہنے لگے۔ جھموت باہن اور رشی کے بیٹے میں دوستی ہوگئی۔ ایک دن اس پہاڑ کے اوپر راجہ کا بیٹا اور تپسوی کا بیٹا سیر کو گیا وہاں ایک دیوی کا مندر دکھائی دیا۔ اس مندر میں ایک راجکماری بین باجا لیے ہوئے دیوی کے سامنے گا رہی تھی۔ راجکماری اور جھموت باہن کی نظریں چار ہوئیں۔ دونوں کو لگن لگی۔ راجکماری شرم کے مارے دل مار اپنے گھر چلی گئی۔ اور یہ بھی رشی کے بیٹے کی شرم کے سبب اپنے یہاں آگیا۔ دونوں کو رات بھر بے کلی رہی۔ صبح ہوتے ہی دونوں مندر پہنچ گئے۔ اس نے راجکماری کی سکھی سے معلوم کیا کہ یہ کہاں کی راج کنیا ہے۔ اس نے کہا یہ ملیکیت راجہ کی بیٹی ہے ملیاوتی نام ہے اور ابھی کنواری ہے۔ یہ کہنے کے بعد راجکماری کی سکھی نے جھموت سے پوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ جھموت نے کل کیفیت کہہ دی۔ سکھی نے سب باتیں راجکماری سے کہیں۔ وہ یہ سن اپنے دل میں بہت دکھ پا کر گھر کو آئی اور رات سوچتے سوچتے سو رہی۔ یہ حالت دیکھ کر سکھی نے اس کی ماں سے کہا اور اس نے راجہ سے بیان کیا۔ اور کہا بیٹی کا بر کیوں نہیں ڈھونڈتے راجہ نے اپنے بیٹے تراسو سے کہا اپنی بہن کا بر ڈھونڈ ھ لا۔ اس نے کہا گندھرپوں کا راجہ جسونت گیت کا بیٹا جھموت باہن ہے سنا ہے کہ وہ دونوں یہاں آئے ہیں۔ اس پر ملیکیت راجہ نے کہا بیٹی جھموت باہن کو دوں گا۔ اور بیٹے سے کہا اسے جا کر بلا لا۔ وہ گیا اور اس کے باپ سے کہا اپنے بیٹے کو ساتھ بھیج دیں کہ ہمارے باپ نے کنیا دان کو بلایا ہے۔ راجہ نے بیٹے کو اس کے ساتھ کر دیا۔ اور راجہ ملیکیت نے اس کا گندھرپ بیاہ کر دیا۔ جب اس کی شادی ہو چکی تب دلہن کو اور بیٹی کو اپنے یہاں لے گیا۔ ان تینوں نے راجہ کو ڈنڈوت کی اور راجہ نے دعا دی۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی دونوں راجکمار ملیاگت پربت پر پھرنے کو گئے۔ وہاں جھموت باہن دیکھتا ہے کہ ایک سفید ڈھیر اونچا سا ہے۔ اس نے اپنے سالے سے معلوم کیا کہ ڈھیر کیا نظر آتا ہے۔ وہ بولا پاتال لوک سے کروڑوں ناگ کمار یہاں آتے ہیں انہیں گرڑ آن کر کھاتا ہے۔ یہ انہیں کی ہڈیوں کا ڈھیر ہے۔ یہ سن کر جھموت باہن نے کہا تم گھر جا کر بھوجن کرو اور میں اس وقت اپنی پوجا کرتا ہوں کیونکہ میری پوجا کا وقت ہوا ہے۔ وہ تو گیا۔ جھموت آگے بڑھا تو رونے کی آواز آئی۔ اس آواز پر وہ آگے گیا۔ دیکھتا ہے کہ ایک بڑھیا اپنے دکھ سے

بے چین ہو کر روتی ہے۔ اس نے جا کر پوچھا ماتا تو کیوں روتی ہے اس نے کہا کہ شنکھ چوڑ نام کا ناگ جو میرا بیٹا ہے آج اس کی باری ہے۔ جھموت نے کہا ماتا مت رو۔ تیرے بدلے میں اپنی جان دوں گا۔ بڑھیا بولی ایسا مت کرنا تو ہی میرا شنکھ چوڑ ہے۔ اس اثنا میں شنکھ چوڑ آ پہنچا اور بولا مجھ سے تو بہت سے پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں لیکن آپ سے دھرماتما اور دیا کرنے والے دنیا میں گھڑی گھڑی پیدا نہیں ہوتے۔ جھموت بولا یہ سچے اور نیک لوگوں کا دھرم نہیں ہے کہ منھ سے کہہ کر نہ کریں تو جہاں سے آیا ہے وہاں چلا جا۔ شنکھ چوڑ تو مندر میں دیوی کے درشنوں کو چلا گیا اور گرڑ آسمان سے اترا۔ راجکمار نے دیکھا کہ پاؤں اس کے چار بانس برابر ہیں تاڑ سی لمبی چونچ ہے۔ پہاڑ کی مانند پیٹ۔ پھاٹک جیسی آنکھیں، گھٹا جیسے بال۔ چونچ کھول کر راجکمار پر جھپٹا لیکن اس نے اپنے آپ کو بچایا۔ دوسری بار وہ چونچ میں رکھ اس کو لے اڑا اور چکر لگانے لگا۔ اتنے میں بازوبند کہ اس کے نگ پر راجہ کا نام کھدا ہوا تھا وہ کھل کر لہو بھرا راجکماری کے سامنے گرا۔ وہ اسے دیکھ کر غش کھا کر گر پڑی۔ ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو اس نے سب احوال اپنے ماں باپ سے کہلا بھیجا۔ وہ یہ مصیبت سن کر آئے اور بازوبند دیکھ کر رو پڑے۔ پھر تینوں ڈھونڈنے نکلے کہ راہ میں شنکھ چوڑ بھی ملا۔ اور اس سے آگے جا کر جہاں راجکماری کو دیکھا تھا۔ پکار پکار کر کہنے لگا اے گرڑ چھوڑ دے یہ تیری خوراک نہیں ہے۔ شنکھ چوڑ میرا نام ہے۔ گرڑ یہ سن کر گھبرا کر گرا اس نے اپنے دل میں سوچا میں نے برہمن یا چھتری کھایا یہ کیا کیا۔ پھر راجکمار سے پوچھا سچ کہہ تو اپنی جان کیوں دیتا ہے۔ راجکمار نے کہا درخت سایہ دیتے ہیں اور خود دھوپ میں رہتے ہیں۔ دوسروں کے واسطے پھلتے پھولتے ہیں۔ بھلے لوگوں اور درختوں کا یہی دھرم ہے۔ مثل ہے کہ جیسے جیسے چندن کو گھستے ہیں ویسے ویسے اس کی خوشبو بڑھتی جاتی ہے اور جیسے جیسے ایکھ کو کاٹ کر ٹکڑے کرتے ہیں ویسے ویسے گنا زیادہ سے زیادہ مزہ دیتا ہے۔ جیسے جیسے سونے کو جلاتے ہیں ویسے ویسے وہ چمکدار ہوتا جاتا ہے۔ بھلے لوگ جان جانے سے بھی نیک عادت نہیں چھوڑتے۔ جو لوگ انصاف کے راستے پر چلتے ہیں کچھ ہو دوسرے راستے پر قدم نہیں رکھتے۔ اگر کسی کے جسم سے کسی کا بھلا ہوا

اس کی زندگی بیکار ہے۔ اور دوسروں کے لیے جن کی جان وقف ہے انھیں کا زندہ رہنا کامیاب ہے۔ جو برہمن دوسروں کے واسطے زندہ رہتے ہیں وہ ہمیشہ جنت میں رہتے ہیں گرڑ بولا دنیا میں سب اپنی جان کی حفاظت کرتے ہیں اپنے جن سے دوسرے جن کو پہچانتے والے دنیا میں برہی ہوتے ہیں۔ بر مانگ میں تیرے حوصلے سے خوش ہوا۔ وہ بولا اب ناگوں کو مت کھاؤ اور جو کھائے ہیں انھیں زندہ کردو۔

گرڑ نے پاتال سے امرت لاکر سانپوں کی ہڈیوں پر چھڑکا اور وہ سب جی اٹھے اور جمیوت سے کہا کہ میرے پرساد سے تیرا کھویا ہوا راج پھر تجھے ملے گا۔ یہ بر دے کر گرڑ اپنے یہاں اڑ گیا۔ اور شنکھ چھوڑا اپنے یہاں گیا۔ جمیوت کو راستے میں اس کی ساس، بیوی اور اس کے خسر ملے اور ان سب کے ساتھ اپنے باپ کے پاس آیا۔

یہ حال سن کر اس کے کنبے کے لوگ آئے اور ان کے پاؤں پڑے اور لے جا کر انھیں راج دے دیا۔ یہ کہہ کر بیتال نے پوچھا ان میں سے کس کا ست زیادہ ہوا۔ راجہ بولا شنکھ چوڑ کا ــــ کیونکہ وہ پھر جان دینے کو آیا اور گرڑ کے کھانے سے بچایا۔ جمیوت باہمن چھتری ہے اس جان دینے کی مشق ہو رہی ہے۔ اس لیے اسے جان دینی کچھ مشکل معلوم نہ ہوئی۔

راجہ کے اتنا کہنے پر بیتال اس درخت سے جا لٹکا۔

دیوی دیوتاؤں کی پوجا کا عام رواج تھا۔ پرجا سے راجہ تک سب کے سب پوجا کیا کرتے تھے اور کبھی ان کی پوجا کا پھل انھیں اولاد کی صورت میں ملتا تھا اور کبھی من چاہے ارمان کی صورت میں اور کبھی انھیں بر مانگنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ کلپ برکش کی پوجا کا ذکر پہلی بار اس کہانی میں آیا ہے۔ جس کا پھل راجہ کو اس کی اولاد کی صورت میں ملا۔ جس سے اس کا راج اور نام رہنے کی آرزو پوری ہوئی۔ بیٹے نے بھی کلپ برکش کی پوجا کی، اس پر اسے بر مانگنے کے لیے کہا گیا تو اس نے اپنی رعایا سے محتاجی دور ہونے اور سب کے مال و دولت میں برابر ہو جانے کا بر مانگا مگر اس کا نتیجہ عام انتشار اور بحران ہوا۔ کوئی کسی کا کام نہ کرتا تھا۔ راجہ کے بھائی بند اس پر

باپ بیٹے کو قید کر کے راج چھین لینا چاہتے تھے۔ بیٹے نے مقابلے کا ارادہ کیا۔ باپ نے منع کر دیا کہ زندگی فانی ہے دھن دولت غیر مستقل ہے۔ آدمی کا پیدا ہونا اور مرنا اس کے ساتھ ہے اس سے راج کو چھوڑ کر دھرم کا کام کرنا چاہیئے۔ اس زندگی اور اس راج کے لیے کوئی گناہ کرنا مناسب نہیں۔

پربت پر راجہ کے بیٹے کی ایک رشی سے بیٹے سے دوستی ہو گئی اور ایک دن پہاڑ پر دیوی کے مندر میں ایک راجکماری کو دیکھ کر راجہ کا بیٹا اور راجکماری دونوں ایک دوسرے پر شیدا ہو گئے۔ راجکماری کی حالت اس کی سکھی نے رانی سے کہی اور رانی نے راجہ سے بر دیکھنے کو کہا۔ راجہ نے بیٹے کو حکم دیا۔ بیٹے نے راجہ کے بیٹے کا نام لیا اور اسے جا کر لے آیا۔ دونوں کا گندھرپ بیاہ ہو گیا۔

دھرم کرنے والوں کو دھرم کرتے رہنے کے سوا کسی سے دلچسپی نہیں ہوتی اس لیے راجہ کا بیٹا گرڑ سے شنکھ چوڑ سانپ کو بچانے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی بوڑھی ماں کو روتے سن کر اسے معلوم ہوا تھا کہ آج اس کے بیٹے شنکھ چوڑ کی باری ہے۔

گرڑ راجہ کے بیٹے جمیوت باہن کی ہمت اور قربانی سے خوش ہوا کیونکہ اس نے کہا نیک لوگوں اور درختوں کا یہی دھرم ہے کہ یہ زندگی غیر کے کام آوے جیسے چندن گھستے رہنے سے خوشبو زیادہ اور زیادہ دینے لگتا ہے اور گنا چھیلنے اور ٹکڑے کرنے سے زیادہ مزہ دیتا ہے اور سونا جلاتے رہنے سے زیادہ چمکدار ہوتا ہے۔ بھلے لوگ جان چلی جانے کی وجہ سے اپنی نیک عادت نہیں چھوڑتے۔ انصاف کے راستے پر چلنے والے اس راستے سے قدم نہیں ہٹاتے چاہے ان پر کچھ بھی گذر جائے۔ یہ اس معاشرے میں نیک لوگوں کی زندگی کے اصول تھے اور بیشتر لوگ انہیں اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ یہی جنت میں جا بسنے کا واحد ذریعہ جانتے تھے۔ گرڑ نے اسے بر دیا اور آئندہ ناگ کھانے چھوڑ دیئے اور جو کھائے تھے انھیں زندہ کر دیا اور ان کا راج پاٹ انھیں واپس مل گیا۔

بیتال راجہ بکرم کے بتانے پر کہ شنکھ چوڑ کا ست زیادہ ہے، جا کر اس درخت سے

لٹک گیا۔ راجہ کا کہنا تھا کہ چھتری کو جان دینے کا کام آسان ہوتا ہے اور شنکھ چوڑ پھر جی دینے کو آ گیا اور اس نے جیموت باہن کو گرڑ کے کھانے سے بچایا۔

راجہ بکرم بیتال کو سولھویں بار درخت سے اتار کاندھے پر رکھے چلا ـــــــ تو بیتال نے یہ کہانی سُنائی۔

چندر شیکھر نگر میں رتن دت ایک سیٹھ تھا۔ اس کی بیٹی کا نام دھرماوتی تھا۔ اس کے جوان ہونے پر اس نے راجہ سے کہا میری کنیا ہے اگر آپ کو اس کی چاہ ہو تو لیجیے نہیں تو میں کسی اور کو دوں۔ راجہ نے تو تین پرانے نوکروں سے کہا کہ اس سیٹھ کی بیٹی کے لکشن جاکر دیکھ آؤ۔ وہ راجہ کے حکم پر سیٹھ کے گھر گئے۔ سب کو اس لڑکی کا روپ پسند خاطر ہوا۔ ہر اعتبار سے حُسن کا معیار تھی۔ اندر کی اپسرا بھی دیکھ کر شرمندہ ہو جائے۔ ان سب نے خیال کیا اگر ایسی عورت راجہ کے گھر میں جائے گی تو راجہ اس کے ماتحت ہو جائے گا اور راج کاج چھوڑ اس کا ہو رہے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ راجہ سے کہا جائے کہ اس کے لکشن اچھے نہیں ہیں اور آپ کے قابل نہیں ہے۔ راجہ نے سیٹھ سے اس کی بیٹی لینے سے انکار کر دیا۔ پھر سیٹھ راجہ کے سیناپتی کے پاس گیا اور اس سے اس کا بیاہ کر دیا۔

ایک دن کا ذکر ہے راجہ کی سواری اس راہ سے نکلی وہ اس وقت سنگار کیے اپنے کوٹھے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس کی اور راجہ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ راجہ اس کا روپ دیکھ کر موہت ہو گیا اور وہاں سے نہایت بیقرار ہو کر اپنے محل میں گیا۔ دربان نے دیکھ کر کہا مہاراج کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے۔ راجہ نے کہا میں نے آتے ہوئے ایک کوٹھے پر ایک خوبصورت عورت دیکھی ہے اس کے روپ نے میرا من موہ لیا ہے۔ دربان نے کہا مہاراج اس سیٹھ کی بیٹی ہے جو آپ کے سیناپتی سے بیاہی گئی ہے۔ راجہ نے کہا میں نے جن لوگوں کو لکشن دیکھنے کے لیے بھیجا تھا انھوں نے دغا کی۔ چوبدار سے ان سب کو بلوایا اور کہا تم نے میرے منشا پر عمل نہیں کیا۔ اس کے بجائے اپنی طرف سے بات بنا کہی۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا ہم نے یہی سوچا کہ ایسی خوبصورت لڑکی جو مہاراج کے پاس جائے گی تو مہاراج اس کے بس میں ہوں گے اور راج کاج سب چھوڑ دیں گے۔

راجہ نے کہا یہ تم لوگوں نے اچھا کیا۔

اس کے باوجود راجہ کو اس کی یاد میں بہت بے چینی تھی۔ سب لوگوں پر یہ بیقراری ظاہر بھی تھی کہ بھلبھدر سیناپتی بھی آ پہنچا اور بولا مہاراج میں داس وہ داسی آپ حکم کریں وہ حاضر ہے۔ اس کی خاطر آپ اتنی مصیبت کیوں اٹھاویں۔ راجہ یہ سن کر غصے سے بولا غیر عورت کے پاس جانا بڑا ادھرم ہے۔ یہ بات تو نے مجھ سے کیوں کہی۔ کیا میں ادھرمی ہوں۔ غیر عورت ماں کے برابر ہے، غیر کی دولت مٹی کے برابر۔ جیسا آدمی اپنا جی سمجھے ویسا ہی سب کا جی سمجھے۔ بلبھدر نے کہا وہ میری داسی ہے جب میں نے آپ کو دی تو غیر عورت کیسے ہوگی۔ راجہ نے کہا جس کام سے کلنک لگے میں وہ کام نہیں کروں گا۔ پھر سیناپتی نے کہا میں اسے گھر سے نکال اور جگہ رکھ بیسوا کر آپ کے پاس لاؤں گا۔ راجہ نے کہا اگر تو نے نیک عورت کو بیسوا کیا تو میں تجھے بڑی سزا دوں گا۔

راجہ اس کی یاد میں فکر مند رہ کر دس دن میں وفات پا گیا۔ بھلبھدر نے گرو سے جاکر پوچھا کہ میرا آقا اس بے چینی کے سبب مرا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا خادم کا دھرم ہے کہ آقا کے پیچھے اپنی جان بھی دے۔ یہ سن کر وہ وہاں پہنچا جہاں راجہ کو جلانے کے لیے گئے تھے اور چِتا تیار ہونے تک اس نے اشنان کیا اور پوجا پاٹھ سے فراغت پائی اور چِتا کو آگ لگنے پر ہاتھ جوڑ کر سورج دیوتا سے پرارتھنا کی کہ میں جنم جنم اس آقا کو پاؤں اور تیرا گُن گاؤں۔ اور ڈنڈوت کرنے کے بعد آگ میں کود پڑا۔ یہ خبر سن کر دھرماوتی اپنے گرو کے پاس گئی اور اس سے استری دھرم معلوم کیا۔ اس نے کہا کہ ماں باپ نے جس کے سپرد کیا اس کی خدمت سے وہ کلونتی کہلاتی ہے اور دھرم شاستر میں آیا ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کے جیتے تپ برت رکھتی ہے وہ اپنے سوامی کی عمر کم کرتی ہے اور آخر [illegible]خ میں پڑتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ شوہر کیسا ہی ہو اس کی سیو[illegible]رنے سے مکتی ہوتی ہے اور جو عورت شمشان میں ستی ہونے کی آرزو کر کے جتنے پاؤں زمین پر رکھتی ہے اتنے اشومیدھ یگ کرنے کا پھل ملتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ڈنڈوت کرنے کے بعد اپنے گھر آئی اور اشنان دھیان کر کے بہت سا دان کر کے چِتا کے پاس جا ایک بار طواف کیا اور بولی ناتھ میں تیری داسی جنم جنم

ہوں۔ اتنا کہہ وہ بھی آگ میں جا بیٹھی اور جل گئی۔

بیتال نے اتنی کہانی کہہ کر راجا سے پوچھا ان تینوں میں کس کا ست زیادہ ہوا۔ راجہ نے کہا اس راجہ کا کیونکہ اس نے سیناپتی کی دی ہوئی استری کو چھوڑا۔ اور اس کے واسطے جان دی لیکن دھرم رکھا۔ خادم کا آقا کے لیے جان دینا مناسب ہے اور شوہر کے لیے بیوی کا ستی ہونا لازمی ہے۔

بیتال یہ سنتے ہی پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

خوبصورتی کا اعلیٰ معیار یہ قرار دیا ہوا تھا کہ "جس کے روپ کو دیکھ اندر کی اپسرا بھی شرمندہ ہو جائے" ایسی خوبصورت عورت جس کے گھر میں ہو جا ہے وہ راجہ ہی کیوں نہ ہو اس کا بس میں ہونا یقینی خیال کیا جاتا تھا اور وہ اس کے سوا سب کچھ بھول سکتا تھا۔

راجہ کا اپنے آدمیوں کے راج کاج اور اپنی بھلائی کے خیال سے سچی بات کو جھوٹ کہنے پر اور اپنے قصور کو سچا کہہ دینے پر ناخوش نہ ہونا راجہ کی ایک بڑی خصوصیت مانی جاتی رہی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس معاشرے میں راجہ کو دھرم اور ادھرم کا بڑا خیال رہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے ایسا کرنے سے اس کی رعایا بھی دھرم اور ادھرم کا بڑا خیال رکھے گی۔ اس لیے وہ اپنی جان جانے کا بھی خیال نہ کرتے تھے۔ غیر کی عورت کو ماں کے برابر جاننا دھرم تھا اور دوسرے کی دولت کو مٹی کے برابر خیال کرنا دھرم کا ضروری حصہ مانا جاتا تھا۔ یعنی اس اصول کا احترام کیا جاتا تھا کہ جیسا اپنا جی ہے ویسا ہی دوسرے کا جی ہے۔ اس کے علاوہ اس کام کے کرنے سے برہمن کہا جاتا تھا جس سے کانک لگنے کا اندیشہ ہو اور راجہ ایک عورت کو بیشیا کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھتے تھے اور اس کی بڑی سزا دیا کرتے تھے۔

کسی کے ست زیادہ ہونے کا فلسفہ اور ہے فرض یا دھرم کی ادائیگی سے ست کا زیادہ ہونا نہیں مانا جاتا بلکہ دھرم پر قائم رہنے سے اور جان جانے کے خوف سے بھی ادھرم نہ کرنے سے خاص طور سے اس حال میں جبکہ کوئی کام کرنا یا اس کا دھرم نہ ہو اور وہ اس کام کو کرے اور اس کام میں اس کی جان جائے۔ خادم کے آقا کے لیے جان دینے سے ست زیادہ

نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کا دھرم ہے۔ اور پتی کے لیے استری کا ستی ہونا اس کا دھرم ہے۔ اس سے استری کا ست زیادہ نہیں ہوتا۔ یہاں بادشاہ کی نیکی سب سے زیادہ ہے کیونکہ اس نے دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنی جان نہ رکھی۔ جب راجہ پھر بیتال کو درخت سے اتار اور باندھ کر لے چلا تو بیتال نے کہانی کہی۔

مہاسمن اجین نگر کا راجہ تھا۔ وہاں کا ایک برہمن دیو شرما تھا۔ اس کے بیٹے کا نام تھا گناکر۔ وہ نہایت جواری ہوا۔ برہمن کا جو دھن تھا وہ جوئے میں ہار بیٹھا تو گھر کے لوگوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ وہاں سے مجبور ہو کر نکلا اور کئی دنوں میں ایک شہر میں آیا۔ ایک جوگی کو دھونی رمائے دیکھا۔ ڈنڈوت کر وہاں بیٹھ گیا۔ جوگی نے کچھ کھانے کو پوچھا۔ اس نے کہا اس کھوپڑی کا کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔ جب اس نے کھانا نہیں کھایا تو جوگی نے ایسا منتر پڑھا کہ ایک یکشنی دست بستہ حاضر ہوئی۔ جوگی نے کہا اس برہمن کو اس کی خواہش کا بھوجن دے۔ اس نے ایک اچھا مکان بنا اس میں سب آسائش اور آرام کے سامان رکھ اُسے اس میں لے گئی اور ایک چوکی پر بٹھا کر طرح طرح کے مزے دار کھانے تھال بھر بھر کر اس کے سامنے رکھے۔ اس نے جو اسے اچھا لگا جی بھر کر کھایا۔ پھر پاندان اس کے سامنے رکھا گیا۔ اور کیسر چندن گلاب گھس کر اس کے بدن میں لگایا۔ اچھے کپڑے خوشبوئیں لگا کر اسے پہنائے اور پھولوں کی مالائیں اس کے گلے میں ڈال کر اسے پلنگ پر لے جا کر بٹھایا۔ شام ہو جانے پر وہ بھی سیج پر جا بیٹھی اور برہمن کے ساتھ ساری رات عیش و عشرت میں گذاری۔ صبح ہوئی تو وہ اپنے یہاں چلی گئی اور برہمن نے اس (جوگی) سے کہا وہ چلی گئی اب میں کیا کروں۔ جوگی نے کہا علم کے زور سے آئی تھی جسے علم آتا ہو اس کے پاس رہتی ہے۔ برہمن نے کہا مہاراج یہ علم مجھے بھی دو اور میں اسے سدھ کروں۔ جوگی نے ایک منتر دیا اور کہا اسے چالیس دن آدھی رات کے وقت پانی میں بیٹھ یکسو ہو کر سدھ کرو۔

وہ جوگی کے بتائے ہوئے طریقے پر منتر کو سدھ کرنے جایا کرتا تھا۔ اسے طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں دکھائی دیتیں۔ لیکن وہ ڈرا نہیں بہت مدت گذر چکی تو اس جوگی سے آ کر کہا کہ جتنے آپ نے کہے تھے میں منتر سادھ آیا۔ جوگی نے کہا اتنے ہی دن اب آگ

میں بیٹھ کر سدھ ہو کر۔ اس نے کہا ایک بار اپنے کنبے والوں سے مل آؤں۔

جوگی سے رخصت ہو کر اپنے گھر گیا۔ کنبے کے لوگوں نے گلے لگایا اور رونے لگے۔ باپ نے کہا جو پتی برتا استری کو چھوڑ کر الگ رہنے لگتا ہے اور جوان عورت کو چھوڑ جاتا ہے جو جسے چاہتا ہے وہ اسے نہیں چاہتا وہ چنڈال کے برابر ہوتا ہے پھر گرہستی دھرم کے برابر کوئی دھرم نہیں ہوتا اور گھر والی استری کے برابر دنیا میں کوئی سکھ دینے والی نہیں جو ماں باپ کی برائی کرتے ہیں وہ ادھرم کرتے ہیں اور انھیں نجات حاصل نہیں ہوتی۔

گنا کر بولا یہ جسم خون اور گوشت کا بنا ہوا ہے۔ یہ کیڑوں کی کان ہے اور اس کا حال یہ ہے اگر ایک دن اس کی خبر نہ لی جائے تو بدبو آنے لگتی ہے۔ ایسے جسم سے محبت کرنے والے بیوقوف ہیں اور اس سے جو لگاؤ نہیں رکھتے وہ دانا ہیں۔ جسم کا یہ دھرم ہے کہ یہ بار بار جنم لیتا ہے اور مرتا ہے ایسے جسم کا اعتماد کیا جائے۔ اسے چاہے کتنا ہی پاک کیجیے لیکن یہ پاک نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جیسے غلاظت سے بھرا گھڑا اوپر سے دھونے سے پاک نہیں ہوتا اور کوئلہ دھونے سے اُجلا نہیں ہوتا۔ جس جسم سے ہمیشہ غلاظت اور پیشاب نکلے وہ کیسے پاک ہو۔

یہ کہہ کر برہمن بولا۔ کس کی ماں کس کا باپ۔ کس کی بیوی، کس کا بھائی۔ اس دنیا کی رسم ہے کتنے آتے ہیں کتنے جاتے ہیں جو یگ اور ہوم کرتے ہیں وہ آگ کو خدا جانتے ہیں اور جو کم عقل ہیں وہ مورتی کو بھگوان مانتے ہیں اور جو رشی اپنے گھٹ میں ہی ایشور کو جانتے ہیں۔ اس لیے میں گرہستی دھرم کو نہیں کروں گا بلکہ یوگ لوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے گھر والوں سے رخصت لی اور جوگی کے پاس آگ میں جا بیٹھا۔ منتر سدھ کیا لیکن بکشنی نہ آئی۔ جوگی کے پاس جانے اور اس کے پوچھنے پر بتایا ہاں مہاراج علم نہ آیا۔

بیتال اتنا قصہ کہہ کر بولا کس وجہ سے اسے بدیا نہ آئی۔ راجہ بکرم نے کہا روچیتا ہوا منتر ایک چت ہونے سے سدھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دان ہی سے کیرت ہوتی ہے۔ جو ستی سے گھرے ہوتے ہیں انھیں لاج نہیں جو انصاف سے گھرے ہیں انھیں دولت نہیں ملتی اور جو دھیان نہ لگائے انھیں بھگوان نہیں ملتا۔ منتر سادھنے پر یا جب وہ اپنے

گھر والوں سے ملنے گیا اس وقت جوگی نے غصے سے اپنے من میں کہا ایسے دوچتے (دو دبیے) سدھ کرنے والے کو میں نے بدیا کیوں سکھائی۔ نصیب آدمی کے ساتھ رہتا ہے چاہے وہ کتنا ہی زور لگائے تقدیر ہی کا لکھا ملتا ہے چاہے کوئی کتنا ہی اپنی سوجھ بوجھ سے کام کرے۔

یہ جواب سن کر بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

پتی برتا استری کو چھوڑ جانا اور جوان عورت سے منھ موڑ جانا جو چاہے اسے نہ چاہنا چنڈال کے برابر ہوتا ہے۔ نیز دھرم اور بھی ہیں لیکن گرہست دھرم کے برابر کوئی دھرم نہیں کیونکہ گھر والی استری جیسا دنیا میں کوئی سکھ دینے والا نہیں۔ برہما نے کہا ہے جو ماں باپ کی برائی کرتے ہیں وہ ادھرمی لوگ ہیں ان کی نجات کبھی نہیں ہوتی۔ اس معاشرے کی عام زندگی کے یہ اصول تھے۔ لوگ سیدھی سادی زندگی ان اصولوں پر بسر کرتے تھے اور گرہست دھرم کا سکھ بھوگتے تھے۔

معاشرے میں دوسرے خیال کے لوگ بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ اس فانی جسم سے محبت کرنا بیوقوفی ہے۔ کیونکہ یہ جسم بار بار پیدا ہوتا ہے اور بار بار مرتا ہے اسے چاہے کتنا پاک کیا جائے لیکن یہ پاک نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہے جیسے غلاظت سے بھرا گھڑا اور اس کو پاک کرنا ایسا ہے جیسے اوپر سے گھڑے کو دھونا۔ یہ رشتے ناطے کچھ نہیں، کتنے ہی گئے اور کتنے ہی گئے۔ یوگ ہی اچھا ہے کیونکہ جوگی ایشور کو اپنے ہی گھٹ میں جانتے ہیں وہ آگ کو ایشور نہیں جانتے اور مورتی کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ یہ گرہست دھرم سے اعلیٰ دھرم ہے۔

کسی کام میں کامیابی خصوصاً منتر سادھنے، مراد براری اور خدا کی عبادت میں یکسوئی لازمی خیال کی جاتی تھی۔ وہ لوگ کامیابی نہیں پاتے جو دودلے ہوتے۔ یہ اس معاشرے کے لوگوں کا یقین تھا۔ اس کے ساتھ دان پن اور تقدیر کو بھی کامیابی کی بنیاد جانا جاتا تھا۔ دھیان لگانے سے ہی بھگوان ملتا ہے۔ جیسے اس کہانی میں جوگی نے اپنے دل میں کہا کہ میں نے ایسے دودلے کو منتر کیوں دیا۔ اس کا من تو دنیا میں ہے

پھر نصیب کو بھی کامیابی میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ کم و بیش ہر معاشرے میں رہا ہے۔ اس معاشرے میں اس عقیدہ کا زیادہ ہی زور دیکھا جاتا تھا اس لیے کہا جاتا تھا کہ انسان کتنا ہی زور لگا دے لیکن نصیب اس کے ساتھ رہتا ہے اور کتنا ہی کام اپنی دانش سے کرے لیکن تقدیر ہی کا لکھا ملتا ہے۔

راجہ نے بیتال کو پھر درخت سے اتارا اور باندھے چلا تو اس نے کہانی کہی ــــ گوکل پور کا راجہ سدکیش تھا اور اس نگر کا ایک سیٹھ دھنا کئی ـــــ اس کی بیٹی کا بیاہ چھوٹی عمر ہی میں ایک بنئے گوری دت سے کر دیا گیا۔ کئی مہینوں کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی ہوئی۔ اس کا نام موہنی رکھا گیا۔ اس کے کئی برس کا ہونے پر اس کا باپ مر گیا تو بنئے کے بھائی بندوؤں نے اس کا سب کا سب چھین لیا۔ وہ مجبور اور بے بس ہو بیٹی کو لیے اندھیری رات میں گھر سے نکل اپنے ماں باپ کے گھر چلی۔ تھوڑی دُور جا کر راستہ بھول گئی اور ایک مرگھٹ میں جا نکلی۔ وہاں ایک چور سولی پر لٹکا ہوا تھا۔ اچانک اس کا پاؤں اس کے ہاتھ میں لگا۔ وہ بولا اس وقت مجھے کس نے دکھ دیا۔ وہ بولی میں نے جان کر تجھے دکھ نہیں دیا۔ میرا قصور معاف کر۔ اس نے کہا کوئی کسی کو دکھ سکھ نہیں دیتا۔ خدا نے نصیب میں لکھ دیا ہے وہی بھگتنا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کام میں نے کیا ہے وہ بالکل بیوقوف ہیں وہ دنیا کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ خدا جہاں جہاں چاہتا ہے وہاں وہاں جی جان کو کھینچ کرے جاتا ہے۔ ایشور کی کوئی بات سمجھی نہیں جاتی۔ کیونکہ انسان اپنے من جو سوچتا ہے وہ کر دیتا ہے۔

دھنوتی بولی تو کون ہے۔ وہ بولا میں چور ہوں مجھے تیسرا دن ہوا سولی پر لٹکے ہوئے جان نہیں نکلتی۔ اس نے پوچھا کس وجہ سے۔ چور نے کہا شادی شدہ نہیں ہوں۔ اگر تو اپنی لڑکی مجھے بیاہ دے تو کروڑ اشرفی دوں۔ مثل مشہور ہے کہ پاپ کا باعث لالچ ہے۔ مصیبت کا سبب مزہ ہے اور تکلیف کی وجہ محبت۔ جو ان تینوں کو چھوڑ دے وہ سکھ سے رہے۔ لیکن ہر کوئی نہیں چھوڑ سکتا۔ دھنوتی لالچ میں آئی اور لڑکی دینے کا ارادہ کیا اور کہا میں چاہتی ہوں کہ میرے لڑکا ہو لیکن کیسے ہوگا۔ اس نے کہا جس وقت جوان

ہوگی ان دنوں میں ایک خوبصورت برہمن کو بلا کر پانچ سو مہریں دے اس کے پاس رکھنا۔ اس طرح سے بیٹا ہوگا۔

دھنوتی نے لڑکی سولی کے گرد چار پھیرے دے شادی کر دی تو چور نے اس سے کہا مشرق کی طرف کنوئیں کے پاس ایک برگد کا درخت ہے۔ اس کے نیچے وہ اشرفیاں گڑی ہیں۔ جا اور لے لے۔ یہ کہنے کے بعد چور کی جان نکل گئی۔ وہ ادھر گئی اور ان میں سے تھوڑی اشرفیاں لے کر ماں باپ کے گھر آئی۔ ان سے یہ حال کہہ ان کو اپنے ساتھ لے شوہر کے دیس میں لائی اور ایک بڑی سی حویلی بنا کر اس میں رہنے لگی۔

جب وہ لڑکی جوان ہوئی تو ایک دن سکھی کے ساتھ کوٹھے پر کھڑی راستہ دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ایک جوان برہمن اس راستے پر آنکلا۔ یہ اسے دیکھ کر اس پر شیدا ہو گئی۔ اور سکھی سے کہا اس آدمی کو میری ماں کے پاس لے آ۔ وہ اس برہمن کو ماں کے پاس لے آئی۔ اس نے برہمن سے کہا کہ اے برہمن میری بیٹی جوان ہے اگر تو اس کے پاس رہے گا تو میں سو اشرفی تجھے دوں گی۔ برہمن مان گیا۔

شام ہو جانے پر اسے حسب خواہش کھانا دیا اور سب آرائش اور آسائش کا سامان کیا جیسے مشہور ہے بھوگ آٹھ قسم کا ــــ ایک خوشبویات، دوسرے عورت سے باتیں کرنا، تیسرے لباس، چوتھے گیت، پانچویں پان، چھٹے بھوجن، ساتویں سیج اور آٹھویں سجاوٹ کا سامان زیورات وغیرہ۔ پہر رات ہونے پر وہ رنگ محل میں گیا اور اس نے ساری رات عیش و عشرت سے گذاری۔ صبح ہونے پر اپنے گھر گیا وہ لڑکی سکھیوں کے پاس آئی۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہو رات کو دوست کے ساتھ کیا کیا عیش کیے۔ اس نے کہا جب اس کے پاس جا بیٹھی میرے دل میں ایک دھڑکا سا ہوا۔ جب اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑا میں اس کے بس میں ہو گئی اور مجھے کچھ خبر نہ رہی کہ کیا ہوا۔ اور یہ کہا بھی گیا ہے ایک عورت، دوسرے سورما، تیسرے ہوشیار، چوتھے مرد اور پانچویں سخی، چھٹے گن والا ساتویں عورت کا محافظ ہو ایسے مرد کو عورت اس جنم میں نہیں بھولتی۔

اس رات میں اسے حمل ہو گیا اور دن پورے ہونے پر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ چھٹی کی رات

اس کی ماں نے سپنے میں دیکھا کہ ایک جوگی نہایت بھیانک صورت بنائے اس کے سامنے آکر کہنے لگا کہ کل آدھی رات کے وقت ایک پٹارے میں مہر کا توڑا اور اس لڑکے کو بند کرکے راجہ دوار پر رکھ آ۔ یہ دیکھتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنی ماں سے سب حال کہا دوسرے دن اس کی ماں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ جوگی نے کہا تھا۔ ادھر راجہ کو خواب دکھائی دیا کہ ترشول ہاتھ میں لیے نہایت ڈراونی صورت بنائے اس سے بولا تیرے دروازے پر ایک پٹارا رکھا ہے اس میں جو لڑکا ہے اسے تو لے آ، وہی تیرا راج رکھے گا۔ راجہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے رانی سے سارا حال کہا اور دروازے پر آکر دیکھا کہ پٹارا دھرا ہے۔ پٹارے کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک لڑکا اور اشرفی کا توڑا ہے۔ اس لڑکے کو وہ اُٹھا لایا اور دربان سے کہا توڑے کو اٹھا لا۔ پھر محل میں جاکر لڑکے کو رانی کی گود میں دیا۔ اتنے میں صبح ہوگئی۔

راجہ نے پنڈتوں اور جیوتشیوں کو بلا کر معلوم کیا اس لڑکے میں راج لکشن کیسا ہے۔ ایک سامدرک جاننے والا برہمن بولا کہ مہاراج اس لڑکے میں تین لکشن تو صاف صاف ہیں۔ ایک تو بڑی چھاتی، دوسرے اونچی پیشانی، تیسرے بڑا چہرہ۔ ان کے علاوہ جو بتیس لکشن مرد کے بتائے جاتے ہیں وہ سب اس میں ہیں۔ اس سے یقین ہے کہ یہ راج کرے گا۔ راجہ نے خوش ہوکر اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر اس برہمن کو دیا اور دوسرے سب برہمنوں کو بہت سا دان دیا اور کہا اس کا نام رکھو۔ پنڈتوں نے کہا۔ مہاراج آپ کنٹھ مالا باندھ بیٹھیں مہارانی گود میں لڑکا لے بیٹھیں۔ اور سب منگلی لوگوں کو بلا کر منگل چار کرواؤ۔ پھر شاستر کی رو سے نام کرن کیا جائے۔

دیوان نے راجہ کے حکم پر لڑکا ہونے کی شہر میں منادی کروادی۔ اس پر سب منگلا مکھی حاضر ہوئیں اور گھر گھر سے مبارکباد آنے لگی۔ راجہ کے محل میں خوشی کے باجے بجنے لگے تو راجہ اور رانی گود میں لڑکے کو لے چوک میں آبیٹھے اور برہمن وید منتر پڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک جوتشی نے مبارک ساعت دیکھ کر اس لڑکے کا نام ہردت رکھا۔

سولہ سال کا ہونے پر چھ شاستر اور چودہ ودیا پڑھ کر عالم ہوا۔ پھر بھگوان کے چاہے

اس کے ماں باپ مر گئے اور اسے راج گدی ملی۔ پھر وہ دھرم راج کرنے لگا۔ کئی برس کے بعد ایک دن اپنے دل میں سوچنے لگا کہ میں نے جنم لے کر ماں باپ کے لیے کیا کیا۔

یہ مثل مشہور ہے کہ جو دیا کرنے والے ہوتے ہیں وہ سب پر دیا کرتے ہیں۔ وہی گیانی ہیں اور انھیں کو سورگ ملتا ہے۔ جن کا دل پاک نہیں، ان کا دان، پوجا، بت، تیرتھ یاترا کرنا اور شاستر سننا سب بیکار ہے۔ جو شردھا ہین سب سمیت شرادھ کرتے ہیں ان کا شرادھ کرنا بے ثمر رہتا ہے۔ اور ان کے بیٹے مایوس جاتے ہیں۔ راجہ نے یہ سوچ کر خیال کیا کہ اب ماں باپ کی عاقبت کے لیے بھی کچھ کیا جانا چاہیے۔

راجہ ہردت گیا۔ جاکر اپنے بزرگوں کے نام پھلگو ندی کے کنارے پنڈ دینے لگا کہ اس ندی میں سے تینوں کے ہاتھ نکلے۔ یہ دیکھ کر وہ جی میں گھبرایا کہ کس کے ہاتھ میں دوں اور کس کے ہاتھ میں نہ دوں۔

بیتال نے اتنی کتھا کہہ کر پوچھا پنڈ کس کو دینا واجب ہے۔ راجہ نے کہا چور کو کیونکہ برہمن کا بیج مول لیا گیا۔ راجہ نے ہزار اشرفی لے کر پالا۔ اس لیے ان دونوں کو پنڈ کا حق نہیں پہنچتا۔ بیتال اس پر پھر درخت سے جا لٹکا۔

اس کہانی سے معاشرے کے تقدیر پرست ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ جیسا تقدیر میں ہوتا ہے ویسا ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی کام خود کوئی نہیں کرتا۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو وہ ناسمجھ ہے۔ تقدیر جہاں چاہتی ہے وہاں لے جاتی ہے۔ پرماتما کے کام سمجھے نہیں جاتے۔ کیونکہ آدمی تو یہی سوچتا ہے کہ وہ ہی کرتا ہے۔

گناہ کا موجب لالچ ہے۔ مصیبت کا سبب لطف و مزا ہے۔ تکلیف کی وجہ محبت اور لگاؤ ہے۔ اگر ان تینوں کو چھوڑے تو سکھ سے رہے۔ یہ مثل مشہور ہے اور اس میں نسلوں کا تجربہ موجود ہے۔ قریب قریب ہر معاشرے میں یہی نظریہ پایا جاتا رہا۔ اس لیے اس کہانی کی دھنوتی اپنی لڑکی کی شادی چور سے سولی کے گرد چار چکر لگوا کر کردیتی ہے۔

یہ ایک عقیدہ کہا جاتا ہے کہ مرنے والے کی جان کسی چاہت میں اٹکی رہتی ہے۔ اور جب وہ چاہت پوری ہوتی ہے تو جسم سے نکلتی ہے۔ چور کی سولی پر لٹکے ہوئے تین دن

میں بھی جان نہیں نکلتی لیکن جب اس کا بیاہ دھنوتی اپنی لڑکی سے سولی کے گرد پھیرے لوا کر دیتی ہے تو اس کی جان نہ نکلنے کے عذاب سے جان باقی ہے۔

ناری کسی قسم کو جنم بھر نہیں بھولتی اور بھوگ اکٹھا پرکار کے ہیں مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور خواب میں کسی کام کو آنے کی ہدایت ملنا ایک عام عقیدہ ہے جسے بشارت بھی کہا جاتا ہے۔ کوئی بزرگ یا کوئی جوگی کسی کو کچھ کرنے کے لیے مشورہ دیتا ہے اور جسے ہدایت کی جاتی ہے وہ ویسا ہی کرنے میں عافیت جانتا تھا۔ جیسے اس کہانی میں دھنوتی اور راجہ کا پنڈتوں اور جیوتشیوں سے نومولود کے لکشن پوچھنے کا عام رواج رہا ہے اور جیوتشیوں پر یقین بھی کیا جاتا رہا ہے۔ نام رکھنے کے لیے پوجا پاٹھ اور ہون کی رسم ہندو سماج میں قدیم سے رہی ہے اور نیک ساعت میں نام رکھنا مبارک جانا جاتا رہا ہے۔

چھ شاستر اور چودہ بدیا پڑھنے سے آدمی عالم ہوتا ہے۔ یعنی دھرم اور دنیاداری سے متعلق کل فرائض کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کسی کو خدا ہمجنسوں اور متعلقین کے تئیں کیا ہونا چاہیئے اور اسے کیا کیا کرنا چاہیئے۔ شرادھ اور پنڈدان ہندوؤں میں اپنے بزرگوں کی آتما کو سکون کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے دل کا پاک اور نیک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر تیرتھ یاترا، پوجا پاٹھ اور دان پن سب ہی بیکار ہوتا ہے۔ ہری دوار اور گیا بڑے تیرتھ ہونے کے ساتھ ساتھ دھارمک کاموں کے لیے نہایت اہم خیال کیے جاتے ہیں۔ لوگ حسب توفیق اپنے بزرگوں کی آتما کو سکون دینے کے لیے یہاں یا وہاں یا اور کہیں پنڈ دان کرتے ہیں۔

راجہ بکرم بیتال کو پنڈ کا کون حقدار ہونا بتاتا ہے۔ وہ جس نے کسی کے جنم یا کسی کی پرورش کا معاوضہ نہیں لیا ہونا چاہے وہ کسی بھی صورت ہو۔ جیسے اس کہانی میں نہ برہمن نہ راجہ پنڈ کے حقدار ہوتے ہیں بلکہ چور ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کی ماں کا بیاہ ہوا تھا۔ اور جس کا روپیہ اس کے جنم اور اس کی پرورش پر صرف ہوا تھا۔

بیتال نے درخت سے لائے جانے اور باندھ کرکے چلنے پر راجہ کو پھر کہانی سُنائی۔

چترکوٹ کا راجہ روپ دت تھا۔ ایک دن اکیلا ہی شکار کو گیا۔ بھٹک کر ایک بڑے جنگل میں پہنچا۔ وہاں ایک بڑا تالاب دیکھتا ہے اس میں کنول کے پھول کھلے ہیں۔ طرح طرح کے پرندے کلولیں کر رہے ہیں۔ تالاب کے چاروں طرف درختوں کی گھنی چھاؤں میں خوشبو بھری ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ وہ گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ زمین پوش بچھا کر بیٹھ گیا۔ ایک گھڑی گذری تھی کہ ایک رشی کنیا نہایت خوبصورت وہاں پھول لینے کے لیے آنکلی۔ اسے پھول توڑتے دیکھ کر راجہ جنسی خواہش سے مغلوب ہو گیا۔ جب وہ پھول چن کر اپنے ٹھکانے کو چلی تو راجہ بولا یہ تمہارا کیا اخلاق ہے کہ ہم تمہارے آشرم میں مہمان ہیں اور تم ہماری سیوا نہ کرو۔ یہ بات سن کر وہ کھڑی ہو گئی۔ راجہ پھر بولا ایسا کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ لوگوں کے یہاں اگر کوئی حقیر مہمان بھی آتا ہے تو وہ بھی پوجا جاتا ہے چاہے وہ چور ہو یا چنڈال ہو۔ گھر آویں تو ان کی پوجا بھی مناسب ہے کیونکہ مہمان سب کا گرو ہے۔ راجہ کی ان باتوں پر وہ کھڑی ہوئی اور دونوں نظریں لڑانے لگے۔ اتنے میں رشی آپہنچا۔ راجہ سے نمسکار کیا۔ اس نے دعا دی نیز راجہ سے پوچھا یہاں کیسے آنا ہوا۔ راجہ نے کہا شکار کرنے آیا ہوں۔ تپسوی بولا کس لیے یہ گناہ کرتے ہو۔ ایسا کہا گیا ہے کہ ایک شخص گناہ کرتا ہے اور بہت سے لوگ سزا بھگتتے ہیں۔ راجہ نے کہا مہاراج مجھے مہربانی کرکے دھرم ادھرم سمجھائیں اس پر وہ منی بولے کہ جو جانور گھاس پھوس کھا پانی پی جنگل میں رہتے ہیں ان کو مارنے سے بڑا ادھرم ہوتا ہے اور جانوروں اور پرندوں کو پالنا بڑا دھرم ہے جو پناہ میں آئے ہوئے خوف زدہ کو بے خوف کر دیتے ہیں انھیں بہت بڑا ثواب ہوتا ہے۔ ایسا کہا گیا ہے کہ معاف کر دینے کے برابر دیانت نہیں اور تسکین اور اطمینان کے برابر سکھ نہیں دوستی کے برابر دولت نہیں اور رحم کے برابر دھرم نہیں۔ (چھما برابر تپ نہیں اور سنتوکھ سمان سکھ۔ دوستی کے برابر دھن نہیں اور دیا سم دھرم) جو آدمی اپنے دھرم کا پابند ہے اور دولت، ہنر، علم، شہرت پر گھمنڈ نہیں کرتا اور جو اپنی بیوی سے مطمئن ہیں اور بیچ والے ہیں وہ انجام کار سوت سے آزاد نجات پاتے ہیں۔ اور جٹادھاری لبتر ہیں۔ زاید جو کو مارتے ہیں وہ ہمیشہ نرک بھوگتے ہیں اور جو راجا رعایا کو دُکھ دینے والوں کو سزا نہیں دیتے

وہ نرک بھوگتا ہے۔ اور جو راج یا دوست کی بیوی یا بیٹی یا آٹھ نو مہینے کی حاملہ عورت سے بھوگ کرتا ہے وہ دوزخ میں پڑتا ہے۔ دھرم شاستر میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔

راجہ یہ سن کر بولا آج نادانی سے جو پاپ کیا سو کیا آئندہ خدا نے چاہا تو نہ کروں گا راجہ کی اس بات سے منی خوش ہوا کہ تو جو بر مانگے تو دوں میں تجھ سے مطمئن ہوں۔ راجہ نے کہا مہاراج اپنی کنیا مجھے دو۔ یہ سن کر منی نے اپنی کنیا کا راجہ سے گندھرپ بیاہ کر دیا۔ منی اپنے کو آشرم کو گیا اور راجہ اس کنیا کو لے کر اپنے نگر کی طرف چلا۔ آدھے راستے میں سورج غروب ہو گیا۔ چاند نکلا تو راجہ ایک گھنا سا درخت دیکھ کر اترا گھوڑا جڑ سے باندھ زمین پر بچھا اس سمیت سو رہا۔

دوپہر رات کو ایک راکشس نے راجہ کو جگا کر کہا اے راجہ میں تیری استری کو کھاؤں گا۔ راجہ نے کہا ایسا مت کر جو تو مانگے میں دوں گا۔ راکشس بولا سات برس کے برہمن کے لڑکے کا سر کاٹ کر اپنے ہاتھ سے مجھے دے۔ راجہ بولا ایسا ہی کروں گا۔ لیکن آج کے ساتویں دن میرے نگر میں آنا تو دوں گا۔ یہ قول راجہ سے لے کر راکشس چلا گیا اور صبح ہونے پر راجہ اپنے محل میں آیا۔ وزیر نے آ کر بہت خوشی ظاہر کی اور بھینٹ دی۔ راجہ نے وزیر سے کل سرگزشت کی اور پوچھا کہ ساتویں دن راکشس آئے گا اس کا کیا انتظام کریں۔ وزیر نے کہا آپ فکر نہ کریں بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔

وزیر نے سوا من سونے کا ایک پتلا بنوا جواہرات سے جڑوا ایک چھکڑے میں رکھ چوراہے میں کھڑا کروا دیا۔ اور رکھوالوں سے کہا جو برہمن اپنے سات برس کے لڑکے کا راجہ کو سر کاٹنے دے وہ اسے لے کر چلا جائے۔ لوگ اسے دیکھنے آتے رکھوالے یہی کہتے تیسرے دن اس نگر کا ایک کمزور سا برہمن جس کے کئی بیٹے تھے یہ بات سن کر برہمنی سے بولا۔ ایک لڑکا راجہ کو بلی دینے کے لیے دو تو سونے کا پتلا پاؤ۔ برہمنی بولی چھوٹے لڑکے کو نہ دوں گی۔ برہمن بولا بڑے لڑکے کو میں نہ دوں گا۔ یہ سن کر منجھلے نے کہا پتا جی مجھے دیجیے۔ برہمن نے کہا اچھا ــــ اور کہا دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ دھن کے بغیر

کسی کو آرام نہیں اور جو بے دھن ہو اس کا دنیا میں رہنا بیکار ہے۔

برہمن منجھلے لڑکے کو لے چلا۔ چوکیداروں کو دے اس پتلے کو گھر لے آیا۔ چوکیدار اس لڑکے کو منتری کے پاس لے گئے۔ سات دن گذرنے پر جب وہ راکشس آیا، راجہ نے پوجا کے سامان کے ساتھ اس کی پوجا کی اور اس لڑکے کو بلا کھانڈا ہاتھ میں لے قربانی دینے کو کھڑا ہوا اتنے میں وہ لڑکا پہلے ہنسا پھر رویا۔ راجہ نے کھانڈا مار کر اس کا سر جدا کر دیا۔

گیانی کہہ گئے ہیں کہ استری دنیا میں دکھوں کی کان ہے اور مصیبت کا گھر۔ حوصلے کو پست کرنے والی اور لالچ کرنے والی اور دھرم کو نہ رہنے دینے والی۔ ایسے جو زہر کی جڑ ہو۔ یہ بھی کہا ہے کہ مصیبت کے لیے دولت رکھئے اور دولت دے کر استری کی حفاظت کیجیے اور دولت اور استری دے کر اپنی جان کو بچائیے۔

یہاں تک کہانی کہہ کر بیتال بولا۔ مرتے وقت تو آدمی روتا ہے اے راجہ یہ بتا کہ وہ برہمن کا لڑکا ہنسا کیوں۔ راجہ نے جواب دیا وہ یہ سوچ کر ہنسا کہ بچپن میں ماں حفاظت کرتی ہے اور بڑے ہونے پر باپ پالتا ہے اور وقت بے وقت راجہ رعایا کی مدد کرتا ہے۔ دنیا کی یہ رسم ہے اور میرا حال یہ ہے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں راجہ کو دیا اور وہ کھانڈا مارنے کو کھڑا ہے۔ اور اسے دیوتا کو بھینٹ دینے کی آرزو ہے۔ کسی کو بھی رحم نہ آیا۔ بیتال یہ سن کر پیڑ پر جا لٹکا۔

(مرنے سے پہلے ہنسنا اور پھر رونا تیرھویں کہانی میں بھی آیا ہے۔ اس میں بیتال ہنسنے اور رونے دونوں کا راز دریافت کرتا ہے۔ اس کہانی میں صرف ہنسنے کا ــــ دونوں جگہ ہنسنے کے راز کی نوعیت گو الگ ہے۔)

مہمان چاہے کوئی بھی ہو اور چاہے کسی کے گھر میں جائے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ اور گھر والا اپنا اولین فرض بلکہ اپنا دھرم جانتا تھا کہ اس کے ہر آرام کا خیال رکھا جائے۔ یہ صرف اس معاشرے میں ہی نہیں آج بھی کم و بیش یہی شعار پایا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ ایک آدمی پاپ کرتا ہے اور کئی آدمی اس کے پاپ کا پھل بھوگتے ہیں۔

ایسے معاشرے میں پایا جاتا رہا ہے جس میں دھرم کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور دوسری سب باتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ رشی کا راجہ کو دھرم ادھرم کی باتیں بتانا ایک ایسے ہی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر رشی اور منی تو ہر معاشرے اور ہر دَور میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے رہے ہیں۔ یعنی گھاس پھوس والے جنگل کے جانوروں کو مارنا ادھرم ہے اور انھیں پالنا دھرم۔ پناہ میں آئے ہوئے کا خوف دُور کرنا بڑا ثواب ہے۔ معاف کرنے کے برابر ریاضت نہیں۔ تسلّی کے برابر سُکھ نہیں۔ دوستی کے برابر دولت نہیں اور رحم کرنے کے برابر دھرم نہیں۔ جو آدمی اپنے دھرم کا پابند ہے دولت، ہنر، علم، شہرت اور صورت گھمنڈ نہیں کرتا اور اپنی بیوی سے مطمئن ہے، سچ بولنے والا ہے، وہ آخر موت سے آزاد نجات پاتا ہے، اور جو جٹا دھاری بستر ہیں نرابدھ کو مارتے ہیں وہ ہمیشہ نرک بھوگتے ہیں۔ جو راجہ رعایا کو دکھ دینے والوں کو سزا نہیں دیتا وہ بھی نرک بھوگتا ہے اور جو راج پتنی یا دوست کی بیوی یا بہن یا آٹھ نو مہینے کی حاملہ عورت سے بھوگ کرتا ہے وہ دوزخ میں پڑتا ہے ـــــ لالچ بری بلا ہے اور حالات جن میں آدمی لالچ کرنے پر مجبور بلکہ بے بس ہو جاتا ہے وہ اس سے زیادہ بری بلا نہیں۔ دربل سے برہمن کا منجھلے بیٹے کو لالچ کی بھینٹ دینا ایسا ہی ہے۔ منجھلے نے اس لیے قبول کیا کہ باپ نے بڑے کو دینا نہیں چاہا۔ اور ماں نے چھوٹے کو۔

راجہ نے راکشس کی پوجا کی اور قول کے مطابق برہمن کے لڑکے کی بھینٹ دی۔ مرنے سے پہلے لڑکا ہنسا پھر رویا۔ ہنسا اس لیے کہ بچپن میں ماں حفاظت کرتی ہے اور بڑا ہونے پر باپ پالتا ہے۔ اور وقت بے وقت راجہ رعایا کی مدد کرتا ہے۔ دنیا کی یہ رسم ہے لیکن اس کا یہ حال کہ ماں باپ نے دولت کی لالچ سے راجہ کو بھینٹ کے لیے دیا۔ اور راجہ مدد دینے کے بجائے اسے کھانڈا لیے مارنے کو تیار کھڑا ہے اور راکشس (دیوتا) کو بھینٹ دیتا ہے۔ ان میں سے رحم کسی کو بھی نہ آیا۔

عورت کیا ہے اس کے تئیں معاشرے میں آدمی کا کیا فرض ہے۔ اس سلسلے میں عالموں نے روشن اور تاریک دونوں پہلو بیان کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اگر استری

سنسار میں دکھ کی کھان ہے اور مصیبت کا گھر۔ ساہس کی گرانے والی اور موہ کرنے والی اور دھرم کی ہرنے والی ایسی چوپیوں کی جڑ ہو۔" انھوں نے یہ بھی کہا ہے بُرے وقت کے لیے دھن رکھیں اور دھن دے کے استری کی رکشا کیجیے اور دھن اور استری دے کر اپنی جان کو بچایئے۔ ان دونوں مقولوں سے پتہ چلتا ہے کہ پرش سنسکرتی کو اہمیت حاصل رہی ہے، اس معاشرے میں۔ استری سنسکرتی کا شاید ہی کسی معاشرے میں پتہ چلتا ہو۔ یوں قدیم سے ہندو سماج میں عورتیں دیویاں رہی ہیں اور دیوتاؤں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

بیتال نے پھر درخت سے لائے جانے اور رے چلنے پر کہانی کہی۔

بشال پور کا راجہ بلبیشو تھا۔ وہاں ارتھودت نام کا ایک بنیا تھا۔ اس کی بیٹی کا نام تھا اننگ منجری۔ اس کی شادی کنول پور کے بنئے منی سے کر دی تھی۔ کئی دنوں بعد وہ بنیا سمندر پار تجارت کو گیا۔ ادھر یہ جوان ہوئی اور ایک دن اپنے مکان کی چھت کے کمرے میں کھڑی راستے کا تماشہ دیکھتی تھی کہ اتنے میں ایک برہمن کا لڑکا چلا آتا تھا۔ اس کا نام تھا کملاکر۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں، وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر برہمن اپنے آپ کو سنبھال کر محبت کے غم سے بے چین اپنے دوست کے گھر گیا۔ ادھر اننگ منجری بھی اس کی محبت کے غم میں بے چین تھی کہ سکھی نے آ کر اسے اٹھایا لیکن اسے اپنا ہوش نہ تھا۔ سکھی نے گلاب چھڑکا اور خوشبوئیں سنگھائیں تو اسے ہوش آیا اور بولی اے کام دیو تجھے مہادیو نے جلا کر بھسم کیا۔ اس پر بھی تو اپنی بدی سے نہیں چوکتا۔ اور بغیر قصور بہت سے مصیبت زدوں کو دکھ دیتا ہے۔ انہیں باتوں میں شام ہو گئی۔ چاند نکلا تو اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اے چندرما ہم سنتے تھے کہ تم میں امرت ہے اور تم کرنوں سے امرت برساتے ہو۔ لیکن آج تم بھی مجھ پر زہر برسانے لگے۔ اور پھر سکھی سے کہا کہ یہاں سے مجھے اٹھا کر لے چل۔ میں چاندنی سے جلی جاتی ہوں۔ تو وہ اسے اٹھا کر مکان کی چھت کے کمرے میں لے گئی اور کہا ایسی باتیں کہتے تجھے حیا نہیں آتی۔ اس نے کہا اے سکھی مجھے دل نے مار کر

بے حیا بنا دیا اور میں بہت صبر کرتی ہوں۔ لیکن محبت کے غم کی آگ سے جیسے جیسے جلتی ہوں ویسے ویسے گھر مجھے زہر سا دکھائی دیتا ہے۔ سکھی نے کہا تسلی رکھو میں تیرا سارا دُکھ دُور کر دوں گی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے گھر گئی اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اس زندگی کو اس کے لیے چھوڑ دوں اور پھر جنم لے اس سے مل سُکھ بھوگوں۔ یہ ارادہ کر کے گلے میں پھانسی ڈالی اور چاہا کہ کھینچے۔ اتنے میں سکھی آ پہنچی۔ اس نے اس کے گلے سے رسّی کا پھندا نکالا اور کہا۔ جینے سے سب کچھ، مرنے سے کچھ نہیں۔ وہ بولی ایسے دکھ بھوگنے سے مرنا اچھا اور کہا گھڑی بھر ٹھہر تا کہ میں اسے جا کر لے آتی ہوں۔

وہ کملاکر کے پاس گئی اور اسے چھپ کر دیکھا تو وہ جدائی میں تڑپ رہا تھا اور اس کا دوست گلاب کے پانی سے چندن گھِس اس کے بدن میں لگاتا ہے اور کیلے کے پتوں سے ہوا کرتا ہے۔ پھر بھی محبت کے غم کی آگ سے وہ جلا ہی جلا پکارتا ہے۔ سکھی نے کام دیو کے برہمن پر غالب آ جانے کا حال دیکھا اور اس سے جا کہا تجھے اننگ منجری نے کہا ہے کہ آکر مجھے دان دے۔ وہ بولا تو اس نے مجھے جی دان دیا ہے۔ یہ کہہ اٹھا اور سکھی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ دیکھا کہ مردہ پڑی ہے۔ اس نے بھی ایک آہ لی اور اس کا دم نکل گیا۔ صبح کو گھر کے لوگ دونوں کو مرگھٹ میں لے گئے اور چتا تیار کر کے اس میں آگ دے دی۔ اتنے میں اس کا خاوند پردیس سے مرگھٹ کے راستے آ نکلا۔ لوگوں کے رونے کی آواز پر گیا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی ایک اور مرد کے ساتھ جلتی ہے۔ یہ بھی جدائی سے بے تاب ہوا اور اس آگ میں جل کر مر گیا۔

نگر کے لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ اس سے پہلے نہ ایسا دیکھا تھا نہ سُنا تھا۔ اتنا کہہ کر بیتال بولا ان تینوں میں زیادہ کامی (محبت زدہ) کون ہے۔ راجہ بکرم نے کہا اس کا خاوند کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو اور کے لیے مری ہوئی دیکھ کر غصہ چھوڑ اس کی محبت میں مبتلا ہو کر جان دے دی۔ بیتال پھر اس درخت سے جا لٹکا۔

اس کہانی کی طرح بیشتر کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں برہمنی معاشرہ تھا۔ برہمن کو دیوتا برابر جانا جاتا تھا۔ راجہ بھی اسے ڈنڈوت کرتا تھا اور اس کی بددعا سے

ڈرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس معاشرے کی دوسری نمایاں بات کام دیو کی فرمانبرداری تھی۔ نہ راجہ نہ پرجا نہ برہمن نہ ویش کوئی بھی اس کی زد سے باہر نہیں تھا۔

غالباً اس کہانی میں پہلی بار راکشس برہمن کی بھینٹ مانگتا ہے اور راجہ اپنی رانی (رشی کنیا) کو بچانے کے لیے یہ بھینٹ دینے کا قول کرتا ہے۔ چونکہ دھن کی لالچ سے کوئی برے ہی بچ پاتا ہے اس لیے برہمن بھی دھن کو اہمیت دیتا ہے اور اپنے لڑکے کی بھینٹ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ برہمن کے لیے کم سے کم برہمن سماج کے لیے دھرم ہی اولیت رکھتا ہے لیکن انسان کی فطری کمزوری ہر دور میں اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔

ناریوں میں لاج ہر معاشرے میں نمایاں رہی ہے اگرچہ کام دیو کے بس میں آکر اس لاج کا تیاگ بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اس کہانی میں ناری لاج کو نہیں چھوڑتی اگرچہ وہ مہادیو کی مانند کام دیو کو جلا کر بھسم نہیں کر سکتی مگر خود کام دیو کو گود میں لے کر چتا میں بیٹھ جاتی ہے اور ناری کی لاج پر آنچ نہیں دیتی۔ سکھی اس کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی۔ ایک بار تو اسے پھانسی کا پھندا نہیں ڈالنے دیتی لیکن آخر جب وہ اس کی بے چینی کو دیکھ کر برہمن لڑکے کو بلانے جاتی ہے تو اسے اپنی لاج پر جان نچھاور کرنے کے لیے کوئی نہیں روک سکتا۔

بیتال پھر لایا جاتا ہے اور پھر کہانی کہتا ہے۔

چھتل نگر کا راجہ بردھمان تھا۔ اس نگر میں بشن سوامی نام کا ایک برہمن تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ایک جواری، دوسرا کشتی باز، تیسرا اچھیلا (عیاش) چوتھا نکمّا۔ ایک روز وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے لگا کہ جوا کھیلنے والے کے گھر میں لکشمی نہیں رہتی۔ یہ سن کر جواری لڑکا اپنے دل میں بہت پریشان ہوا اور کہا کہ راج نیتی میں یہ ہے کہ جوا کھیلنے والے کے ناک کان کاٹ کر دیس نکالا دیا جاتا ہے کہ اور لوگ جوا نہ کھیلیں اور جواری کے جورو لڑکوں کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی انھیں گھر میں نہ سمجھا جائے۔ نہ جانے کس وقت وہ انھیں بھی ہار دے اور جو بیواؤں پر فریفتہ ہوتے ہیں وہ اپنے دل میں دکھ کا گھر بناتے ہیں اور جو کسی کے بس میں ہوا اپنا سب کچھ دے کر چوری کرتے

یہ کہا جاتا ہے کہ جو عورت آدمی کے دل کو ایک گھڑی میں اپنا گرویدہ بنالیتی ہے اس سے دانا دُور رہتے ہیں اور بیوقوف اس سے محبت کر کے اپنا اصول اور دھرم سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ اسے اپنے گرو کی نصیحت بھی اچھی نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ جس نے اپنی شرم گنوائی وہ دوسرے کو بے عزت اور بے آبرو کرنے سے کب چوکتی ہے۔ مثل مشہور ہے جو بلاؤ اپنے بچے کو کھاتا ہے وہ چوہے کو کب چھوڑے گا۔

اور کہا کہ جنھوں نے بچپن میں علم حاصل نہیں کیا اور جوانی میں خواہشات کے ماتحت ہو کر جوانی کے گھمنڈ میں رہے۔ بڑھاپے میں حرص کی آگ میں جلتے ہیں۔ یہ سب باتیں سن ان چاروں لڑکوں نے آپس میں سوچا سمجھا کہ بے علم آدمی کے جینے سے مرنا اچھا ہے۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ دوسرے دیس میں جا کر علم حاصل کرے۔ یہ دل میں ارادہ کر کے وہ اور شہر میں گئے اور کتنی مدت بعد پڑھ کر عالم ہوئے۔ اپنے گھر کو چلے۔ راہ میں دیکھتے ہیں کہ ایک کنجر مردہ شیر کی ہڈی اور کھال الگ کر گٹھری میں باندھ کرلے جانا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا اپنا اپنا علم آزمائیں۔ یہ طے کر کے انھوں نے اسے بلایا اور کچھ دے کر ہڈیوں اور کھال کی گٹھڑی لے اسے رخصت کیا۔ پھر راستے سے الگ ہٹ کر ایک نے ہڈیوں کو جوڑ منتر پڑھ کر چھینٹا مارا تو ہڈیاں جڑ گئیں۔ دوسرے نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ تیسرے نے کھال چڑھائی۔ چوتھے نے اسے زندہ کر دیا۔ شیر نے زندہ ہو کر ان چاروں کو کھالیا۔

بیتال نے راجہ بکرم سے پوچھا ان چاروں میں سب سے زیادہ بے وقوف کون تھا۔ راجہ بکرم نے کہا جس نے شیر کو زندہ کر دیا۔ یہ مثل مشہور ہے کہ بغیر عقل کے علم کس کام کی چیز نہیں بلکہ علم سے عقل مرتبے میں کہیں زیادہ ہے۔ جو بے عقل ہوتا ہے وہ اسی طرح مرتا ہے۔ جیسے شیر کو زندہ کرنے والے مرے۔

اس جواب کو سنتے ہی بیتال پھر اس درخت پر جا لٹکا۔

معاشرے کی اقدار کا برہمن کے بیٹوں کو سمجھانے سے پتہ چلتا ہے اور نسلوں کے تجربات برہمن کی باتوں میں سمٹ آئے ہیں۔ جو اس معاشرے میں بھی مسلمات کی حیثیت

رکھتے تھے۔ (۱) جو جوا کھیلتا ہے اس کے گھر میں لکشمی نہیں رہتی۔ راج نیتی میں جواری کی سزا ناک کاٹ دیس نکالا ہے۔ اور جواری کے جورو لڑکوں کو گھر میں ہونے پر بھی گھر میں نہ سمجھا جائے نہ جانے کس وقت انھیں بھی ہار دے۔ (۲) طوائفوں کے جال میں پھنسنے والے اپنے دل میں دکھ کا گھر بناتے ہیں اور جو بس میں ہو کر اپنا سب کچھ دے بیٹھتے ہیں وہ آخر چوری کرتے ہیں۔ جو عورت آدمی کے دل کو ایک گھڑی میں اپنا لیتی ہے اس سے دانا لوگ دور رہتے ہیں اور بیوقوف لوگ اس سے محبت کر کے اپنا سب کچھ گنواتے ہیں۔ اس کو اپنے گرو کی نصیحت بھی اچھی نہیں لگتی۔ اس کے علاوہ جس نے اپنی شرم وحیا کھوئی وہ دوسرے کو بے آبرو اور بے حرمت کرنے سے کب ڈرتی ہے کیونکہ جو بلاؤ اپنے بچوں کو کھاتا ہے وہ چوہے کو کب چھوڑے گا۔ (۳) وہ جس نے بچپن میں علم حاصل نہیں کیا اور جوانی میں کام کے نشے سے جوانی کے گھمنڈ میں رہے وہ بڑھاپے میں پچھتا کے حرص کی آگ میں جلتے ہیں۔

یہ عقیدے کی حد تک یقین معاشرے کی اعلیٰ اقدار میں شامل رہا تھا کہ علم بغیر عقل کسی کام کا نہیں ہوتا۔ عقل علم سے بڑھ کر ہوتی ہے اور بے عقل لوگ اس کہانی کے علم والوں کی طرح مرتے ہیں کہ انھوں نے شیر کو زندہ کر دیا اور شیر نے ان کو کھالیا۔ اس لیے اس معاشرے میں علم سے زیادہ عقل اعلیٰ اور اہم سمجھی جاتی تھی ـــــ بیوقوفوں کے پاس علم ایسا ہی ہے جیسا کہ نادان کے ہاتھ میں تلوار۔ جس سے وہ اپنی ہی گردن کاٹ لیا کرتا ہے۔

بیتال کو راجہ پھر درخت سے اُتار لایا اور باندھ کرلے چلا۔ بیتال نے راستے میں یہ کہانی کہی۔ شیو پور کا راجہ بدھ تھا۔ اس نگر میں نارائن نام کا ایک برہمن تھا وہ ایک دن اپنے دل میں سوچنے لگا میرا جسم بوڑھا ہو گیا ہے اور میں دوسرے کے جسم میں بیٹھنے کا علم جانتا ہوں اس لیے بہتر ہے کہ اس پرانے جسم کو چھوڑوں اور کسی جوان کے جسم میں جا رہوں۔ جب وہ اپنے دل میں سوچ چکا اور ایک نوجوان کے جسم میں بیٹھنے لگا تو پہلے رو دیا پھر ہنسا۔ اس کے بعد اپنے گھر میں آیا لیکن کنبے کے لوگ اس کے کرتب سے واقف تھے۔ وہ ان سے کہنے لگا میں اب جوگی ہوا اور یہ کہہ کے پڑھنے لگا۔ جو امید کے تالاب کو ریاضت کے جلال

سے سکھا اس میں اپنے دل کو رکھ حسیات کو غیر فعال بنائے وہ ہوشیار جوگی کہلائے۔
دنیا کے لوگوں کا یہی طور ہے۔ اعضاء ڈھیلے پڑیں۔ سر ہلے، دانت گریں پھر بوڑھے ہوئیں لاٹھی لے پھریں تو بھی ہوس نہیں مٹتی اور اس طرح سے زمانہ چلا جاتا ہے۔ کہ دن ہوا، رات ہوئی، مہینہ ہوا۔ برس ہوا۔ بچہ ہوا بڑا ہوا اور کچھ نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اور لوگ کون ہیں اور کون کس لیے کسی کا سوگ کرتا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے اور آخر کار سب ہی جانے والے ہیں۔ ان میں سے ایک نہ رہے گا۔ طرح طرح کے دل میں طرح طرح کے ارمان ہیں۔ قسم قسم کے پاکھنڈ، برہمانے راچے ہیں۔ لیکن دانا ان سے بچے۔ امید اور ہوس کو مار کر سر منڈا ہاتھ میں لاٹھی اور کمنڈل لے۔ خواہش غصّے کو مار جوگی ہو ننگے پاؤں تیرتھ تیرتھ پھرتے ہیں۔ وہ نجات کی نعمت پاتے ہیں۔ اور یہ دنیا خواب کی طرح ہے اس میں کس کی خوشی منایئے اور کس کا غم کیجیے اور کیلے کی طرح دنیا ہے اس میں کچھ ٹھوس نہیں۔ اور دولت، حسن اور علم پر جو لوگ غرور کرتے ہیں وہ بیوقوف ہیں اور جو جوگی ہو کر در در کمنڈل لیے بھیک مانگتے ہیں اور اپنے جسم کو دودھ، گھی اور چینی سے مضبوط بناتے ہیں اور خواہش سے مغلوب ہو کر استری سے بھوگ کرتے ہیں وہ اپنا جوگ کھوتے ہیں۔ اتنا پڑھ کر وہ بولا میں تیرتھ یاترا کو جاتا ہوں۔ یہ بات سن کر اس کے کنبے کے لوگ بہت خوش ہوئے۔

اتنی کہانی کہہ کر بیتال بولا کس سبب وہ رویا اور کس وجہ سے وہ ہنسا۔ راجہ نے بتایا کہ بچپن کا پیار اور جوانی کا سکھ یاد کر کے اور اپنے دل میں اس جسم میں رہنے کے لگاؤ سے تو وہ رویا اور اپنے منتر کو سدھ کر کے نئے جسم میں بیٹھنے کی خوشی سے وہ ہنسا۔ یہ جواب سنتے ہی بیتال پھر اس درخت پر جا لٹکا۔

پرانی چیز چاہے جتنی بوسیدہ اور بیکار ہو جائے اس سے مدت کی رفاقت کے سبب گہرا لگاؤ ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑنا دکھ دیتا ہے۔ یہی معاشرے کی اقدار اور روایات کو بھی چھوڑنے پر ہوتا ہے۔ جوگیوں کے کرشمے داستانوں میں نوع بہ نوع بیان ہوئے ہیں جو طلسمی حد تک کارگزار ہوئے ہیں۔ اور قرین قیاس سمجھے جاتے ہیں، خصوصاً

داستانوں کے معاشرے کے لوگ ان پر یقین بھی کر لیتے تھے۔ چاہے وہ کتنے ہی عقل سے بعید ہوتے کیونکہ جوگیوں اور جنتر منتر سدھ کرنے والوں کو مافوق الفطرت لوگ جاننے لگتے تھے۔ برہمن کا دوسرے کے جسم میں جا بیٹھنے کا علم جاننا اس نوجوان کے جسم میں بیٹھتے ہوئے اسے پرانا جسم چھوڑتے ہوئے دکھ ہوا۔ اس لیے وہ رویا۔ اور اس لیے بھی کہ اسے اس جسم میں جوانی کے سکھ یاد آئے۔ کامیابی اس کے ہنسنے کا باعث ہوئی اور اپنا علم سدھ کر کے نئے جسم میں بیٹھ رہنے کی خوشی بھی۔

باکمال جوگی کی خوبیاں یہ جانی جاتی تھیں کہ وہ امیدوں اور آرزوؤں کے تالاب کو ریاضت کے جلال سے خشک کر کے اپنے دل کو اس میں رکھے اور حسیات یعنی نفسانی خواہشات کو غیر فعال بنائے۔

سنیاس ہندوستانی معاشرے کا حصہ نہایت قدیم سے رہا ہے۔ دنیا کے لوگوں کی آرزو اور ہوس نہیں مٹتی چاہے ان کا جسم اور ان کی جسمانی طاقت ان کا حوصلہ نہ رکھے۔ صرف وہی عقلمند ہیں جو کام کرودھ کو مار کر جوگی ہو جاتے ہیں اور تیرتھ یاترا کرتے پھرتے ہیں اور نجات کی نعمت کو حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ وہ معاشرہ بھی دنیا کو آنی جانی شے سمجھنے والا تھا اور نجات کا ذریعہ صرف سنیاس کو جانتا تھا اس لیے عقیدہ معاشرے میں پایا جاتا تھا اور اس کو دانشمند جانا جاتا تھا۔ اور جو دولت، حسن اور علم پر گھمنڈ کرتے ہیں وہ بیوقوف لوگ ہیں۔

معاشرہ ایسے جوگی کو کبھی نجات کی نعمت کا حقدار نہیں جانتا تھا جو در در بھیک مانگ کر دودھ گھی چینی سے اپنے جسم کو مضبوط بناتا ہے اور جنسی خواہش کے بس میں ہو کر اپنی عورت (استری) سے بھوگ کرتا ہے۔ اس کے لیے سنیاس ہی کو ضروری جانتا تھا اور نجات حاصل کرنے کا یہی ذریعہ جانا جاتا تھا۔ اس لیے کنبے کے لوگ خوش ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی فرد سنیاس اختیار کر کے تیرتھ کو چلا جاتا تھا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر ــــــ

جب راجہ بکرم بیتال کو تیئیسویں بار باندھ کر لے چلا تو بیتال نے کہانی کہی۔
دھرم پور کا راجہ دھرم دھوج تھا۔ اس شہر میں برہمن گووندرام چاروں ویداؤ

چھٹوں شاستر کا جاننے والا تھا۔ اپنے دھرم کرم کا پابند تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے، ہردت، سوم دت، یگیہ دت، ہم مبھودت۔ بڑے عالم، بڑے ہوشیار اور عقلمند۔ باپ کے ہمیشہ فرمانبردار رہتے تھے۔

کئی دنوں بعد بڑا بیٹا مر گیا اور وہ بھی اس کے غم سے مرنے لگا۔ تو راجہ کا پروہت بشن شرما اسے آکر سمجھانے لگا کہ آدمی جب ماں کے پیٹ میں آتا ہے پہلے تو وہیں دُکھ پاتا ہے دوسرے بچپن میں بہت سی تکلیفیں اسے ستاتی ہیں۔ جوانی میں کام کے بس ہوکر محبوب کی دُوری کا دکھ سہتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوکر اپنے جسم کے کمزور ہونے سے تکلیف میں پڑتا ہے۔ غرض دنیا میں پیدا ہونے سے بہت دُکھ ہوتا ہے اور سکھ تھوڑا۔ یہ دنیا دکھ کی موجب ہے۔ دکھ ہی اس کی جڑ ہے۔ اگر کوئی درخت کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے یا پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے یا پانی میں چھپ رہے یا لوہے کے پنجرے میں گھس رہے یا پاتال میں جا چھپے تو بھی اسے موت نہیں چھوڑتی۔ اور دانا بیوقوف، دولتمند، مفلس، عالم، طاقت ور، کمزور سب ہی کو کھا جانے والی موت کسی کو نہیں چھوڑتی۔ آدمی کی سو برس کی عمر ہوتی ہے اس میں سے آدھی تو رات میں جاتی ہے۔ آدھی کی آدھی بچپن اور بڑھاپے میں۔ باقی جو رہی وہ غموں میں گذرتی ہے۔ دل پانی کی موج جیسا چنچل ہے اس سے آدمی کو سکھ کہاں۔ اب کلجگ میں سچ بولنے والے لوگ مشکل ہیں اور دن دن دیش اجڑتے ہیں۔ راجہ لالچی ہوتے ہیں۔ زمین کم پھل دیتی ہے چور بدکار دنیا میں اودھم مچاتے ہیں اور دھرم، عبادت وریاضت اور صداقت دنیا میں تھوڑی رہی ہے۔ راجہ پہلے جیسا نہیں۔ برہمن لالچی ہوئے۔ لوگ عورت کے بس میں آئے۔ عورت شوخ ہوئی۔ باپ کی برائی بیٹا کرنے لگا اور دوست دشمنی ـــــ اور دیکھو جن کے ماما کرشن اور باپ ارجن اس ابھیمنیو کو بھی موت نے نہیں چھوڑا۔ جس وقت آدمی کو موت کا فرشتہ لے جاتا ہے اس کے گھر میں دولت ہوتی ہے، ماں باپ، بیوی، لڑکے، بھائی، رشتہ دار کوئی کام نہیں آتا ہے۔ بھلائی بُرائی اور پاپ پن ہی ساتھ جاتے ہیں۔ کنبے کے لوگ ہی اسے مرگھٹ میں لے جا کر چلا آتے ہیں۔ رات گذرتی ہے۔ دن آتا ہے۔ چاند ڈوبتا ہے سورج طلوع ہوتا ہے۔

ایسے ہی جوانی جاتی ہے اور بڑھاپا آتا ہے۔ ایسے ہی وقت گذرتا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر بھی آدمی کو گیان نہیں ہوتا۔ ست جگ میں مان دھاتا سا راجہ ہوا جس نے ساری دنیا کو دھرم سے بھر دیا تھا۔ ترتیہ یگ میں سری رام چندر راجہ کہ جنھوں نے سمندر پر پل باندھ کر لنکا کا گھمنڈ توڑا۔ راون کو مارا اور دواپر یگ میں یدھشٹر نے ایسا راج کیا کہ جس کی شہرت اور نیک نامی اب تک پائی جاتی ہے۔ لیکن موت نے ان لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ آسمان پر اڑنے والے پرندے اور سمندر میں رہنے والے جاندار بھی وقت آنے پر آفت میں پڑتے ہیں۔ اس دنیا میں اگر کوئی دکھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس سے لگاؤ رکھنا بیکار ہے۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ دھرم کے کام کیے جائیں۔

یوں بشن شرما کے سمجھانے سے اس برہمن کے دل میں آیا کہ اب پن کا ج کیجیے۔ دل میں یہ ٹھان کر اپنے بیٹے سے کہا کہ میں یگیہ کرنے بیٹھتا ہوں تم سمندر سے جا کر کچھوا لے آؤ۔ اس نے باپ کا حکم پاکر ایک جھینور (کہار) سے کہا ایک روپیہ لے اور ایک کچھوا پکڑ دے۔ اس نے روپیہ لے کر کچھوا پکڑ دیا۔ بڑے نے کہا منجھلے سے تو اٹھا لے۔ منجھلے نے چھوٹے سے کہا تو اُٹھا لے۔ چھوٹے نے کہا میں نہیں چھوؤں گا میرے ہاتھ میں بدبو آجائے گی۔

چھوٹے نے کہا میں کھانا کھانے میں ہوشیار ہوں۔ منجھلا بولا میں عورت رکھنے میں ہوشیار ہوں اور بڑے نے کہا میں سیج پر سونے میں ہوشیار ہوں اور تینوں بحث و مباحثے میں پڑ گئے۔ کچھوے کو وہیں چھوڑ کر جھگڑتے ہوئے راجہ کے یہاں گئے اور دربان سے کہا تین برہمن فریادی ہیں جا کر راجہ سے کہو۔ دربان نے راجہ کو خبر دی۔ راجہ نے ان سے جھگڑے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے اپنی اپنی خوبیاں اور اپنے اپنے ہُنر بتائے۔ راجہ نے کہا اپنا اپنا امتحان دو۔ انھوں نے کہا بہت اچھا ـــــ راجہ نے اپنے باورچی کو بلا کر قسم قسم کے کھانے بنانے کو کہا۔ اس نے رسوئی تیار کر کے کھانے میں ہوشیار کو تھال پر لے جا کر بٹھایا۔ چاہا کہ لقمہ اٹھا کر منھ میں ڈالے تو اس میں سے بدبو آئی۔ اسے چھوڑ ہاتھ دھو راجہ کے پاس آیا اور کہا مہاراج اس میں سے بو آئی۔ اس سے پوچھا گیا کہ بدبو کی وجہ بتاؤ۔ اس نے کہا مہاراج مرگھٹ کے چاول تھے۔ مُردے کی بو اس میں سے آتی تھی۔ راجہ نے بھنڈاری سے معلوم کیا کہ کس گاؤں

سے چاول آئے تھے۔ راجہ نے اس گاؤں کے کسان کو بلایا۔ اس نے بتایا مہاراج شمشان کے ہیں۔ پھر دوسرے کے امتحان کی باری آئی اور ایک اچھی عورت کو بلوا کر اس کے پاس رکھوایا اور وہ دونوں لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ راجہ چھپ کر جھروکے سے دیکھنے لگا۔ برہمن نے اس کا بوسہ لینا چاہا۔ اس کے منھ سے بدبو آئی وہ منھ پھیر کر سو رہا۔ صبح کو راجہ نے برہمن کو بلا کر پوچھا۔ اس نے کہا مہاراج اس کے منھ سے بکری کی گندھ آتی تھی۔ اس سے میرا دل بے چین ہو گیا۔ راجہ نے دلاّل سے معلوم کیا تو اس نے بتایا یہ میری بہن کی بیٹی ہے۔ تین مہینے کی تھی تو اس کی ماں مر گئی۔ میں نے اسے بکری کا دودھ پلا کر پالا۔ پھر تیسرے کے امتحان کی باری آئی۔ اچھے اچھے بستر کروائے گئے اور اسے پلنگ پر سلوایا۔ صبح ہونے پر راجہ نے اس سے معلوم کیا تو اس نے بتایا مہاراج رات بھر نیند نہیں آئی۔ کیونکہ ساتویں تہہ میں بال ہے وہ میری پیٹھ پر چبھتا تھا۔ راجہ نے بچھونے کی ساتویں تہہ دیکھی وہاں سے ایک بال نکلا۔

اتنی کہانی کہہ کر بیتال نے کہا ان میں سب سے زیادہ ہوشیار کون ہے۔ راجہ بکرم نے کہا سیج چتر ——— یہ سنتے ہی بیتال پھر جا درخت سے ٹنگ گیا۔

ہندوستانی کہیے یا ہندو معاشرہ۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر تھی کہ آدمی جنم سے مرن تک دکھ ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ ماں کے حمل سے بوڑھا ہونے اور پھر پرلوک سدھارنے تک ——— گویا دنیا میں دکھ بہت ہوتا ہے اور سکھ تھوڑا۔ موت کہیں نہیں چھوڑتی۔ آدمی چاہے کوئی بھی تدبیر کرے۔ اس سے پاتال میں بھی مفر نہیں۔

اس عقیدے کے ساتھ یہ خیال وابستہ ہے کہ آدمی کی عمر سو برس ہوتی ہے (اس زمانے میں اتنی ہی عمر ہوتی ہوگی۔ اس سے پہلے تو کہا جاتا ہے کہ کئی کئی سو برس عمریں ہوا کرتی تھیں) اس سو برس میں سے آدھے برس رات کے سونے میں چلے جاتے ہیں اور آدھے میں سے آدھے برس بچپن اور بڑھاپے کی نذر ہو جاتے ہیں کیونکہ اس وقت آدمی کچھ کرنے کے لیے اپنے بس ہی میں نہیں ہوتا۔ کل پچیس برس بچ رہے جو غموں ہی میں گذرتے ہیں۔

کلجگ کے آثار سے متعلق یہی کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ سچ بولنے والے لوگ ملنے دشوار ہیں بلکہ روز بروز آبادی میں کم ہوتے جاتے ہیں۔ راجہ لالچی ہو جاتے ہیں جو اس کے کردار کے منافی ہے۔

زمین پیداوار کم دینے لگتی ہے۔ مصنوعی طریقے سے پیداوار میں اضافہ سے پیداوار کا فائدہ کم ہو جاتا۔ چور بدکار لوگ من مانی کرتے پھرتے ہیں۔ دھرم اور عبادت و ریاضت تھوڑی رہ جاتی ہے۔ برہمن بھی لالچی ہو جاتے ہیں۔ انھیں دھرم کرم کا خیال نہیں رہتا۔ لوگ عورت کے بس میں ہوتے ہیں اور عورت شوخ اور حیا سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ بیٹا باپ کی برائی کرتا ہے اور دوست دشمنی۔

صرف بھلائی یا بُرائی ہی آدمی کے ساتھ جاتی ہے اور سب کچھ یہیں دھرا رہ جاتا ہے۔ آدمی کو رات جاتے اور دن نکلتے۔ چاند ڈوبتے اور سورج طلوع ہوتے اور جوانی جاتی اور بڑھاپا آتا دیکھ کر بھی سبق حاصل نہیں ہوتا۔ موت نے تینوں یگوں کے عظیم لوگوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ یعنی اس دنیا میں دکھ سے کوئی نہیں چھوٹتا اس لیے اس کا پیار بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ دھرم کے کام کیے جائیں۔

آپس کے جھگڑے راجہ کے یہاں ہی فیصل ہوتے تھے اور وہ اپنی سوجھ بوجھ سے معاملے کی جانچ پڑتال سے اپنا فیصلہ دیتا تھا۔ اس فیصلے سے سب ہی مطمئن ہوتے تھے۔ کیا برہمن کیا اور لوگ ——— حالانکہ راجہ برہمن کا بڑا احترام کرتا تھا لیکن اس کے فیصلے کو وہ بھی مانتے تھے۔

راجہ بکرم پھر بیتال کو درخت سے اتار لایا اور لے کر چلا۔ اس نے کہانی کہی۔ کنڈل دیس میں جگسرما نام کا ایک برہمن تھا۔ اس کی بیوی کا نام سوم رتا تھا۔ بہت حسین ——— وہ یگیہ کرنے لگا۔ اس کے یہاں اس دوران میں ایک لڑکا ہوا۔ جب وہ پانچ برس کا ہوا تو باپ نے اسے شاستر پڑھائے اور بارہ برس کی عمر میں وہ سب شاستر پڑھ کر عالم ہوا۔ ہمیشہ اپنے باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ کئی دنوں بعد وہ لڑکا مر گیا۔ اس کے غم میں ماں باپ رونے پیٹنے لگے۔ کنبے کے لوگ یہ خبر پاتے ہی آئے اور لڑکے کو شمشان میں لے گئے۔ وہاں اسے دیکھ کر آپس میں کہنے لگے۔ دیکھو تو یہ بھی کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ یہ باتیں کرتے جاتے تھے اور چتا تیار کرتے جاتے تھے۔ قریب ہی وہاں ایک جوگی تپسیا کر رہا تھا۔ وہ یہ سن کر اپنے دل میں سوچنے لگا کہ میرا جسم نہایت بوڑھا اور ضعیف ہو گیا ہے اگر اس لڑکے کے جسم میں جا بیٹھوں تو آرام سے جوگ کروں۔ یہ خیال آتے ہی وہ اس لڑکے کے جسم میں آ گیا اور لڑکا رام کشن کہہ کر یوں اٹھا جیسے وہ سوتے سے اٹھا

ہو. یہ دیکھ کر سب لوگ حیران ہو گئے. گھر آئے اس کے باپ کو یہ عجوبہ دیکھ کر بیراگ ہوا. وہ پہلے ہنسا اور پھر رویا.

اس کتھا کے یہاں تک کہنے پر بیتال نے پوچھا وہ کیوں ہنسا اور کیوں رویا. راجہ بکرم نے کہا کہ جوگی کو اس کے جسم میں جاتے دیکھ کر اور علم سیکھ کر ہنسا اور اپنے جسم سے پیار ہونے کے سبب رویا کہ ایک دن اسے بھی اسی طرح اپنا جسم چھوڑنا ہوگا.

یہ سنتے ہی بیتال اس درخت سے پھر جا لٹکا.

راجہ اور برہمن یگیہ کرتے تھے اور یوگ لیتے تھے. یہ ایک ایسے معاشرے کا نمایاں شعار ہوتا ہے جو معاشرہ دھرم کرم اور دان پن کے اصول اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے.

یوگ کے محیر العقول کرشمے ہر دور میں ہوئے ہیں دوسرے کے جسم میں جا بیٹھنا اور زندگی کا بھوگ کرنا پہلے بھی داستانوں میں آگیا ہے بھوت یا بیتال کا تو کسی کے جسم میں داخل ہو جانا اور بات ہے لیکن جوگیوں کا بھی یہ کر لینا واقعی عجیب معلوم ہوتا ہے. لیکن وہ معاشرہ ایسے ہی عقائد رکھنے والا تھا.

پہلے کسی بات سے ہنس دینا اور پھر رو دینا یہ پہلے کی کہانیوں میں بھی آیا ہے. رونا تو جسم کے موہ سے تھا اور ہنسنا دوسرے کے جسم میں جانا اور اس ودیا کو سیکھنے سے تھا. جسم کا موہ قدرتی بات ہے اور اپنی کامیابی پر ہنسنا انسانی فطرت ہے. یہ دونوں باتیں معاشرے کی نوعیت سمجھنے میں بھی کسی قدر مدد دیتی ہیں.

راجہ بیتال کو پھر باندھ اور کاندھے پر اٹھا کر چلا تو بیتال نے یہ کہانی کہی. دکن کے دھرم پور نگر کا راجہ مہابل تھا. اس نگر میں وہاں کا ایک اور راجہ حملہ آور ہوا. اس نے نگر کو گھیرے میں لے لیا. کئی دن تک راجہ لڑتا رہا. جب اس کی فوج دشمنوں سے مل گئی اور کچھ لڑائی میں کام آئی تو وہ مجبور ہو کر رات کو بیٹی سمیت رانی کو لے کر جنگل میں نکل گیا. صبح ہونے تک کئی کوس تک جنگل میں چلا گیا تھا. اسے ایک گاؤں دکھائی دیا تو رانی اور راج کنیا کو ایک درخت کے نیچے بٹھا کر گاؤں کی طرف کھانے کا سامان لینے کو چلا کہ بھیلوں نے آ گھیرا. اور ہتھیار ڈال دینے کے لیے کہا. راجہ نے تیر مارنے شروع کیے. انھوں نے بھی جواب میں تیر برسائے. ایک پہر لڑائی

رہی اور بھیلوں کے کئی لوگ مارے گئے کہ ایک تیر راجہ کی کھوپڑی میں ایسا آ لگا کہ وہ تھرا کر گر پڑا اور ایک نے راجہ کا سر کاٹ لیا. جب رانی اور راج کنیا نے راجہ کو مرا ہوا دیکھا تو روتی پیٹتی بن کو چلیں. کوس دو کوس چل کر تھک گئیں اور بیٹھ گئیں. طرح طرح کے اندیشے کرنے لگیں. اتنے میں راجہ چندرسین اور اس کا بیٹا شکار کھیلتے ہوئے اس جنگل میں آ نکلے اور دونوں کے پاؤں کے نشان دیکھ کر راجہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اس بڑے جنگل میں آدمی کے پاؤں کے نشان کہاں سے آئے. شہزادے نے کہا یہ عورت کے پاؤں کے نشان ہیں. مردوں کا پاؤں اتنا چھوٹا نہیں ہوتا. وہ دونوں ڈھونڈھنے نکلے. راجہ نے کہا اگر ملیں تو جس کا یہ بڑا پاؤں ہے وہ تجھے دوں اور دوسری میں لوں گا. وہ آگے آ کر دیکھتے ہیں کہ وہ دونوں بیٹھی ہیں. انھیں دیکھ کر خوش ہوئے. رانی کو راجکمار نے رکھا اور راج کنیا کو راجہ نے.

یہاں تک یہ کتھا کہہ کر بیتال نے کہا ان دونوں کے لڑکوں کا آپس میں کیا رشتہ ہوگا.

راجہ کو اس کا کوئی جواب نہ سوجھا اور وہ چپ رہا. بیتال بہت خوش ہوا اور بولا اے راجہ میں تیری بہادری اور تیرا حوصلہ دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں. میں ایک بات تجھ سے کہتا ہوں وہ سن. جس جسم کے روم کانٹوں کی مانند اور جسم مکڑی سی اور شانت شیل ہے وہ تیرے شہر میں آیا ہے اور تجھے اس نے میرے لیے بھیجا ہے. آپ مرگھٹ میں بیٹھا منتر سدھ کر رہا ہے اور وہ تجھے مارنا چاہتا ہے اس لیے میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ جب وہ پوجا کر چکے گا تو تب تجھ سے کہے گا کہ اے راجہ آٹھوں انگ سے ڈنڈوت کر تو کہنا میں سب راجاؤں کا راجہ ہوں اور سب راجہ مجھے آ کر ڈنڈوت کرتے ہیں میں نے آج تک کسی کو ڈنڈوت نہیں کی اور میں جانتا ہوں آپ گرو ہیں. مجھے کرپا کر کے سکھا دیجیے تو میں کروں. جب وہ ڈنڈوت کرے تب ایسا کھڑگ مارنا کہ سر جدا ہو جائے. پھر تو اکھنڈ راج کرے گا ورنہ وہ تجھے مار کر مستقل راج کرے گا.

یہ کہہ کر بیتال اس مردے کے جسم سے نکل کر چلا گیا اور کچھ رات وہ مردہ راجہ نے لا کر جوگی کے آگے رکھ دیا. جوگی بہت خوش ہوا اور بہت بڑائی کی. پھر منتر پڑھ اس مردے کو جگا ہوم کر بل دیا اور جنوب کی طرف بیٹھ کر جتنا وہاں انتظام کیا تھا وہ اپنے دیوتا کو چڑھا دیا.

یہ ادھرم اور پاپ نہیں مانا جاتا تھا کہ کوئی اگر کسی کو مارنا چاہے تو وہ اسے مار ڈالے کسی ادھرمی اور پاپی کے مارے جانے سے دیوتا خوش ہوتے تھے۔ یہ خیال معاشرے میں پایا جاتا۔ اور مارنے والے کو دیوتا دعائیں دیتے تھے بلکہ جے کار کرنے کے لیے دیوتاؤں کا راجہ اندر بھی ایسے دھرمی کے پاس پہنچتا تھا۔

دنیا کا قیام چاند، سورج، زمین اور آسمان رہنے تک مانا جاتا تھا اور یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ چاہے کوئی بھی ہو صرف عقلمند کی فتح ہوتی تھی۔ یعنی معاشرہ عقلیت پسندی کے رجحان کا پتہ دیتا تھا اور عقل ہی کو بڑائی، کامیابی اور سرخروئی کا موجب مانا جاتا تھا۔ اور اس شخص کا کامیاب ہونا اور کامیابی کا مستحق ہونا مانا جاتا تھا جو عقلمند ہوتا تھا اور جس کی زندگی کا شعار عقلیت پسندی ہوتا تھا۔

دوسری کہانیوں کے مقابلے میں ان کہانیوں میں دو تین باتیں خاص طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں جو تقریباً قدرے مشترک ہیں۔ کہانیوں کا راوی ایک بے جو جادو کے پتلے کی طرح پیڑ میں لٹکا ہوا ہے اور اس طرح بات کرتا ہے جیسے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی پتلا یا کوئی معمل بنایا جاتا ہے اور اس سے سوال کرکے جواب لیا جاتا ہے۔(٢) (٢) دوسرے عورتوں کا جنسی اور منفی کردار عام طور پر کم ہے اگرچہ وہ کھشتری اور برہمن نسل کی عورتیں ہیں۔ (٣) اس میں تیسرے گندھرپ بیاہ کی بات تقریباً پہلی بار سامنے آتی ہے اور اس پس منظر میں سامنے آتی ہے کہ مرد نہیں خود عورت جلد از جلد جنسی قربت کی آخری منزل سے گذر جانے کی خواہش مند ہے۔ ہندوؤں میں گندھرپ بیاہ جائز رہا ہے لیکن ان کہانیوں میں جن مواقع پر ان کا سہارا لیا گیا ہے وہ جنسی جذبے کے بے قید ہونے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ کہانی میں ہیرو ہیروئن کا کردار بادشاہوں اور وزیروں کے ماسوا برہمن اور برہمن زادیوں کو بھی ملا ہے۔ اور اس سے بھی کچھ آگے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برہمن اور چھتریوں کے ساتھ ویش بھی کہانیوں کے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں جو اس عہد کی دوسری کہانیوں میں کہیں شاید ہی دیکھنے میں آتا ہو۔

اور دھوپ پان سے پوجا کرکے راجہ سے کہا ڈنڈوت کر۔ راجہ نے بیتال کی بات یاد کر نہایت عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا مہاراج میں پرنام کرنا نہیں جانتا آپ سکھائیں تو کروں۔ یہ سنتے ہی جوگی نے جیسے ہی ڈنڈوت کی اور نیچے سر جھکایا راجہ نے کھڑگ مار اس کا سر جدا کر دیا۔ بیتال نے آکر پھولوں کا مینہ برسایا۔

یہ کہا گیا ہے کہ کس کو مارنا چاہیئے اور اس کا مارنا دھرم نہیں راجہ کا حوصلہ اور اس کی جرأت دیکھ کر راجہ اندر سمیت سب دیوتا اپنے اپنے اڑن کھٹولوں پر آ وہاں جے جے کار کرنے لگے۔ راجہ اندر نے خوش ہو کر بکرماجیت سے کہا "بر مانگ" راجہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ یہ میری کتھا دنیا میں مشہور رہے۔ راجہ اندر نے کہا جب تک چاند سورج اور زمین قائم ہیں اس وقت تک یہ کتھا مشہور رہے گی اور تو کل زمین کا راجہ ہوگا۔ راجہ اندر یہ کہہ کر اپنے یہاں چلا گیا اور راجہ نے دونوں لاشوں کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیا تو دونوں بیر آ حاضر ہوئے اور کہنے لگے ہمیں کیا حکم ہے۔ راجہ نے کہا جب میں یاد کروں تب آ جایا کرنا۔ راجہ نے اس سے یہ قول لے کر اپنے یہاں آ راج کرنے لگا۔

یہ کہا گیا ہے کہ عالم ہو یا بیوقوف، لڑکا ہو یا جوان جو عقلمند اور دانا ہوگا اسی کی جے ہوگی۔

راجہ کا دھرم ہتھیار ڈالنا نہیں تھا۔ اس کو اپنے ملک اور اپنی رعایا کی حفاظت کرنا لازم تھی۔ جب اسے ناممکن پاتا تھا تو بیوی بچوں کے ساتھ جنگل میں نکل جاتا تھا اور بن باسی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس معاشرے میں ایسے ہی راجہ کو دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ ہتھیار ڈال دینا اس کو کلنک لگ جانا ہوتا تھا۔

اس معاشرے میں بھی عورت مرد کی کمزوری ہوتی تھی اور یہ فساد اور جھگڑے کی بنیاد بن جایا کرتی تھی۔ یہاں تک اس سلسلے میں باپ بیٹے میں بھی معاہدہ سا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ انھیں بھی اس بنا پر جھگڑے کا اندیشہ رہتا تھا۔ لیکن اس کہانی میں جو راجہ نے کیا اور جس سے عجیب رشتے کی بنیاد پڑی۔ وہ راجہ نے ادھرم ہی کیا۔ کہ ماں بیٹے کو اور اس کی بیٹی خود رکھنے کے لیے کہا۔

راقم کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس کے محرکات و وجوہ کیا ہیں اور جس زمانے میں یہ کردار تخلیق کیے گئے اس دور میں مختلف طبقات کی معاشرتی اہمیت اور درجہ بندی میں کیا تبدیلی ہوئی تھی اور کیوں ہوئی تھی۔

بیتال کی کہی ہوئی کہانیاں حکمت آمیز ہیں اور ذہن کو نتیجہ آفرینی کی طرف لاتی ہیں جب تک صحیح جواب نہیں آتا۔ بیتال مطمئن ہوکر اپنی شاخِ شجر کی طرف واپس نہیں لوٹتا اور جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے ان کہانیوں کی فضا سر تا سر ہندوی فضا نہیں ہے۔ ان کہانیوں میں تہذیبی محرکات اور مقتضیات کی پرچھائیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت اگر ارادۃً بعض ترجموں میں اسلامی عقیدہ اور خیال کے متعلق اصطلاحوں کو شامل نہیں کیا گیا مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیم شعوری طور پر اب یہ اصطلاحیں ہندو معاشرے تک بھی پہنچ رہی ہیں اور یہ آپسی میل جول ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ ہند ایران کلچر کی باہم آرائشوں اور آویزشوں کی تقسیم میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیتال پچیسی کی یہ کہانیاں کلیدی حیثیت سے شامل کیے جانے کا حق رکھتی ہیں۔

قصہ گُل بکاولی کا تہذیبی مطالعہ

تعارف

داستان ہماری زندگی کا واردہ بھی ہے اور ہمارے ذہن کا کرشمہ بھی۔ واردے کے طور پر ایک حقیقت ہوتا ہے اور کرشمے کے طور پر اس میں ایجاد اور اختراع کو شریک سمجھنا چاہیے۔ جو ایجاد اور اختراع ہے وہ ہماری زندگی سے الگ بہرحال نہیں ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہاں تخیل اور تمثیل کا عمل نسبتاً زیادہ برسرِ کار رہتا ہے اور جو کچھ سوچا جاتا ہے اس میں خلاقی کو بیش از بیش دخل رہتا ہے۔

کہانی سے انسان کا رشتہ کچھ اس طرح کا ہے کہ شروع ہی سے کہانیاں سنتا اور سناتا رہا ہے اور ایک وقت پر آ کر وہ جب لکھ لیا گیا اور تصویروں میں سجا دیا گیا تو حال و خیال کا ایک طلسم خانہ بن گیا بات ادھر سے ادھر آ گئی ایک قصہ دوسرے قصے میں شامل ہو گیا ایک خیال میں دوسرے خیال کا پرتو جھلکنے لگا اور ایک کہانی نے دوسری کہانی کا روپ اختیار کر لیا۔

گل و بکاولی کا قصہ اسی طرح کے قصوں میں ہے جو زماں و مکاں سے گذر کر نئے زماں و مکاں سے گذرتا ہے ایک جنم دوسرے جنم میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک کردار اپنے بطن سے دوسرے کردار کو جنم دیتا ہے۔

پورب کے شہریاروں میں زین الملوک ایک شہریار تھا۔ نہایت رعایا

پرور اور عادل و منصف اس کے چار بیٹے تھے ایک بیٹا خدا نے اور عنایت فرمایا دوسرے چاروں سے خوبیوں میں بڑھا ہوا تھا لیکن نجومیوں نے یہ قباحت بھی بتائی کہ بادشاہ کو اسے دیکھتے ہی بینائی جاتی رہے گی۔ علم نجوم پر اس سے قبل دوسری داستانوں کے مرطے سے تفصیل گفتگو آچکی ہے۔

۔دشاہ کے حکم پر وزیر بادشاہ کی گذرگاہ سے دور دور ایک محل شہزادے کی پرورش کے لیے بنوایا گیا اور پندرہ برس تک شہزادہ اس محل میں پرورش پاتا رہا اور علم و ہنر سیکھتا رہا۔ ایک دن شہزادے کی شکار کے لیے آرزو ہوئی وہ جنگل کو گیا ایک شکار کے پیچھے گھوڑا دوڑایا جاتا تھا قضارہ بادشاہ بھی ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالے اس طرف کو آنکلا جیسے ہی شہزادے پر نظر پڑی اس کی دنیا تاریک ہو گئی اور ہونے والی بات آخر ہو کر رہی اور ارکان دولت کو حکم دیا کہ اس کو ملک سے نکال دو اور اس کی ماں کی شفقت سے دور کر دو یہ نہ سوچا کہ یہ تو تقدیر میں لکھا تھا اسے ٹالا نہیں جاسکتا تھا اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی قدرت کے انعامات ہیں جیسا کہ نجومیوں نے بتایا تھا راجہ باغ عالم میں گل تازہ ہے۔ اس کے نصیب میں دولت دنیوی بے اندازہ ہے۔ صاحب ہمت اس جیسا بہادر کوئی نہ ہوگا۔ یقینی ہے کہ ایسا شہریار ہو کہ عالم جنات بھی مطیع اور فرمانبردار ہو۔"

تخت گاہ میں واپس آنے پر بڑے بڑے طبیبوں نے متفق ہو کر عرض کی کہ گل بکاؤلی کے سوا اور دوا سے علاج ممکن نہیں اس پر سارے ملک میں منادی کروا دی گئی کہ جو گل بکاؤلی پیدا کرے یا اس کی خبر لائے تو اس کو بہت سا انعام و اکرام دیا جائے گا۔

شہزادہ حضرت یوسف کی طرح خوبصورتی کے اعتبار سے بے مثال ہے مگر ان کے ساتھ اس قسم کی کوئی کہانی وابستہ نہیں۔ اس لیے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قصے میں اس طرح کا طلسمی پہلو کس لیے داخل کیا گیا ہے یہ صحیح ہے کہ اس

کے ذریعے قصہ آگے بڑھتا ہے اور یہی قصہ کی بنیاد ہے لیکن بیٹے کو دیکھ کر باپ کی آنکھیں جاتی رہیں اس کی کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اکثر کہانیوں میں کرداروں کے مابین ہرن موجود ہیں رام اور سیتا کے قصے میں بھی ہرگاوتی کی داستان میں بھی اور فسانۂ عجائب میں بھی ہرن موجود ہے اور اس قصے میں بھی ہرن موجود ہے اور اس قصے میں بھی ہرن ایسا کردار ادا کر رہا ہے جس کی وجہ سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

شکار کھیلنا امارت اور بادشاہت کے لوازمات میں سے ایک ہے۔ اور اس کا سلسلہ گویا ہمارے زمانے تک جاری رہا ہے۔

شہر بدر کرنے کا حکم اس دور کی معروف سزاؤں میں سے ایک ہے۔ کہانی لکھنے والے نے یہ بھی نہیں سوچا کہ شہزادہ اب جوان ہو چکا ہے اور اس کو ماں کے سایہ کی ضرورت نہیں ہے غالباً اس کی نظر میں ماں کے سائے کی ایک خاص اہمیت ہے۔ جو معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی اپنی ایک الگ اہمیت رکھتا ہے۔

اہل شہر کس علاقہ یا ملک کے لوگوں کو اطلاع کے لیے منادی ہی ایک ذریعہ تھا جس کو ڈھنڈورا پیٹنا کہا جاتا ہے۔

"نگر ڈھنڈورا پٹتی پر تب نہ کر یو کوئی"

پیچیدہ مرض کا علاج کسی خاص دوا سے ہو سکتا تھا جو دوا میں خاص طور پر کسی مخصوص مقام پر یا ملک میں ہوتی تھی مگر اس کو حاصل کرنا انتہائی مشکل کام تھا اس طرح کسی چیز کی تلاش کو قصے کے محرکات میں داخل کرنا اس زمانے کے بہت سے قصوں میں مل جاتا ہے۔ حاتم طائی کے قصے میں بطخ کے انڈے کے برابر دوسرا موتی تلاش کرنا ہے جو کسی عجیب و غریب شے کا حصول جس تک پہنچنا حد بھر مشکل بلکہ ناممکن بات ہو اس زمانے کا آئیڈیل ہے۔

جب اس کا کسی طرف کوئی سراغ نہ ملا اور بادشاہ نے رو رو کر اپنی آنکھوں کو حضرت یعقوب کی مانند سفید کر لیا اور اس غم نے اسے بڑی حد تک

کہہ دیا تو اس کے چاروں بیٹے آئے اور انھوں نے گل بکاولی کی تلاش میں جانے کے لیے رخصت چاہی اور اس خدمت کو عین سعادت جانا۔ بادشاہ نے کہا نورِ چشم کو کھو بیٹھے گا۔ داغِ جگر سے نہیں گیا چشم و چراغ کو برباد کس طرح ہونے دوں شہزادوں کے اصرار پر آخر بادشاہ نے چار و ناچار اجازت دے دی اور وزیر سے سفر کا سامان اور زادِ راہ تیار کرنے کے لیے کہا۔

تاج الملوک کو بادشاہ نے شہر بدر کر دیا تھا اور وہ مارا مارا دور تک نکل گیا اور انھیں اس ساز و سامان کے ساتھ جاتے دیکھ کر کسی سے پوچھا یہ کون ہیں اور کہاں جاتے ہیں" اس نے ان کا گل بکاولی کی تلاش میں جانا بیان کیا تاکہ بادشاہ کے اندھے پن کا علاج کر کے سرخ رو ہوں۔ یہ حقیقت جان کر تاج الملوک نے دل میں ٹھان لی کہ "میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔

یہاں بادشاہ کا رونا حضرت یعقوب علیہ السلام کے قصے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ شہزادے کے بھائیوں کا کردار بھی برادرانِ یوسف سے کچھ کم نہیں۔ لیکن وہاں حضرت یوسف کو دیس نکالا ان کے بھائیوں نے دیا تھا یہاں خود بادشاہ دیتا ہے مگر یہاں بادشاہ کا رونا کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن اس کا غم اس کو ضرور ہو سکتا ہے۔

ہر آدمی کو کچھ نہ کچھ جدوجہد اور قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ یہ رجحان تو خیر ہر زمانے میں رہا ہے لیکن بطورِ خاص جس بات پر توجہ دی جا سکتی ہے وہ شہزادوں کے لیے مقدر آزمائی کا تصور ہے جو بادشاہوں سے چلا آرہا ہے جنھوں نے اپنے زمانۂ شہزادگی میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور بادشاہت اور اقتدار پایا۔ علاؤالدین خلجی اس کی واضح مثال ہے۔

تاج الملوک اس ارادے سے سعید نامی ایک شخص کے پاس پہنچا اور اسے نہایت ادب سے سلام کیا سعید نے تاج الملوک کے رخسار اور اس کی پیشانی دیکھ کر اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔

تاج الملوک نے اپنے آپ کو محض ایک مسافر ظاہر کیا جو آشفتہ خاطر ہے غمگسارانہ کوئی یار نہ مددگار سعید تاج الملوک کی سلیقہ مند اور شائستہ گفتگو سے متاثر ہوا اور اسے اپنی رفاقت میں رکھ لیا اور روز بہ روز اس پر لطف و عنایت زیادہ کرتا۔

اس معاشرے کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ تقدیر جو ہے وہ پیشانی میں لکھی ہوئی ہے اور قیافے کے ذریعہ اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

چاروں شہزادے شہر فردوس میں پہنچے اور دریا کے کنارے خیمے نصب کیے تاکہ چند اور وہیں قیام کریں۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلے اور ادھر ادھر گھومنے لگے اتنے میں ایک خوبصورت محل نظر آیا دروازوں پر زردوزی کے پردے پڑے ہوئے تھے وہاں کے لوگوں سے معلوم کیا کہ یہ کس کا محل ہے۔ شہزادوں نے دریافت کیا ایسا محل کہاں سے پایا انھوں نے بتایا کہ یہ دلبر لسوا کا محل ہے۔ شہزادوں نے دریافت کیا ایسا محل کہاں سے پایا انھوں نے بتایا کہ یہ عورت اس زمانے میں یکتا ہے۔

ایک نقارہ مع چوب دروازے پر رکھا ہے جو کوئی جا کر اسے بجائے وہ محبت سے اسے گھر میں بلائے اور لاکھ روپے لے تب اس سے ملے۔

یہاں لسوا کو ایک رئیس اور دولت مند عورت کے روپ میں ظاہر کیا ہے جس کے متعلق اس زمانے میں بڑی بڑی ڈیرے دار اور دولت مند طوائفیں موجود تھیں یہاں دوسری بات یہ ہے کہ قصہ نگار نے شہر فردوس کا ذکر کیا ہے لیکن شہزادے دریا کے کنارے اترتے ہیں اور شہر میں داخل ہونے سے پہلے ایک لسوا کے محل تک پہنچے یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ نگار کے سامنے ایک روایتی شہر کے بجائے اس شہر کا تصور ہے جہاں شہر کے باہر بھی

محلات ہوتے تھے خود شہر میں کیا کچھ ہے اس کی طرف قصہ نگار نے کوئی اشارہ نہیں کیا ممکن ہے مغربی قوموں نے جس طرح نئے شہروں کی بنیاد ڈالی ہو اصل قصہ نگار کے سامنے اس طرح کا کوئی شہر ہو۔

اس کے ساتھ دوسری اہم بات نقارہ ہے امراء کے در دولت پر نقارہ رکھا رہتا تھا اور پانچ وقت نوبت بجتی تھی لیکن یہاں نقارہ اطلاع دینے کا ایک ذریعہ ہے جو ایک عجیب بات ہے اور یہ بھی ایک دلچسپ اور لائق توجہ ہے کہ کسبوا سے ملاقات کا نذرانہ ایک لاکھ روپے ہے سب سے زیادہ جس پہلو پر توجہ جاتی ہے وہ شہزادوں کا لشکر کے علاوہ بے پناہ دولت ساتھ لے کر چلنا ہے۔ جس کا تصور غالباً مغل لشکروں سے لیا گیا ہے۔

چونکہ شہزادے مال و دولت ضرورت سے زیادہ لیے ہوئے تھے اس لیے شوق ملاقات میں دروازوں میں پہنچ کر نقارہ بجا دیا۔ کسبوا اس فکر میں رہتی تھی کہ عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا آئے۔ جھٹ پٹ ہار سنگار کر کے بڑی آن بان سے بن ٹھن کر بیٹھ گئی شہزادے آ پہنچے۔ چند قدم استقبال کر کے انھیں سونے کی کرسیوں پر بٹھا کر شام کے سائے تاریک ہو جانے پر اور رات کا عمل دخل ہونے پر فانوس کی محفل جمائی۔ آدھی رات گزری تو تختہ نرد پر بازی کی اجازت چاہی کہ رات یوں بسر ہو شہزادے تو عقل کے اندھے ہوتے ہی تھے اس سے کیا بہتر ہے۔ وہ کہہ کر بازی کھیلنے بیٹھ گئے پر کسبوا نے مکاری کا سامنا کیا اور بلی کے سر پر چراغ رکھ دیا اور لاکھ روپے کی بازی بدی اور صبح ہونے تک آدھی رات میں انھوں نے پچاس لاکھ روپے ہار دیئے۔ صبح ہونے پر بازی پلٹی اور شہزادے اپنی قیام گاہ کو گئے۔

خاص ادارے کا احترام ختم ہو چکا تھا اس لیے کہ مصنف نے یہ لکھا ہے کہ چاروں بھائی ایک ساتھ کسبوا کے یہاں پہنچ گئے مزید برآں مصنف نے ان کے کردار پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ شہزادے عقل کے اندھے ہوتے ہیں اس کے علاوہ

یہاں دو تین باتیں بالکل نئی ملتی ہیں کہ طوائف کے محل میں ناؤ نوش اور تختہ نرد بچھا کر کھیلنے کا رواج ہے طوائفیں عام طور پر گانے بجانے اور ناچنے کی ماہر ہوتی ہیں اس کے ساتھ ان کو دوسرے شاہی ہنر اور فنون بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا دیکھنے میں نہیں آتا کہ ان کے یہاں چوسر، شطرنج یا اس طرح کی اور بازیاں کھیلی جاتی ہوں نیز یہ کہ جانے والے سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں بہت ممکن ہے کہ یہ ڈھیرادار طوائفوں کی طرح اس زمانے کی بڑی خانگاہوں کا کردار ہو۔

یہاں بلی کے سر پر چراغ رکھنا ایک طرح کی طلسم بندی ہے۔ اس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ ہار کی وجہ کیا تھی نیز یہ کہ آدھی رات میں کیا واقعی پچاس بازیاں کھیلی جا سکتی ہیں۔ جو پچاس لاکھ روپے ہارے گئے۔

شہزادوں کو بے وقوف ثابت کرنے کے لیے مصنف نے پھر یہ کہا کہ دوسری رات انھوں نے دس لاکھ کی بازی بدی اور کروڑوں روپیہ ہار گئے اس کے بعد دلبر کسبوا نے ان کی بے عزتی کی ان کو اپنا غلام بنا لیا۔ اس زمانے میں آدمی اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا تھا اور جب ہار جاتا تھا تو خود کو دوسرے یعنی جیتنے والے کی غلامی میں دیتا تھا بعض محاورے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ایسی اونچی کسبوا کے یہاں ایسا ہی اونچا سامان محفل ہونا لازم تھا۔ سونے کی کرسیاں سامان، شراب، ساغر زرنگار خوبصورت قندیلیں سونے چاندی کے خوان اور دوسرے بے شمار لوازمات، یا اونچے درجے کے شکار کو پھنسانے کے لیے ضروری ہی تھے اور پھر مکر کی بازی جیسی کہ کوروؤں نے پانڈوؤں سے کھیلی اور ان کا سب کچھ جیت لیا اس مکر کی بازی میں قسمت کو کچھ دخل نہ تھا۔ وہ تو ایک چال تھی جس سے جیتنا ہی لازم تھا۔

تاج الملوک نے کوئی ایسی تدبیر کرنے کے لیے سوچا جس سے بھائیوں کی رہائی ہو اس سے دنیا میں نام ہو اور آخرت میں اجر کے فراوان ہو۔

یہ دل میں ٹھان کر تاج الملوک شہر میں آیا اور ایک امیر کے یہاں جا کر کُل

کیفیت عرض کی۔ امیر دیکھتے ہی تاج الملوک کے اوصاف ظاہری سے متاثر ہو کر اپنی خدمت میں سرفراز کیا۔

اسی دوران تاج الملوک دلبر بسوا کی مدار دار ہے جس کے مشورے کے بغیر دلبر بسوا کچھ نہیں کرتی تھی تعلقات بڑھاتا ہے اور اس کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

بوڑھی عورتیں اکثر قدیم قصوں میں کٹنیوں کا روپ لے کر سامنے آتی ہیں یہاں بھی ایک ایسی بوڑھی عورت ہے جو دلبر بسوا کی محرم راز ہے اور سارے راز تاج الملوک کو بتا دیتی ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

مدار المہام بڑے گھروں کی ایک روایت بن چکا تھا آج بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں مگر پہلے یہ مرتبہ پایۂ اعتماد رکھتا تھا اور اس کا مشورہ ہر معاملے میں ضروری سمجھا جاتا تھا۔

کچھ روز یونہی گذرے اور جب تاج الملوک نے اس طرح مہربان پایا تو ایک دن ادھر ادھر کی باتوں میں کہا اے دادی صاحبہ تم کو معلوم ہے کہ جو کوئی اس بسوا کے ساتھ تختۂ نرد کھیلتا ہے اس سے بازی نہیں پاتا اس نے جواب دیا اور بڑھیا بولی اس نے ایک بلی اور چوہے کو پالا ہوا ہے اور انھیں سکھایا ہے کہ بلی کے سر پر چراغ رکھے تو وہ لیے رہے اور چوہا چراغ کے سایہ میں بیٹھا رہے جب اس کی خاطر پانسہ نہ پڑے تب بلی چراغ کو ہلا کر تختۂ نرد پر سایہ کرے چوہا اس کی حسب مرضی پانسہ الٹ دے اس لیے جو کوئی اس سے کھیلنے آتا ہے وہ بلی اور چوہے کی مدد سے بازی جیت لیتی ہے۔ یہ راز جان کر تاج الملوک نے بازار سے ایک نیولے کا بچہ مول لیا اور اسے آستین میں رکھ کر یہ سکھانے لگا کہ جیسے ہی چٹکی بجائے نیولے کا بچہ چیتے کی طرح آستین سے کود کر باہر آئے۔ جب نیولے کا بچہ چالاک ہو گیا تو ایک اور دن بڑھیا سے تاج الملوک نے کہا کہ میں نوکری سے عاجز آگیا ہوں اگر تو ہزار روپے دے تو تجارت کروں۔ اور تاج الملوک اس شان اور اس سج دھج سے دلبر بسوا کے دروازے پر گیا۔ تاج الملوک نے

کہا تو ایک مدت سے اس شہر میں مسافروں کی دم ساز رہی ہے اور عاشقوں کی ہمراز رہتی ہے اور میں اس شہر کے والی کا خواص ہوں کبھی مجھ سے رجوع نہیں ہوتی یہ حال لاکھ تحفہ یاروں کو بھی نظر کر۔

معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے والی کا خواص شہر کے ایسے لوگوں سے اس طرح رجوع اور توجہ رکھتا تھا یعنی وہ معاشرہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ مدت سے چلے آرہے معاشرہ کے یعنی معاشرے میں مقتدر طریقے کی اس دھاندلی کو عمل میں لاتے ہوئے تاج الملوک شہر کے والی کے خواص کی حیثیت سے سیدھا محل کے اندر چلا گیا۔ اور دستور کے مطابق نقارے پر چوب مارنے کی ضرورت نہ سمجھی

شہزادے نے اس کی آداب کی کوئی فکر نہیں کی اور اندر چلا گیا جب ایسا ہوا تو وہ اس سے خوف زدہ ہو گئی اور بے اختیار اٹھی اس طرح مصنف ــــــــــــــــ تاج الملوک کی امتیازی شخصیت کو بھی سامنے لانا چاہتا ہے جس میں بظاہر غیر معمولی جرأت ہے۔

شہزادہ بولا میں نے سنا ہے کہ تجھ کو تختۂ نرد کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ آ ایک بازی کھیلیں"۔ دلبر نے تختۂ نرد منگوایا اور بلی کے سر پر روشن چراغ رکھا۔ دلبر نے چوہے اور بلی ہی کی مدد سے بازی جیتی تھی۔ دوسری بازی پر پانسہ دلبر کے خاطر خواہ نہ پڑا تو بلی نے سر ہلا دیا چوہے نے پانسہ الٹ دینا چاہا۔ تاج الملوک نے چٹکی بجائی نیولے کا بچہ چیتے کی طرح اچھل کر باہر نکلا چوہا صورت دیکھتے ہی کافور ہو گیا اور بلی پر دہشت طاری ہو گئی اور چراغ اس کے سر پہ نہ رہا اسے پھینک پھانک کر جدا ہو گئی۔ شہزادے نے بگڑ کر کہا کہ "اے عیار تو نے یہ کیا طور بنایا ہے کہ تیرے یہاں گو ہر شب چراغ جلتے ہیں لیکن تو ایک شمع دان نہیں رکھتی۔

تختۂ نرد۔ چوسر یا شطرنج کی بازی اس دور میں عام تھی۔ شطرنج میں بہرے ہار اور جیت میں ایک خاص کردار ادا کرتے تھے۔ چوسر میں پانسہ جس طرف پلٹے وہی فیصلہ کن رخ ہوتا تھا۔ لیکن کہانی میں بات اس سے آگے بڑھ گئی ہے۔ مکاری اور عیاری کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں ایک چوہا ہے جو خاموشی سے پانسہ پلٹ دیتا ہے

اور ہار جیت میں پلٹ جاتی ہے۔ چوہا ہندو میتھلوجی میں چاند کا نشان اور گنیش کی سواری ہے گنیش جو عقل اور علم کا سمبل (SYMBOL) ہے۔ بلّی مکاری اور خاموشی سے ادھر ادھر ہو جائے اور چھلاوے کی طرح اس سے ادھر ادھر حرکت کرنے کے لیے ایک حیوانی پیکر تصور کی جاتی ہے۔ بلّی تھیلے سے باہر آگئی یہ ایک کہاوت بھی ہے اور محاورہ بھی۔ اسی طرح نیولا۔ سانپ کا دشمن ہے اور اس حالت میں بھی سانپ کو مار ڈالتا ہے جب سانپ اس کو اس پیٹ میں لے کر موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے۔ اس معنی میں نیولا طلسم اور سحر کا ایک توڑ ہے۔ جو شہزادے کی طرف سے استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کی کہانیاں ہندوستان میں خصوصیت سے رائج رہی ہیں کہ ہندوستانی تمدن میں جانور انسان کے ہر دور کے ساتھی رہے ہیں بلکہ جنم جنم ہیں اس کے شریک رہے ہیں اس لیے کہ انسان جون بدلتا ہے تو ایک کے بعد دوسری حیوانی شکل اختیار کرتا ہے۔ لال شب چراغ ایسے ہیرے جواہرات کو کہا جاتا تھا جو رات کے وقت چمکتے تھے یہ لال اگر جوتی میں لگا لیے جائیں تو اندھیروں میں راستہ دیکھا جا سکتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہاں وہ اس بات پر نہایت شرمندہ ہوئی اور جڑاؤ شمع دان منگوا کر رکھے اور پھر کھیل شروع ہو گیا۔ اس رات شہزادے نے سات کروڑ روپیہ جیتا اور کھیل شروع ہونے پر کہا اگر تو جیتے تو لاکھ روپیہ دوں نہیں تو میں شہزادوں کو بھی لے لوں۔ یہ بازی بھی شہزادے کے ہاتھ ہاری پھر وہ بولی ایک بار پھر اپنا نصیب آزماؤں گی اگر بازی جیتی تو سب ہارا ہوا مال پھیر لوں ورنہ تیری لونڈی ہو کر رہوں تاج الملوک کا ستارہ سب سے عروج پر تھا۔ بات کی بات میں وہ بازی بھی لے لی تو وہ کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے ہوئے بولی "اے جوان خدا کی مدد سے تو نے اپنی لونڈیوں میں ملا لیا۔ ستارہ بلند سے تو نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جس کے واسطے دنیا بھر کے بادشاہوں نے تمام عمر صرف کی اب مجھ کو اپنے نکاح میں لا اور باقی عمر دولت و مشقت کے ساتھ بسر کر۔

قصہ کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جب دلبر بیسوا ہار گئی تو اس نے نوعمر

شہزادے کی منکوحہ بن کر رہنا پسند کیا طوائفوں میں ایک خاص وقت پر ایسے جذبہ کا پیدا ہونا تو قرین قیاس ہے لیکن نوعمر شہزادے اور اس کی عمر میں تو بڑا فرق ہے اور شہزادے نے اس کو قبول کر لیا اس کی توجیہیں اس کے ماسوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس وقت کے شہزادے یا بادشاہ عمر کے فرق کو کوئی خاص اہمیت دینا نہیں چاہتے تھے اور یہ بھی گویا مصنف کے لیے ان کی شرافت کی نہیں بلکہ بے وقوفی کی علامت تھی۔

اس موقع پر شہزادہ اپنی مہم اور اپنے مقصد کا اس سے ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے میری واپسی تک تجھ کو بارہ برس انتظار کرنا ہے اور ایک طریقے سے زندگی گزارنی ہے۔ یہاں بارہ برس کا تخمینہ قابل لحاظ ہے اس لیے کہ بارہ کا عدد اس معاشرے میں مقدس بھی ہے اور ایک طویل مدت تک سختی اور ریاضت کی زندگی گزارنے کی طرف اشارہ ہے اس راہ میں کیا کیا دشواریاں ہیں وہ شہزادہ سے گل بکاولی کے محل اور طلسماتی قوتوں کے پیش آنے کا اس سے ذکر کرتی ہے یعنی وہ معاشرہ یہ سمجھتا تھا کہ کوئی مشکل کام آسانی سے نہیں اور دیو، جن اور پریوں کا ذکر اس لیے آتا تھا کیوں کہ اس دور کا ذہن اس سے زیادہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا ان تمام چیزوں سے وہ لوگ بڑی حد تک ڈرتے تھے اس لیے اس کا ذکر ایسے موقعوں پر کرتے تھے جہاں مہم جوئی پیش آتی ہو۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ نہ ڈالو ہاتھ ہلاکت کی طرف اور حضرت شیخ سعدی نے بھی فرمایا ہے کہ (ترجمہ) کوئی مرتا نہیں ہے بن آئی ایک تو اژدہے کے منہ میں مت جا۔ تاج الملوک نے تسلیم کیا اور کہا اگر میں عاشق صادق ہوں خود ثابت قدم اور میرے عشق کا جذبہ کامل ہے تو شاید مراد کے دامن تک میرا دست راست ہوگا۔ میرے چھوٹے سے قد پر نہ جاؤ۔ آدمی فہم و فراست میں زیادہ ہے اگر قوت میں دیو سے کمتر ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

کہ ہر آئینہ میں نے بزرگی دی ہے بنی آدم کو، اور برہمن اور شیر کی حکایت کہی۔

حق تعالیٰ کے لطف و عنایت کو کڑی سے کڑی مہم میں کامیابی کی بنیاد جانا جاتا تھا لیکن یہ بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ سچی لگن بدا ستقلال ثابت رہے اور عشق کا جذبہ کامل ہو۔ صاحب قرآن کے فرمان کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کا فرمان بھی نظر میں رکھا جاتا تھا کہ بنی آدم کو ہر ایک پہلو سے بزرگی حاصل ہے اور وہ فہم و فراست میں دیووں سے کہیں زیادہ ہے معاشرہ مہم جوئی میں دلچسپی رکھتا تھا اور جذبہ کی مستقل سعی کا قدردان اور معترف تھا۔

"یہ حکایت اس واسطے میں نے کہی،" تاج الملوک نے کہا کہ "توجان لو کہ طاقت جسمانی قوت روحانی پر زیادتی نہیں کرتی۔" اب ضروری ہے کہ تو سب شہزادوں کو چھوڑ دے

جو تیری قید میں پڑے ہیں حق تعالیٰ تجھ کو یعنی دوزخ کی قید سے نجات دے گا۔ اپنے بھائیوں کی اپنی واپسی کی ہر طرح سے نگہداشت کرنے کو کہا۔ اور اپنی مہم پر روانہ ہوا اگرچہ بھیوا دلبر نے بہت ہی بے تابی کا اظہار کیا لیکن اسے از راہ پسند کیا

جب اس کی آنکھ اس ناپاک خلقت پر پڑی تو اس کی بصارت کو زنگ لگا اور دیدۂ روشن تاریک ہو گیا۔ اب بینائی کا سرمہ ڈھونڈھ اور مراد کی تلاش کرو مگر نا کارہ دنیا کی راہ میں فریب کے تختے کی بازی میں مت کھو۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا تجھ کو فریفتہ بنا کر فریب کی بی اور مکر چوہے کی مدد سے تیرا سارا سرمایہ لے لے اور تیرے پاس توکل کی دولت نہ رہنے دے اور تجھے ہمیشہ قید کر رکھے۔ اگر صبر و توکل سے اس بازی طلسم کو درہم برہم کر دے تو دنیا جو بادشاہوں اور

---

[1] یہ حکایت مختلف طور پر کئی مقامات پر آئی ہے لیکن بنیادی مقصد میں فرق نہیں آیا اس سے کیا مراد ہے کہ قوت دشمن سے نیکی کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنی ہے نفس جسم کے اندر شیر پنجرے کے اندر کی مانند ہے جو اس کی بات سنے گا اور صبر و تحمل کی رسی کے بندھن اسے آزاد کر دے تو اپنا لقمہ بنائے صرف خضر ہی اسے بچائے تو بچائے (ع۔ ز)

مغروروں کی ہم نشیں ہے تیری فرمانبردار، لونڈی ہو کر تجھ کو چاہے کہ اپنے حسن و جمال پر ریجھائے اگر تو اسے الفت سے دیکھے تو گل مراد کے دامن تک دسترس ہو۔[1]

تخیل اور استعارہ میں بات کرنا اس وقت کے داستانی ادب کا ایک غالب رجحان بن گیا تھا۔ یہ معاشرے کی عکاسی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بات کہنے کا یہ انداز معاشرہ میں پسندیدہ خیال کیا جاتا تھا کیوں کہ معاشرے میں بہت سے تکلفات آ گئے تھے جو کسی حد تک بناوٹ کی حد میں پہنچ جاتے ہیں جو بعض طبقے کے لوگ اپنی شان و شوکت ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا کرتے تھے۔ یوں عام طور سے معاشرے میں صبر اور توکل کی نہایت اہمیت تھی

چوتھے باب (چوتھی داستان) کا آغاز پہلے باب (آغاز داستان) اور دوسرے باب (دوسری داستان) کے آغاز (وہ کہتے ہیں) سے کے بعد، راوی شیریں زبان یہ داستان یوں بیان کرتا ہے۔

تاج الملوک وہاں سے قلندرانہ ٹھاٹھ سے چلا کئی روز کے بعد ایک ایسی پر خار وادی میں داخل ہوا جس کی انتہا نہ تھی اور جہاں رات دن کی تاریکی میں فرق معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوئے مصیبتوں کے آتشکدہ میں ڈال پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ جیسے جیسے آگے چلتا تھا ہر قدم پہ آہ و نالہ کرتا تھا غرض اس پر خار دشت میں جو ظالموں کے دل سے زیادہ تاریک تھا مدت تک چاروں طرف دوڑتا رہا۔ آخر کار جنگ طے ہوا۔ آگے بڑھا سامنے ایک دیو پہاڑ دکھائی دیا اس نے دفعتاً اپنے قد کو بلند کیا اور بادل سا گرج کر بولا۔ کیا لقمہ

---

[1] مذہب عشق میں قصے سے ہٹ کر اور ان کے کئی بیانات ہیں جو ہر داستان میں دو تین جگہ آ جاتے ہیں ان میں دنیا کی ناپائیداری اور معرفت کے مضامین ہوتے ہیں۔ یہ قصے کو تخیل کا رنگ عطا کرتے ہیں۔ نثری داستانیں۔ ص ۲۳۱۔

لطیف خالق نے بھیجا ہے۔ اور پھر تاج الملوک سے مخاطب ہوا ایسی جوانی میں تجھے کس نے
لقمہ اجل ہونے کا مشتاق بنایا اور زندگی کی حلاوت کو مشاق کیا۔

بظاہر جاہلوں کے دل کو شب پر خار کی مانند تاریک جاننے والا معاشرہ تہذیبی اعتبار
سے روشن ہوگا اور علم اور عقل کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہوگی لیکن سچ یہ ہے کہ اس میں
تعقل پذیری سے زیادہ طبع زاد ذہنیت اور امتیاز پرستی کو بھی کافی دخل رہا ہے اور
چہرے کے رنگ کو پتنگ سا اڑتا دیکھنے والا معاشرہ مشاہدہ کی دقت پسندی کے نہایت
اعلیٰ معیار پر ہوگا زندگی کا اسقدر شاق ہونا کہ اس سے نجات پائے صعوبت سے چھٹکارا
پانے کے برابر جاننا ایک ساعت کو سو برس کی مشقت محسوس کرنا نہایت خستگی اور خرابی
کا پتہ دیتا ہے لیکن تاج الملوک کی جانب سے یہ اظہار اس کے عظیم عزم کی نشاندہی
کرتا ہے اور موقع شناس کی سوجھ بوجھ کا مظہر ہے۔

داستان نگار بالعموم اس کا خیال نہیں کرتے کہ جو کچھ انھوں نے کسی کے کردار۔
رفتار۔ گفتار کے بارے میں ایک بار کہا ہے وہ اس کو شروع سے آخر تک نبھادیں کیونکہ
بہت سے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اس لیے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ داستان کو صرف
موقع اور محل کی مناسبت سے کچھ باتیں کہہ دیتا ہے اور اس کا خیال نہیں کرتا کہ
یہ بات پہلی بات سے تضاد کا نہیں بلکہ اختلاف کا رشتہ رکھتی ہے۔ مثلاً دشت پر خار میں
وہ تاج الملوک کو آہ نالہ کرتا ہوا دکھلاتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کے تصورات اور
ان سے پیدا کردہ تصویریں بڑی حد تک ان میں اور ان کے پس منظر میں مجنوں کی دشت
نوردی کو بھی کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہا ہے مجنوں کے ساتھ آہ و نالہ کا تصور وابستہ ہے
اس لیے داستان نگار اس موقع پر تاج الملوک کو بھی مصروف آہ و نالہ ظاہر کرتا ہے
جو اس کے حوصلہ اور کردار کے خلاف ہے اس اظہار سے داستان مختلف موقعوں پر
سجائے ہوئے تصویر خانہ لگتی ہے گویا اس لیے وہ آگے چل کر شہزادے کے تلووں
کو پھول سے تلوے بھی کہتا ہے۔

تاج الملوک کی یہ درد بھری باتیں سنکر دیو کو اس پر رحم آیا اور حضرت

سلیمان کی قسم کھا کر بولا "اے آدم زاد میں تجھے ہرگز کوئی تکلیف نہ پہنچاؤں گا بلکہ اپنی پناہ
میں رکھوں گا۔ تاج الملوک اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے دل میں اترتا چلا گیا یوں
دن گزرتے چلے گئے۔

دیو حضرت سلیمان کو مانتے ہیں اور قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ جن جب
حضرت کی خدمت میں آئے تو انھوں نے واپس جاکر یہ ظاہر کیا کہ ایک ایسا پیغمبر آیا
ہے جو موسیٰ کی طرح ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت موسیٰ کو بھی مانتے تھے چنانچہ
یہ خیال بھی داستانوں اور کہانیوں میں ملتا ہے کہ جن حضرت سلیمان کے تابع ہیں
اور ان کی انگوٹھی کے نگینے سے مسخر ہوں گے۔ اس کا ذکر اس سے قبل بھی دوسری
داستانوں میں آیا ہے۔

ایک روز دیو نے مہربان ہوکر دریافت کیا "تیری غذا جو ہو اسے مہیا کروں"
تاج الملوک نے گھی شکر اور میدہ اور گوشت آدمیوں کی غذا بتائی۔" یہ معلوم ہونے
پر دیو گھی میدہ اور شکر سے لدے ہوئے اونٹ شہزادے کے پاس لے آیا ——
دیو نے وہ سب یکبار اپنے منہ میں ڈال لیا۔ ایسے کھانے کی لذت اس نے کبھی نہ چکھی
تھی اور بولا اس روٹی کے ٹکڑے کا احسان میں ابد تک نہیں بھولوں گا۔ تاج الملوک
اسے روز ہی یہ اور نئے نئے قسم کے کھانے کھلانے لگا ایک روز دیو خود بخود کہنے
لگا میں اس احسان کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ مجھ سے تیرا کوئی کام نہیں نکلا اگر کچھ
مطلوب ہو تو مجھ سے بیان کر۔

جب دیو میں احسان اور مہربانی کا احساس ہے تو معاشرے میں ضرور اس
سے کئی گنا ہوگا۔

اگر قسم کے بعد وہ مجھ سے نہ ہوسکتا تو مجھے مرنا پڑے گا آخر دیو نے قسم کھا ہی
لی اور تاج الملوک نے کہا کہ ایک مدت سے بکاولی کے ملک کا سودا ہے وہاں
پہنچادے۔ یہ سنتے ہی دیو نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے سر پر دو ہتڑ مار کر بے
ہوش ہوگیا کچھ دیر کے بعد ہوش آیا ہائے ہائے کرنے لگا اور بکاولی کے ملک

کی کیفیت کہنے لگا اور تو اور وہاں کے مقامی چوکیدار جو اس ملک کے نزدیک ہیں انھوں نے بھی اس شہر کی چار دیواری کو نہ دیکھا ہوگا۔ کسی جاندار کی کیا طاقت۔ صرصر بھی ان دیووں کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں کہ پہنچ سکے۔ پریاں رات دن نگہبان ہیں۔ کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ زمین کے نیچے چوہوں کے بادشاہ کی فوج اور سانپ بچھوؤں کا لشکر ہے کوئی سرنگ لگا کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں تجھے وہاں کیسے پہنچاؤں اگر نہ پہنچاؤں تو اس قسم سے اپنی جان سے جاؤں تو ایک کام کر کہ آج پھر اس طرح سے کھانا پکا پھر دیکھ کر پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا یعنی خدا کی قدرت پر یقین معاشرے کے لوگوں کے رگ و ریشے میں اترا ہوا تھا۔ اور خدا کی قدرت ہی پر بھروسہ ہے جو داستانوں میں بے سر و سامان لوگوں کو دشوار ترین مہموں میں کامیاب کرتا ہے۔ ساز و سامان بہت دور تک ساتھ نہیں دیتے جیسے چاروں شہزادوں کے مال و دولت نے پہلی ہی منزل میں ساتھ چھوڑ دیا تھا اور تاج الملوک بالکل ہی بے دست تہی دامن مہم کو سر کرنے کا اہل بنتا چلا جاتا ہے۔

اس کے بعد جس طرح دیو نے بکاولی کے شہر محل اور پھول کی حفاظت کا ذکر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہی محلات کے تحفظ کا یقین کس طرح دیا جاتا اور اس پر کس حد تک نگرانی ہوتی تھی کہ کوئی غیر نہ آنے پائے یہ محاورہ کہ پرندہ پر نہ مارنے پائے اس کی نمایندگی کرتا ہے۔ عام طور پر جنوں بھوتوں کے ساتھ جو کرداروں کی رہائش کا ذکر جس طرح کیا جاتا ہے اس کو طلسم بندی یا مافوق الفطرت عناصر کہا جاتا ہے وہ صرف کہنے کے لیے مافوق الفطرت ہیں ورنہ ان میں بہت کچھ ہوتا ہے جو اس زمانے کی شاہی شہری زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔

دیو کے کہنے سے اس نے پھر اس دن کی طرح کھانا اور کباب تیار کیا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے ایک چنگھاڑ ماری اور ایک پہاڑ سا دیو آ پہنچا دونوں نے ایک دوسرے کی دست بوسی کی۔

اس آنے والے دیو کی ایک بہن تھی حمالہ اس کا نام تھا وہ ملک بکاولی کے اٹھارہ ہزار چوکیدار دیووں کی سردار تھی اس کو اس نے ایک خط لکھ کر دیا کہ اس آدم زاد کو ایک مدت سے بجائے فرزند کے پرورش کیا ہے۔

معاشرے میں محل سرا کی حفاظت کے لیے جو فوج رکھی جاتی تھی اکثر کسی عورت کو ان کا حاکم اعلیٰ بنایا جاتا تھا یہاں بھی وہی ضرورت ہے اور حمالہ اٹھارہ ہزار پریوں کی سردار ہے۔

تاج الملوک کو قاصد کے دائیں ہاتھ پر بٹھا دیا اور داہنے ہاتھ پر سایہ کیا اور اس قاصد دیو نے اس کو بخیریت تمام منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ حمالہ نے کچھ دور سے سلام کیا اور شہزادہ خط سمیت حاضر کیا وہ بہت خوش ہوئیں اور قاصد سے بولی آؤ بھائی مجھ کو سرخ گندک کی کان بھیجتے یا انگوٹھی حضرت سلیمان کی تو میں اتنا خوش نہ ہوتی جیسا کہ اس کے آنے سے خوش ہوئی پھر اس نے خط پڑھ کر احوال معلوم ہونے پر مجھ کو ایک ایسی بستی میں جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں ایک بادشاہ زادی نہایت خوبصورت میرے ہاتھ لگی اس کو بیٹی کی طرح پرورش کیا ہے اور محمودہ نام رکھا ہے وہ چودہ برس کی چودھویں رات کے چاند جیسی ہے۔ کارساز نے اس طرح سے جوڑا بھیج دیا زیادہ شوق ملاقات۔ اس خط کے ساتھ نامہ بر کو رخصت کیا اور پھر تاج الملوک کو محمودہ کے ساتھ بیاہ دیا۔

اکثر و بیشتر قصے کہانیوں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ آدم زاد سے دیووں کو رغبت ہوتی رہی ہے اور وہ بھی مادری اور پدری محبت کا جذبہ رکھتے ہیں وہ انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔

داستانوں میں جہاں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں وہاں کچھ ایسے مرحلے بھی ہوتے ہیں جو بے اختیار دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور پیروں میں گویا زنجیریں ڈال دیتے ہیں لیکن داستان کا ہیرو جہاں پہلے مرحلے کو خفیف سی دشواریوں کو حوصلہ اور ہمت سے پار کرتا ہے وہاں خوشیوں کے مراحل بھی اس کے پیر کی زنجیر نہیں بنتے

اور وہ پھولوں کے جال کو توڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے دکھلانا یہ ہوتا ہے کہ اصل مقصد تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا کبھی کوئی دشواری راستہ میں سنہری جال بچھاتی ہے۔ ان دونوں سے گزر جانا ضروری ہوتا ہے۔

صبح کو حمالہ دونوں کو خواب گاہ سے باہر لائی اور داہنے بائیں زانوں پر بٹھا کر بزرگانہ شفقت اور مادرانہ انصاف کرنے لگی۔ محمودہ سرو قد کھڑی ہو کر آداب بجا لائی۔ اور بولی میں کچھ گزارش کرنا چاہتی ہوں۔ حمالہ نے سر اور آنکھوں کو چوم کر کہا کہ بے تکلف کہو۔ محمودہ بولی کہ یہ بکاولی کا ملک دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جیسے بھی ہو ان کو وہاں پہنچاؤ۔ پہلے تو حمالہ نے حیلے کیے آخر ناچار قبول کیا اور دیوؤں کے بادشاہ کو لا کر کہا کہ یہاں سے بکاولی کے باغ تک سرنگ کھود کر شہزادے کو اپنی گردن پر سوار کر کے اس باغ میں پہنچا دو۔ لیکن اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسے اپنی گردن سے نیچے اترنے نہ دیجیو۔

سونے کی زمین پر سونے کی چاردیواری میں لعل بدخشاں اور عقیق یمانی جڑے ہیں۔ زمرد کے حصوں کے آس پاس فیروزے کی نہریں گلاب سے بھری ہوئی جاری ہیں۔ دیکھنے والوں کو چاروں طرف شفق پھولی ہوئی نظر آئے پھولوں کی سرخی ایسی کہ آفتاب کا گل سرخ شرمندگی کے مارے پسینہ میں ڈوبے۔ وہاں کی ہوا ایک شے اپنے مقابل کے رشک کو بڑھاتی تھی۔ جیسا کہ پریوں کا دیس عجیب اور انوکھا تصور کیا جاتا ویسے ہی وہاں کی چیزیں تھیں۔ یہاں مبالغہ بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہی سمجھا جاتا ہے واقعی سب کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اگرچہ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن پریوں اور دیو کو ہمیشہ سے فوق فطرت خیال کیا جاتا رہا ہے پھر بھی یہاں کی اشیا کی بیان میں مصنف یا مترجم نے حد سے زیادہ غلو کیا ہے جیسے وہاں کے پرندوں کی صدا آسمان کے کان میں پڑے تو پھرنے سے باز رہے اگر زہرہ سنتی تو فی الفور وجد میں آکر ناچتی ہوئی زمین پر گر پڑتی

تاج الملوک یہ رنگ دیکھتا بھالتا قدم بڑھائے چلا جاتا تھا کہ ایک دلان

دلان یاقوت کا اور اس کے سامنے زبرجد کا اور بیچ میں ان کے ایک حوض گلاب سے بھرا ہوا اس کے اطراف کی ناندوں میں جواہر خوش آب کے کھلے ہوئے اور اس میں ایک پھول نہایت نازک خوشبودار کھلا ہوا نظر آیا۔ تاج الملوک نے آثار قرائن سے دریافت کیا کہ گل بکاولی یہی ہے فوراً کپڑے اتار کر حوض میں اترا اور گل مقصود لے کر کنارے پر آ گیا۔ پوشاک پہنی اور اس کو کمر میں باندھا پھر محل کی سیر پر متوجہ ہوا۔ آگے بڑھتے ہی ایک قصر عقیق یمانی نظر آیا۔ دروازے اس کے بلور کے پڑے ہوئے تھے یہ بیتابانہ اس کے اندر بے دھڑک چلا گیا۔ تاج الملوک وہاں کی سج دھج دیکھ کر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ دیکھتا ہے کہ ایک جڑاؤ پلنگ پر دبلی پتلی نازنین مست خواب ہے۔ بال بکھرے ہوئے کاجل پھیلا ہوا انگیا مسکی ہوئی کرتی کھسکی ہوئی۔ پائجامہ چڑھا ہوا لچھا ازاربند کا لٹکا ہوا۔ ناز سے ماتھے پر ہاتھ رکھے ہوئے جوانی کی نیند میں بے خبر سوئی ہے۔ اس کے رخسار روکشش سے زمین و آسمان نورانی آئینہ مہر و ماہ کو حیرانی اور اس کے چشم سیاہ مست نرگس کو مدام پریشانی لب نازک کے رشک سے لالہ خون میں غلطاں اور ابروئے خمدار کی چاہ سے ہلال نزار و ناتواں بہار چمن اس کے غنچۂ دھن سے کوئی صرف نہ سنے تو اطفال شگوفہ کھولنے کا سبق نہ دے سکے۔ اگر زنگی شہر اس کی زلف مشکیں کے سایہ میں آئے تو آفتاب کی تیز شعاعوں سے مارا جائے۔ تاج الملوک دیکھتے ہی بیخود ہو کر گر پڑا۔

باغ اور ایوان اور ان کی آرائش محل شہنشاہوں کے باغات اور محلات جیسے ہی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہاں سونے کی زمین سونے کی چاردیواری اور اس لعل بدخشانی اور عقیق یمانی جڑے ہوئے زمرد کی تھیتوں کے آس پاس فیروزے کی نہریں ایسی ہی اور عجوبہ کاریاں ہیں۔ ایوان میں ایک قصر عقیق یمانی جس کے دروازے بلور کے بنے ہوئے اور ہم پہلوئے آسمان ایک دالان عقیق کار چوبی پردوں کے ساتھ ایک دالان صرف یاقوت کا اس کے سامنے زبرجد کا اور بیچ میں ان کے ایک حوض گلاب سے بھرا ہوا۔ بکاولی کی جو تصویر

کشی کی گئی وہ ایک محو خواب شہزادی ہی کی تصویر ہے صرف مبالغے اور اس میں غلو کے ساتھ۔ اس لیے کہ پریوں کے بادشاہ کی شہزادی ہے۔ سازو سامان اور حسن و رعنائی بھی ویسی ہی ہونی چاہیے ورنہ تاج الملوک خود شہزادہ تھا وہ کیوں دیکھ کر اور سحر زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ہوش آنے پر تاج الملوک سرہانے تک پہنچا اور اس نے دل میں تجویز کیا کہ یہاں اپنے آنے کی نشانی چھوڑ جانا چاہیے۔ اس خیال سے بکاولی کی انگوٹھی نہایت آہستگی سے اتار لی اور اپنی انگوٹھی پہنا دی اور بہ حالت خواب رخصت ہو کر سرنگ کی راہ سے حیرے پر سوار ہو کر حمالہ کے یہاں واپس جا پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی حمالہ خوش ہو اٹھی اور دن ہنسی خوشی کٹا رات ہونے پر تاج الملوک بڑی امنگ کے ساتھ رنگ محل میں گیا اور محمودہ سے ہم کلام اور ہم کنار ہوا اور اس طرح چند روز گزار کر بسوا دلبر کے یہاں محمودہ کو ہمراہ لے جانے کا خیال ہوا۔

چھٹے باب (داستان) کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے کہتے ہیں کہ ایک رات تاج الملوک محمودہ سے خلوت میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا اے مایۂ عیش و شادمانی اگرا س جگہ سب طرح کی خوشی ہے اور کسی طرح کا رنج و غم نہیں ہو وقت جو اسباب نشاط چاہیے وہ سب موجود ہے لیکن کب تک ہم وطن اور ہم جنسوں سے دور رہیے اور کہاں تک دوستوں کی جدائی کا غم سہیے کچھ تدبیر ایسی کرنا چاہیے کہ اس مجلس ناجنس سے رہائی ملے اور دشمنوں کے پنجے سے چھوٹ جائیں۔"

اس کے بعد محمودہ اور تاج الملوک حمالہ سے اجازت لے کر واپس دلبر بسوا کے پاس آئے ہیں اور حمالہ دونوں کو اپنے سر کے بال دیتی ہے اور کہتی ہے ان کو جلانا

دیو نے آن کی آن میں شہر فردوس میں دلبر بسوا کے باغ میں جا اتارا۔ تاج الملوک

نے ساری سرگذشت کہہ سنائی دلبر اٹھی اور محمودہ کی بہت سی دلا آزاری اور مہمان نوازی کی چند روز قیام کے بعد شہزادے نے اپنے ملک جانے کا ارادہ کیا تاکہ بکاولی سے بادشاہ کی آنکھیں روشن ہوں۔ کیا حکم ہے تاج الملوک نے دلبر سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں بھائیوں کی سفارش کروں گا لیکن تو قبول نہ کرنا جب تک وہ تیری مہر کا داغ اپنے چوتڑوں پر لینا نہ مان لیں۔

تاج الملوک فقیروں کے بھیس میں اپنے بھائیوں کے پیچھے پیچھے چلا جہاں وہ ٹھہرے وہیں وہ بھی جا پہنچا ایک کونے میں بیٹھا اور ان کی شیخیاں سنتا رہا وہ بھائیوں کے سامنے آکر بولا بیہودہ باتیں کیا کہہ رہے ہو۔ گل بکاولی میرے پاس ہے اور وہ کمر سے کھول کر انھیں دکھایا انھوں نے آزمانے کو کہا اور سچی بات نہ ہونے پر من چاہی سزا دینے کی ٹھہرائی اور ایک اندھے کو بلا کر اس کی آنکھوں میں پھول ملا وہ فوراً سُجا کھا ہو گیا اس پر وہ چاروں نادم ہوئے اور وہ پھول ان سے زبردستی چھین کر اسے وہاں سے نکال دیا اور خوش خوش وطن کی راہ لی۔ گل بکاولی آنکھوں پر ملتے آنکھیں تارا سی روشن ہو گئیں دیدہ ظاہر روزدیدہ باطن دونوں منور ہو گئے۔

بھائیوں کے کردار پر اس سے قبل گفتگو کی جا چکی کہ وہ برادران یوسف کی عکاسی کرتے ہیں اور اسکے علاوہ کئی قصّوں میں بھائیوں کے کردار کو برادر دشمن ہی نہیں بلکہ برادر کش کے انداز میں پیش کیا گیا ہے شاید مغلوں میں برادر کش کی جو رسم تھی اس سے بھی ذہن متاثر رہتے ہوں اور اس تاریخی روایت سے بھی کہ بھائیوں کے ساتھ اس کے بھائیوں نے بہت ہی دشمنانہ برتاؤ کیا۔

اس خوشی میں بہت بڑا جشن ہوا اور منادی کروا دی گئی کہ ہر ایک امیر اور فقیر عیش و عشرت کا دروازہ سال بھر کے لیے کھولے اور غم کے لیے دروازے بند رکھو۔

شاہی جشن اور جلوس کے موقع پر بیشتر آراستہ کیے جاتے تھے اور یہ خواہش کی جاتی تھی کہ عوام بھی ان خوشیوں میں شریک ہوں۔ اگر بازاروں اور

چوراہوں پر چراغاں کیا جاتا ہو تو کوئی تعجب بات نہیں کہ اس کی رسم بھی قدیم سے چلی آرہی تھی۔ رام لیلا، محرم، ادجھاؤ اور دوسرے موقعوں پر مذہبی یا غیر مذہبی جلوسوں کو دیکھنے کے لیے آج بھی شہروں میں ہزاروں لاکھوں آدمی اکٹھے ہو جاتے ہیں یہی صورت قصبوں اور گاؤں میں بھی ہوتی ہے۔

آٹھویں باب (داستان) کا جس میں بکاولی کے جاگنے اور گلاب کے حوض میں گل کو دیکھنے اور گل کے چوری کی تلاش میں نکلنے کے بیان ہے آغاز داستان اس رومانی انداز سے کیا جاتا ہے۔ "خم خانہ سخن کا ساقی اس پرانی شراب کو نئے پیالے میں یوں بھرتا ہے۔" یعنی لوٹ کر پریوں کے دیس میں پہنچتا ہے اور وہاں کے ہنگاموں کا بیان کرتا ہے۔

بکاولی نے جاگتے ہی انگیا کرتی درست کی اور پشواز پہنی اور بالوں کو سنوارا دوپٹہ اوڑھا اور آہستہ آہستہ جھومتے ہوئے حوض کے کنارے جا پہنچی۔ رخساروں پر گلاب ڈالا اور حوض کو ———— دیکھنے لگی گل کی جانب نظر کی تو اسے وہاں نہ پاکر اس کے چہرے پر زردی چھائی اور غنچے کی مانند سموم غم میں کملا گئی۔ اتنے میں انگوٹھی پر نگاہ پڑی۔ بے چینی اور زیادہ بڑھ گئی۔ سوچا کہیں خواب تو نہیں دیکھتی دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملیں۔ مگر علامتوں سے جان لیا کہ یہ کام انسان کا ہے کسی دوسرے کی طاقت کہاں اٹھارہ ہزار دیووں سے بچ کر یہاں پہنچے اور گل مقصود بے کھٹکے جاتے اس کے ساتھ اسے اپنے محو خواب ہونے کی حالت یاد آئی تو شرم میں ڈوب گئی پھر افسوس کرتی ہوئی یاقوت کے مکان میں جا بیٹھی۔

جب ہم کہانی کے اس حصے کو پڑھتے ہیں تو تہذیبی مطالعہ کے اعتبار سے دو تین باتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ امرا کے محل کیسے ہوتے تھے شہزادیاں اور وزیرزادیاں کس طرح کے لباس پہنتی تھیں اور یہ کہ شاہی محلات اور شہری حویلیوں میں حوض اور نہریں بڑے بڑے گھروں کے صحنوں میں بنی ہوئی

تھیں۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لال قلعہ میں خود نہر بہشت موجود ہے اور گل بکاولی میں پانی میں کھلا ہوا بکاولی کا پھول بھی ہے۔ پانی میں کھلنے والے پھولوں کا تصور ہندو کہانیوں سے لیا گیا ہے خود بکاولی بھی ایک ہندو کہانی ہے۔ وہاں جو حوض ہوتے ہیں ان میں تازہ کمل کھلے رہتے ہیں مسلمانوں کے محلات میں ایسا عام طور پر نہیں ہوتا تھا ایک اور پہلو انگوٹھی کا بدلنا ہے اور خود اپنی انگوٹھی کا بدلنا ہے اور خود اپنی انگوٹھی پہنانا ہے جو یادگار کے طور پر تھا آج بھی منگنی کے وقت لڑکے کی طرف سے لڑکی کو انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔

جس طرح چوری چھپے تاج الملوک وہاں گیا ہے اور گل بکاولی چرا کر لایا ہے اس سے ہم یہ خیال کر سکتے ہیں شاہی محلات تک اول تو دوستوں کی رسائی ہوتی ہی نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تو خود محل کے محافظوں کی سازشوں سے ہی ممکن ہوتی تھی۔

معاشرے میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے بیے یقین اتنا بڑا ہوا تھا کہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جو کام پریوں، دیووں اور جنوں سے نہیں ہو سکتا وہ انسان کر گزرتا ہے۔ یعنی وہ عقلی حربوں میں دوسری ساری مخلوقات سے برتر و بالا ہے۔ اور یہ نسائی نفسیاتی احساس کہ کوئی غیر اسے بے حجابی میں دیکھے عورتوں میں نہیں پریوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کا علم ہونے پر کہ کس نے اسے بے حجابی کی حالت میں دیکھا ہے خود اپنے لیے باعث شرم ہوتا تھا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شرم و حیا معاشرے کا ایک اہم جزو تھیں۔

پریوں کو بلایا اور ہر ایک کو بے شرمی کی سزا دینے لگے اس کا خیال نہیں ہوا کہ جب تقدیر کا تیر چلے تو کوئی سپر کام نہ آئے ملکہ پریوں کو سخت تاکید سے حکم دیا کہ چور کو جلد از جلد حاضر کرو۔

اس حکم پر سات سو پریاں چہار طرف دوڑیں لیکن کہیں بھی نشان نہیں پایا کہ جب تقدیر کا تیر چلے تو کوئی سپر کام نہ آئے ملکہ پریوں کو سخت۔ "بے نشان کا وہ نشان پائے جو اپنے آپ کو بے نشان بنائے۔

یہاں جو پریوں کا لشکر ہے وہ محلات شاہی میں باندیوں، کنیزوں زرخرید لونڈیوں اور اداریے بیگمات میں شامل دوسری عورتوں کی ایک بڑی تعداد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ویسے تو یہ کہانی کوئی رمزیہ کہانی نہیں ہے لیکن کہیں کہیں داستان نگار فلسفہ تصوف کا سہارا لیتا ہے ایسا ایک موقع پر اس بیان میں بھی سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ "بے نشان کا نشان وہ پاوے جو خود کو بے نشان بننے دے" یعنی حقیقت مطلق تک رسائی اور ہماری حقیقت سے گزر کر ہی ممکن ہے۔

بکاولی عشق کے تیر سے گھائل ہو چکی تھی شرم و حیا کا رشتہ توڑ کر دل کے چور کی تلاش میں نکلی جہاں جاتی کہیں نہ پاتی ہر ایک کو دیکھ کر پرکھتی اور جانچتی پھرتے پھراتے بہروپ دیس میں جا نکلی جب زین الملوک کے شہر میں داخل ہوئی تو دیکھا ہر طرف عیش و عشرت کا دور دورہ ہے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو پندرہ سولہ برس کا دیدارو جوان بنا لیا اور کسی سے پوچھا اس تمام خوشی کا کیا سبب ہے اس نے بتایا کہ یہاں کا بادشاہ قضائے الہی سے اندھا ہو گیا تھا اس کے بیٹے گل بکاولی لائے ہیں جس سے بادشاہ کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ حکم عام ہو گیا کہ سب چھوٹے بیٹے دروازوں پر نوبت رکھیں بکاولی نے مراد پائی توقع ہوئی کہ وہ فتنہ انگیز اغلب ہے ہاتھ لگے۔ یہ سوچ کر دریا کے کنارے پہنچی نہا دھو کر راہ کی ماندگی دور کی مردانہ پوشاک پہن شاہی محلوں کا راستہ اختیار جو دیکھتا پیچ و تاب میں مبتلا ہوتا اور جو سامنے آتا ——— دنیا و ما فیہا سے بے خبر ہو کر جاتا شہر میں اس کے حسن و رعنائی کے چرچے عام ہو گیا۔ بادشاہ کے کانوں تک یہ خبر جا پہنچی تو ارشاد ہوا اس جوان کو ہمارے پاس لاؤ۔ وہاں پہنچنے پر بادشاہ نے پوچھا کون ہو کہاں سے آئے ہو آنے کا مقصد کیا ہے جواب دیا وطن پچھم ہے نام فرخ ہے نوکری کی تلاش میں پھرتا ہوا ادھر آنکلا ہوں امید کرتا ہوں حضرت کے ملازموں میں سرفراز ہوں اور دعائے دولت میں

حاضر جمع سے مشغول رہوں۔ بادشاہ نے خواصوں میں ممتاز حیثیت دی۔

اس سے قبل اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے جشن صحت منایا جا رہا ہے تو یہ بھی حکم ہے تمام چھوٹے بڑے دروازوں پر توپ رکھی جائے اور نوبت بجنے کا رواج اب سے کچھ زمانے پہلے تک رہا ہے اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے یہاں داستان نگار ہر ایک دروازہ کی بات کرتا ہے یہاں اس سے مراد عام لوگوں کے گھر اور دروازے نہیں بلکہ چھوٹے بڑے امرا کی ڈیوڑھیاں ہیں۔

شہزادی نے اپنا لباس بدلا اور ایک نئے انداز سے کھوج شروع کی کہانیوں میں جون بدلنے تک کی روایت موجود ہے اور لباس بدل کر تلاش کرنا تو بہت سی کہانیوں میں عام طور پر مل جاتا ہے اس میں لڑکیاں یا شہزادیاں لڑکوں کا لباس بھی زیب تن کرتی ہیں کبھی کبھی مرد بھی دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے زنانہ لباس پہنتے ہیں۔

تھوڑے دنوں کے جب چاروں شہزادے بادشاہ کے حضور میں آئے بادشاہ نے شفقت کی اور کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا بکاولی نے کسی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے بیٹے ہیں۔ بکاولی نے ہر ایک کا بغور جائزہ لیا کسی کو گھر نہیں بلایا بکاولی نے دریافت کیا کوئی اور بادشاہ کا بیٹا ہے جو ان کے ساتھ گل بکاولی لینے گیا تھا معلوم ہوا کہ کوئی نہیں۔

تاج الملوک گل بکاولی چھنوا کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا لیکن ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا اپنے باپ کی سرحد میں درندوں سے بھرے جنگل میں پہنچ کر حمالہ کے دئے ہوئے بال کو چقماق سے آگ پیدا کر کے اس پر رکھا مشکل سے بال چوتھائی چلا تھا کہ حمالہ اٹھارہ ہزار دیوؤں سمیت آ پہنچی۔ تاج الملوک کو ایسی حالت میں دیکھ کر غصے سے بھڑک اٹھی اور پوچھا میری بیٹی کو کیا کہا اور یہ حال کیا ہے۔

تاج الملوک کے جواب دیئے سب طرف سے خیریت ہے لیکن ایک کام آ پڑا اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی اور پھر عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں ایک محل اور باغ تعمیر ہو۔ بالکل بکاولی کے قصر اور باغ جیسا تم جس طرح

جائو جلد بناؤ حمالہ نے اس وقت دیووں کو لعل و بدخشاں عقیق یمانی۔ سونے روپے اور بیش قیمت جواہرات کے لیے دوڑایا تین دن میں سارا سامان جمع ہوگیا۔ جیسے تاج الملوک بتاتا جاتا تھا ویسے ویسے محل اور باغ بنائے جاتے اور تھوڑے دنوں میں ویسا ہی قصر اور باغ جڑاو ـــــــ درختوں سمیت تیار ہوگیا۔

بال جلانا جادو ٹونے کا مقصد رہا ہے اس لیے ایسا بھی سوچا جاتا تھا کہ جوان لڑکیوں کے بال ادھر ادھر پھینکے جائیں تصویر تعویذ گنڈوں کے لیے ایسا کہا جاتا تھا اور مطلقہ لڑکی کے سر کا بال منگوایا جاتا تھا اس سے آگے بڑھ کر داستانوں میں بال جلانے کے ساتھ دیووں پریوں کی حاضرات کا تصور وابستہ ہوگیا جنوں اور بھوتوں کو بلانے کے لیے اب سے کچھ زمانے پہلے کہ فلیتے جلائے جاتے تھے اور جنات کے بڑے اثر سے محفوظ رہنے کے لیے دائرے کھینچ دئے جاتے تھے جس کو حصار کہتے ہیں انگوٹھیوں تعویذوں کے ساتھ بھی حاضرات کا تصور وابستہ رہا ہے۔

جنگل میں منگل ہونا محلوں کی حد ہماری زبان ادب اور معاشرے کی روایت بن گیا ہے بعض عمارتوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ انھیں ایک رات میں جنات نے تعمیر کیا تھا اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جتنے وسیع پیمانے پر کوئی ایسی شاہی عمارت بنی تھی وہ عام لوگوں کے دائرے خیال میں نہیں آسکتی وہ یہ کہتے تھے یہ جنوں کا کارنامہ وہ اتنے بڑے بڑے پتھر اٹھاکر لا سکتے ہیں اور انھیں کے ہاتھوں ایسے بڑے جواہرات کا حصول ممکن ہوسکتا ہے درا صل یہ شاہی عمارت اور نہایت بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ شاہی محلات کی تعریف ایک اندازہ تھا یہاں بھی محل تعمیر ہوتا ہوا دکھلایا ہے اس کی ایک سہ دری یاقوت ہائے رمانی سے آراستہ ہے اور دوسری نیلم سے سجی ہوئی ہے ایک بات قابل ذکر ہے کہ وہاں اٹھارہ ہزار دیو ہیں معلوم نہیں کہ اٹھارہ ہزار کی یہ تعداد کیوں اور کس بنیاد پر مقرر کی گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹھارہ ہزار کو ایک روایتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے مخلوقات عالم کو بھی اٹھارہ ہزار سے

مانا گیا ہے۔

"اس کے یہ عالم ہیں ہشدے ہزار"

اس واقعہ میں ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ہے اور وہ تاج الملوک کا مصیبت میں پھنس کر دیونی کو بلانا ہے یہ معاشرہ تخیلی اور تمثیلی انداز سے سوچنے کا عادی تھا اور اکثر افراد یہ بیان کرتے تھے کہ غیب سے کوئی ظاہر ہوگا اور کام ہوجائے گا۔ یہ درا صل تقدیر پرستی کے رجحان کا اثر ہے ۔ عقل تدبیر۔ فکر و جہاں سے زیادہ وہ طبقہ تقدیر غیبی امداد اور ان دیکھی قوتوں پر اس حد تک ایمان رکھتے تھے کہ جب ان سے کچھ نہ ہوگا تو کوئی اور غیب سے نمودار ہوکر ان کی مشکل حل کر دے گا۔

مدد تو غیب برون آباد کار ہا کند

اس کا دامن ہوائے روزگار سے گرد آلود ہو۔ حمالہ کے چلے جانے کے بعد تاج الملوک محمودہ اور دلبر کو بڑے ٹھاٹھ سے جڑاو سواری میں لے آیا بالکل ایسے جیسے شاہی جلوس ہو اور عیش و عشرت سے اوقات بسر کرنے لگا۔

دسواں باب آغاز کرتے ہوئے ایک اور انداز اختیار کیا گیا ہے۔ معمار شیریں سخن کارخانہ داستان کے بنانے کا حال اس طرح کہتا ہے۔ ساعد جو تاج الملوک کے غلاموں میں تھا اس بیابان میں سیر کرتا پھرتا تھا یکایک اس کی نگاہ کئی لکڑہاروں پر جو لکڑیوں کا بوجھ لیے جاتے تھے جا پڑی معلوم کرنے پر انھوں نے بتایا کہ ہم ترقستان شہر کے لکڑہارے ہیں یہی ہمارا کام ہے ساعد نے کہا آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانے میں لے چلو اس کا دولت خانہ یہاں سے قریب ہے۔ تھوڑی دور جاکر میرے ساتھ چلے آو۔ کچھ اور آگے بڑھے تو ساری زمین سونے کی نظر آئی سب کو تسلی ہوئی اور بے دھڑک چلے رہے آخر انھیں حضور میں لے گیا تاج الملوک نے انھیں ایک ایک بیش قیمت تھان ہر ایک کو دے کر رخصت کیا۔ لکڑہاروں کو آئندہ اور زیادہ امید ہوئی اور اپنا وطن چھوڑ کر وہیں آ بسے ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی آنے شروع ہوگئے اور ایک نیا شہر آباد ہوگیا۔

جب یہ داستانیں لکھی جا رہی تھیں تو نئے شہر بھی آباد ہو رہے تھے جس کی مثال
لکھنؤ شہر سے دی جا سکتی ہے اور دوسری کلکتہ سے باہر انگریزوں کی بسائی ہوئی بستی
سے دی جا سکتی ہے نواب واجد علی شاہ والئی اودھ کے معزول ہونے کے بعد
مٹیا برج کلکتہ میں آباد ہونے کی صورت تھی انھیں مثالوں سے داستان نگار نے یہ
اثرات قبول کیے ہیں اور اس موقع پر ایک طلسمی شہر کا تعارف کراتے ہوئے گویا ان
شہروں کی داستان مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

شہزادی کے دیو سے علامت مردی لے کر شادی کرنے کی حکایت یہ ہے۔

ایک بادشاہ کی سو رانیاں تھیں لیکن اولاد کسی کے نہ ہوتی تھی۔ خدا کی قدرت
سے ایک نوجوان کو حمل رہا اور نو مہینے بعد لڑکی پیدا ہوئی پھر پے در پے تین بار بچے
پیدا کیے لیکن لڑکا نہ ہوا چوتھے حمل پر بادشاہ نے قسم کھائی کہ اگر آپ کے بھی لڑکی
پیدا ہوئی تو بچی کو اس کی ماں سمیت مروا دے گا۔ تقدیر سے پھر لڑکی پیدا ہوئی ماں
نے جان کے خوف سے لڑکا مشہور کر دیا اور نجومیوں کو بھی خفیہ طور سے تاکید
کر دی کہ بادشاہ کو یہ کہہ دو کہ پندرہ سولہ برس کی عمر تک اس لڑکے کا منہ نہ دیکھے کیونکہ
آپ کے واسطے لڑکے کا منہ دیکھنا اچھا نہیں نجومیوں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔

جب لڑکی جوان ہوئی اسے دیکھنے میں تھوڑی مدت رہی تو اس کو بیٹا
کہلوانے کی غرض سے سمجھا دیا اور کہا "بادشاہ کے حضور میں مردانہ وضع میں آیا جایا
کیجیو کہ اس بات میں میری اور تیری زندگی ہے۔ چند برس بعد اس کی دوسرے
بادشاہ کی بیٹی سے شادی ٹھہرا دی گئی۔

شادی کے دن بادشاہ نے اس کو لباس شاہانہ پہنایا اور بادشاہی
تجمل سے دلہن کے ملک کو برات لے کر چلا۔ لڑکی کبھی اس حالت میں ہنستی اور
کبھی روتی۔ رات ایک ویرانے میں رہنا ہوا تو لڑکی شرم کے مارے زندگی کو
وبال جان کر اٹھی اور بیابان میں چلی گئی کہ کوئی درندہ کھا جائے جاتے جاتے
ایک درخت کے تلے جو کسی دیو کے رہنے کا ٹھکانہ تھا پہنچی وہ دیو اس کے حسن پر

دیوانہ ہو گیا اور آدمی کی صورت میں لڑکی کے آگے کھڑا ہوا پوچھنے پر لڑکی نے ساری
کیفیت سنائی دیو کا دل بھر آیا اس نے کہا اگر تو امانت میں خیانت نہ کرے اور اس پر
قول دے تو اپنی علامت کو کس حکمت سے تیرے لگا دوں اور تیری علامت خود اختیار
کر لوں وہ لڑکی دیو کے کہنے کے موافق عمل میں لائی۔

کئی روز بعد برات شادی سے فارغ ہو کر لوٹی لیکن شہزادہ بنی ہوئی شہزادی
کچھ دن وہاں رہی جب اس کا ایک لڑکا پیدا ہوا تب وطن لوٹنے کا ارادہ کیا۔ منزلیں
طے کرنے کے بعد جب اس جنگل میں آیا تو درخت تلے گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہی دیو
بڑھیا کے بھیس میں روتی شکل بنائے بیٹھا ہے۔ شہزادے نے کہا اے دیو میں نے
تیری مہربانی سے مراد پائی تو اپنی چیز لے اور میری مجھے دے" دیو نے کہا اب میں
اس کام سے گذر گیا میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امانت میں خیانت اس معاشرے میں در نہ آئی
تھی اور امانت کے نام پر بڑی سے بڑی چیز بھی سپرد کر دی جاتی تھی امانت رکھنے
والا بھی ایسا ہی ایماندار ہوا کرتا تھا کہ وہ امانت لوٹانے کے لیے ہر وقت تیار
رہتا۔ دوسرے دیو کی حکایت سے بھی معلوم ہوا کہ جیسا کہ بارہا ذکر ہوا ہے تقدیر
پر بہت زیادہ یقین کیا جاتا تھا۔ اور جو کچھ حادثہ گزرتا اسے تقدیر پر ہی محمول
قرار دیا جاتا۔ یعنی معاشرہ تقدیر پرست تھا اور اس کے افراد جو کچھ ہوتا راضی بر
رضا رہتے اور خدا کی جانب سے ہر بات کو آیا ہوا سمجھتے اور یہ کہہ کر مطمئن ہو رہتے
کہ "یوں مقدر تھا۔"

شہزادی کے پوچھنے پر دیو بولا میں اس صورت سے تیرا منتظر یہاں بیٹھا تھا
۔ ایک دیو پہاڑ سا آیا اس کے دیکھنے سے شہوت مجھ پر غالب ہوئی اور میں مستی
کے مارے نہ رہ سکا۔ اس نے بھی دوڑ کر چھاتی سے لگا لیا۔ اگر علامت مردمی
لگا لوں تو اپنی جان سے ہاتھ اٹھاؤں۔

وزیر بچہ حکایت سن کر کہا مجھے خدا کی قدرت میں شک نہیں لیکن آدمیوں سے

بعض چیزوں کا وجود میں آنا عقل میں نہیں آتا۔

گیارھویں باب (داستان) میں تاج الملوک کے یہاں زرین الملوک کے ضیافت کھانے کا بیان ہے۔ کوتوال تاج الملوک کے بسے ہوئے شہر "ملک نگارین" کا سفر اختیار کرتا ہے۔

جڑاؤ عمارت دیکھی۔ تو معلوم ہوا کہ جس پر آگ کا گمان ہوا وہ یہی عمارت ہے شعلے نہ تھے اس کی چمک تھی کوتوال کے آنے کی خبر سے سنی تو حکم دیا کہ حوضوں کے فوارے چھوڑو اور اسے یاقوت کے دالان میں بٹھاؤ۔ کوتوال کے اہلکار حویلی میں لے گئے۔ وہ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تھا جواہرات کی جگمگاہٹ چکاچوند لگ جاتی تھی۔ کچھ مکان بنانے اور ملک بسانے کی خبر شرقستان کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچی تب انھوں نے اس خانہ زاد کو تحقیقات حال کے لیے بھیجا۔ گستاخی ہو اگر آپ کے دل میں خواہش سلطنت کی اور ارادہ فساد کا ہے تو وہاں بھی کچھ دورائے نہیں۔ ورنہ طوق بندگلے میں ڈال کر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوجیے۔ دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہتیں اور نہ دو بادشاہ ایک ولایت میں — تاج الملوک اس کے جواب میں بولا۔ میں تو اس حیوانات کے جنگل میں ایک عبادت گاہ بنائی ہے حق تعالیٰ کی بندگی میں مشغول رہتا ہوں۔ بادشاہت کی خواہش مطلق نہیں بلکہ دولت خواہی کا طلبگار رہوں۔ یہ معلوم کرکے کوتوال خوش خوش رخصت ہوا اور کل کیفیت وزیر کی جاسنائی وزیر نے بادشاہ کے حضور میں پہنچ کر جو معلوم ہوا تھا عرض کیا کچھ سچ جان اور بہتوں نے سچ نہ مانا۔ بکاولی یہ سب کچھ سن کر دل میں کہنے لگی عقدہ سربستہ کے کھلنے اور ناامیدی کے بعد آسائش کی شکل نظر آئی بادشاہ بھی کچھ دیر حیرانی میں ڈوبا رہا اس کے بعد کہا اگر یہی صورت ہے تو ایک نہ ایک دن سلطنت کو زوال ہوگا وزیر نے کہا داناوں کا کہنا ہے جس دشمن سے لڑائی نہ کرسکے اس سے دارومدار کرکے مل جائے۔ بادشاہ نے کہا تو اس لائق ہے تو ہی جا اور اس سے رابطہ قائم کر لیکن ایسا کام کیجیو کہ سانپ بھی مرے

اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ وزیر بادشاہ کے حکم سے بڑے کروفر سے روانہ ہوا۔

تاج الملوک نے آنے کی خبر پر نئے سرے سے جوش وخروش کی تیاری کا حکم دیا۔ حوضوں میں گلاب بدلوائے فوارے چھڑوائے اور اسے لعل بدخشاں کے دالان میں بٹھایا گیا۔ تاج الملوک خود ایک جڑاؤ کرسی پر بیٹھا۔ وزیر نے مجرے کو کھڑا ہو کر دعائیں دیں اور التماس کیا کہ اس سے پہلے ایک شاہی اہلکار حضور میں حاضر ہوا اور اس نے جاکر آپ کا پیام محبت حضور اعلیٰ میں پہنچایا آپ کے اوصاف حمیدہ بیان کیے اور بادشاہ کی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا اور آپ کی ملاقات کا مشتاق کیا۔ اس سے کیا بہتر کہ فیض وعطا کے دو چشمے اور جود وسخا کے دو دریا باہم ملیں۔ تاج الملوک نے کہا جو پیام میری طرف سے لازم تھا حضرت جہاں پناہ کی طرف سے آیا مجھے بسرو چشم قبول ہے۔ وزیر نے عرض کیا انشاءاللہ ایک ہفتے کے بعد حضرت عالم پناہ یہاں رونق بخشیں گے۔ خاصے کے وقت بکاولی رنگ برنگ کے لذیذ اور خوشگوار کھانے جواہر نگار برتنوں میں نکلوا کر چاندی کے خوانوں میں لگوا کر نعمت خانے میں لائی اور زربفت کا دسترخوان بچھوا کر کھانا چن دیا گیا۔

فوارے چھوڑے استقبال کی ایک علامت تھی جو آج بھی بہت سی جگہ دیکھنے میں آتی ہے یعنی مہمانوں کے آنے پر آج بھی فوارے چھوڑے جاتے ہیں — ہم اس سے یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ شاہی دربار میں مہمانوں اور ایلچیوں کا کس طرح استقبال کیا جاتا تھا اور دعوت میں کس طرح پر تکلف اور بیش قیمت ظروف استعمال ہوتے تھے۔

کھانا ہوگیا تو وزیر نے رخصت چاہی اور جلد ہی بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو کر کل ماجرا مفصل بیان کیا۔

بادشاہ امیروں، وزیروں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی شاہی ٹھاٹھ باٹھ سے شہر نگاراں کی جانب روانہ ہوا خود بادشاہ ایک جڑاؤ عماری میں سوار ہوئے اور بکاولی مردانہ لباس میں خواص میں بیٹھی چاروں شہزادے بھی خلعت شاہانہ

زیب تن کیے اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوے۔ شاہی جلوس شہر سے کچھ کوس آگے گیا تھا کہ زری کے خیمے کی چمک مانند شعاع آفتاب نظر آئی۔ بادشاہ بولے اغلب ہے کہ یہ وہی مکان ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہری اور آنکھ جھپکی چلی جاتی ہے وزیر نے کہا حضرت رات کی رات میں کچھ کا کچھ رنگ بن گیا ہے یہاں فقط جنگل تھا ملک نگاریں بہت دور ہے بادشاہ اور وزیر انھیں باتوں میں تھے کہ شہزادے کے ملازموں میں سے ایک نے آکر عرض کی کہ ہمارے آقا نے حکم دیا حضور عالم پناہ کی سواری جس جگہ سے آگے بڑھے وہاں کا اسباب وغیرہ غریب و غربا لوٹ لیں۔ اور خود بدولت ہر ایک منزل میں جس خیمہ کو پسند کریں اس میں استراحت فرمائیں۔ بادشاہ نے ہر جگہ بے مثال ضیافت کا سامان مہیا پایا اور سواری جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی اس قدر اسباب کی زیادتی نظر آتی تھی۔ تاج الملوک آپ بھی ہر ایک منزل استقبال کے لیے آیا۔

شاہی جلوس کا یہ ٹھاٹ باٹ مشرقی شہنشاہوں ہی کے یہاں بیان ہوا ہے۔ اس کی ہلکی سی جھلک "پھولوں کی سیر" میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہو بہو داستانی زمانے کے جلوسوں کی تصویر کشی کر دی ہے تخیل کاری نے بھی عجوبہ کاریاں کی ہیں۔ تاج الملوک کے اہتمام استقبال میں تو حیرت کی جا نہیں کہ وہ دیووں کا کیا ہوا تھا دیووں کی مدد سے تو آسمان بھی زمین پر اُتارا جا سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اندر سبھا بھی رچائی جا سکتی ہے اس شان و شکوہ کے علاوہ حفظ مراتب کا اس قدر خیال کیا گیا ہے کہ اس سے اس وقت کے معاشرے کی تصویر اس کے اقدار کے ساتھ نظروں میں پھر جاتی ہے کوتوال کو یاقوت کے دالان میں وزیر کو لعل بدخشاں کے دالان میں اور بادشاہ کے زمرد کے مکان میں واجب و مناسب اعزاز و اکرام سے بٹھایا۔ یہ مرتبے کا رکھ رکھاؤ معاشرے کے ہر طبقے میں اپنی موجودگی کا خیال دلاتا ہے۔

بکاولی نے یہ عالم دیکھا تو وہ بھی دیوانی ہوگئی۔ ہوش و حواس جاتے رہے

جس طرف دیکھتی جس مکان پر نظر پڑتی نقشہ اپنے یہاں کا پاتی متحیر ہو کر جی میں کہنے لگی یہ کوئی بڑا جادوگر ہے کہ میری عمارت کو بجنسہ یہاں اٹھا لایا ہے ایک پری جو اس کے ساتھ آدمی کے بھیس میں خدمت گاری کے لیے رہتی تھی اسے اشارہ کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے اس نے سامنے آکر کہا آپ کے مکان جہاں تھے وہی ہیں۔ اس بات سے بکاولی نے جان لیا کہ یہی میرا چور ہے لیکن حیا کے سبب افشائے راز نہیں کیا اور صبر و توکل پر قائم رہی۔

دستر خوان بچھا طرح طرح کے کھانے چاندی اور سونے کے ظروف میں چن دیے گئے مزے اور حلاوت کی کیفیت احاطۂ بیان سے سوا تھی بادشاہ اہلکاروں کے طریقے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے اور خوش خوش خاصہ نوش جان فرمایا پھر محفل نشاط اور راگ رنگ کی صحبت دیر تک رہی اور تاج الملوک اور زین الملوک دونوں باتوں میں مشغول ہوئے زین الملوک نے بتایا کہ ان چاروں کے سوا اب کوئی نہیں ایک اور تھا اس کے دیدار نحس کی بدولت یہ بلائے ناگہانی مجھ پر نازل ہوئی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے میں نے اس سے نجات پائی اور وہ خدا جانے کہاں نکل گیا تاج الملوک نے کہا کوئی اس مجلس میں اس کو پہچانتا ہے یا نہیں اس بات پر زین الملوک نے کل ماجرا تفصیل بیان کیا پھر ایک امیر کی جانب اشارہ کیا وہ ان کا اتالیق تھا اس نے شہزادے کا نقشہ اور گفتگو کا رویہ غور سے ملاحظہ کیا اور عرض کی کہ اتنے آدمیوں میں کسی اور کو اس کی صورت اور شکل کے موافق نہیں دیکھا۔ مگر چہرہ مبارک اور بول چال کی وضع بھی بہت ملتی ہے۔ یہ سنتے ہی تاج الملوک اٹھا اور باپ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا کہ دیدار مبارک جس طرح سے چاہتا تھا اس طرح حاصل ہوا بادشاہ نے تاج الملوک کو مارے خوشی کے چھاتی سے لگا لیا اور کہا یہ حشمت و اقبال جو حق تعالیٰ نے تجھ کو بخشا ہے اس کا احوال ہم کو ــــــ تمھارے زائچے سے معلوم ہو گیا تھا کہ آج تک کہاں تھے اور سرو آزاد ہو یا کسی شمشاد قد سے پیوند

گیا ہے۔ شہزادے نے جواب میں بتایا کہ غلام کی دو منکوحہ ہیں اگر حکم ہو تو بار یاب ہوں بادشاہ کی فرمائش پر شہزادہ اندر گیا اور دلبر اور محمودہ کو بادشاہ کی خدمت میں لایا وہ قریب آکر ٹھٹک رہیں بادشاہ نے کہا یہاں کیوں نہیں آتیں تاج الملوک نے بتایا کہ حیا سے نہیں آتیں کیونکہ چاروں شہزادے ان کے بندے آزاد ہیں ان کی مہر سے ان کے چوتڑ داغ دار ہیں اس راز کے کھلنے سے چاروں شہزادوں کا رنگ فق ہو گیا اور وہ وہاں سے اٹھ گئے وہ دونوں آئیں اور قدم بوس ہوئیں پھر تاج الملوک نے کل حال بیان کیا۔

مسلمان تہذیب کی بنیاد اجتماعیت پر ہے۔ اتحاد کا تصور اپنے ہر عمل کے پس منظر میں موجود رہتا۔ خواہ وہ ان کی عبادت ہو یا پھر غم اور خوشی کا کوئی موقع ساتھ کھانے کا تصور بھی اس سے جنم لیتا ہے۔ دسترخوان کے وسیع ہونے کا تہذیبی تصور ان کے یہاں غالباً دنیا کی ہر قوم سے زیادہ ہے اس موقع پر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دسترخوان چنا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے کھانے چاندی سونے کے ظروف میں سجائے جاتے ہیں کیونکہ شاہی تہذیب موضوع گفتگو ہے اس لیے برتن سونے چاندی کے ہیں اس کے مقابلے میں ہندو تہذیب میں ایکتا اور انفرادیت پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا ہے ایسا تو نہیں ہے کہ انکے یہاں جماعتی اور معاشرتی زندگی کا کوئی تصور نہ موجود ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عبادت الگ الگ کرتے ہیں عام طور پہ کھانا الگ الگ کھاتے ہیں جس کو ہم دست بستہ آداب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہاتھ نہیں ملاتے جس میں گہرے طور پہ ایکتا اور انفرادیت کا تصور کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں کھانے پینے کے ظروف بھی سونے چاندی کے ہوں ایسا عام طور پر نہیں تھا اس لیے کہ امراء بھی دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ الگ کھانا کھاتے اور ان کے لیے پیتل کے برتن استعمال ہوتے تھے اس لیے ہندو تہذیب کی پہچان ظروف کے ذریعہ نہیں زیورات کے ذریعے سے ہوتی تھی۔

اس بات کے آخر میں پہلے کئی ایک ابواب کی طرح پند و نصیحت کے انداز

میں کیا گیا ہے اگر شہزادے کی مانند کارشائستہ کرے تو بادشاہ کے دربار میں بڑی عزت تیری خدمت کے موافق ہوگی یہ بادشاہ کا دربار خدا کی بارگاہ ہے۔ سرفراز ہونے کا صرف یہی راستہ ہے۔ بادشاہ اپنی ملاقات کا پیغام بھیجے یا آپ ہی تیرے پاس چلا آئے اگرچہ پہلے سرفرازی کے لائق نہ ہو لیکن آخر کار اس مقام پر پہنچے اور وہاں تیرا کوئی شریک نہ ہو سکے۔ اور ہرگز ایسا کام نہ کیجو کہ شاہزادوں کی مانند داغ ندامت اٹھائے اور ہر ایک کے روبرو رسوا ہو۔

معاشرہ کارشائستہ کی قدر کرنے والا تھا اور اس طور سے کوئی فرد معاشرے اور سماج کی آنکھوں کا تارا ہو سکتا تھا اور اس کا کوئی شریک نہیں رہتا تھا۔ اس کی دوسری صورت بھی معاشرے میں تھی۔ جس سے افراد داغ ندامت اٹھاتے تھے اور ہر جگہ رسوا ہوتے تھے۔ سماج اور معاشرہ پھر انکو نظر میں نہیں لاتا چاہیے وہ کتنے ہی سرفراز ہو رہے ہوں ــــــــــــــــ

مکر و فریب کا آخر برا ہی ہوتا ہے اس پر معاشرے کا پختہ اعتقاد اور یقین تھا۔

بارھواں باب یا بارھویں داستان بکاؤلی کے شرقستان سے رخصت رخصت ہونے اور تاج الملوک کو خط لکھنے سے متعلق ہے۔

بکاولی زین الملوک سے رخصت ہو کر اپنے باغ میں آئی اور تاج الملوک کی انگوٹھی سمیت بھجوایا وہ بکاولی کے ساتھ اس سفر اور وطن سے دور قیام میں ہمہ وقت رہی تھی وہ تاج الملوک کے محل میں آکر کسی طرف گھات میں لگی رہی جب تاج الملوک بکاولی کے دھیان میں اکیلی جگہ آ بیٹھا تو اس کے سامنے گئی اور آداب بجا لاکر خط اور انگوٹھی حوالے کی اس نے انگوٹھی پہچان لی اور خط کھول کر پڑھا۔

اس پیراگراف میں تہذیبی مطالعہ پر جو بات روشنی ڈالتی ہے وہ خط کے ساتھ انگوٹھی دینے کی ہے۔ اس زمانے میں بھی دستور رہا ہوگا اس ضمن میں کہہ سکتے ہیں کہ

شکنتلا کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی کھوگئی تھی جو دشونت نے اس کو دی تھی خط کی بات تو الگ رہی دشونت نے شکنتلا کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا اور یہ کہا تھا اے عورت میں تجھ کو نہیں جانتا اس مثال سے خط کے ساتھ انگوٹھی بھیجنے کی رسم پر روشنی پڑتی ہے۔

خط منظوم ہے اس میں ابتدا کا سفر ہے۔ سخن ابتدا کو بنام خدا رہے لیلےٰ اور قیس، شیریں اور فرہاد کے معاملات کا ذکر کے یہ شعر درج کیا ہے۔

ہے مہر اسکے جلوے کی اول سے آخر　　ہے بیتاب اس پر یہ ذرہ سدا

اور پھر سلام و پیام کے بعد اپنی بے تابی اور اپنے دل کی آگ کا بیان کیا ہے اور پھر شکوہ کا انداز آگیا ہے۔ مگر یہ سخن ہے غلط

کہ اک دل کو ہے دوسرے کی خبر

شوق کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

میں ناشگفتہ گو ہر ہوں اے خوش لقب

ہے الماس کی مجھ کو تجھ سے طلب

آخر کا حصہ یوں ہے۔

میں جب اٹھوں گی روز جزا
تو ہوں گی تیرے لعل و رخ کی بہا
جواب اس کا پھر کب تو دے گا مجھے
جو پوچھونگی کاہے کو مارا مجھے
نہ بول آگے بس اے زبان قلم
دکھانے کو دل کے نہیں کچھ یہ کم!

تاج الملوک اسباب کی مانند بے قرار اور ماہی بے آب کی طرح بے تاب ہو کر تڑپنے لگا اور اس کے اضطراب اور بے چینی نے بہت طول کھینچا ناچار صبر کیا اور نامے کا جواب لکھا۔ ابتدا اس شعر سے کی۔

اے عاشقوں کی ستانے والی　　ہے طرز جفا تیری نرالی

تو سیم تنوں کی صف شکن ہے　　تو عشق کی رہ میں راہزن ہے

اور پھر

روشن ہے تجھی سے شمع امید　　میں ذرہ ہوں اور تو ہے خورشید

یعنی یہ بیان کرنے کے لیے کہ اس طرف بھی آگ کم نہیں لگی ہوئی بلکہ دگنی ہے بکاولی کے حسن و جمال کی تعریف کی اور نثر میں مدح خوانی اور شوق بیانی ہے جس کی روش وہی ہے جو اگلے زمانے میں ایسے مکاتیب کی ہوتی تھی جیسے غالب محمد شاہی روش کا نام دیتے ہیں اور یہ انداز اس زمانے میں قابل تحسین بھی تھا۔

اور چند یہ تیرا ہی کام کا ہے لکھنے کے بعد یہ شعر آجاتا ہے۔

تا نہو دلبر کی جانب سے کشش　　عاشق بے چارہ کہہ کیا کر سکے

بڑھی ہوئی بے تابی کے ثبوت میں خط لفافہ میں رکھ کر چشم سرمہ سائے نمناک کو بجائے مہر اس پر رکھا اور سمن پری کو رخصت کیا اور بہت سے اشتیاق کا پیغام زبانی بھی بھجوائے۔

اس نے بکاولی کے پاس پہنچ کر جو دیکھا تھا اور زبانی پیغامات کو بیان کیا۔ خط کو مہر سے آراستہ کر اس زمانے کی ایک بہت پرانی روش تھی اب تحریروں کی دستاویزی حیثیت مہر کے ساتھ ہی قایم ہوتی ہے لیکن یہاں آنکھوں کو اس پر دیکھ کر مہر لگانے کا تصور شاعرانہ ہے اور بعض شعرا کے یہاں اس مضمون کو نظم بھی کیا گیا ہے۔ خط کے ساتھ کچھ پیغام زبانی بھی ہے۔ یہ شاید اس لیے کہ ہر بات خط میں لکھنا مشکل ہے یہ مضمون بھی شعرا کے یہاں ملتا ہے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

اس کے علاوہ یہاں سمن پری کو نامہ بر بنایا گیا ہے شعرا نے تو مختلف پرندوں اور جانوروں سے یہ کام لیا ہے۔

تیرہویں داستان (تیرھواں باب) تاج الملوک کے بکاولی کے پاس جانے اور بکاولی کے قید میں پڑنے سے متعلق ہے۔ بکاولی نے کوائف سے آگاہ

کیا سمن پری کو حمالہ کو جلد لانے کے لیے کہا وہ پل بھر میں حمالہ کے پاس جا پہنچی۔ بکاولی نے کہا یہ تیری ہی آگ لگائی ہوئی ہے یہ کرتوت تیرے داماد کی ہے۔ تو نے ہی اس کو یہاں تک پہنچایا۔ میرے پردے ناموس میں رخنہ اندازی کی اور ننگی کھلی اس نے مجھے دیکھا اپنا بھلا چاہتی ہے تو جلد اس کو مجھ تک پہنچا۔ اس کا لانا میرا کام ہے۔ میں ابھی کان پکڑ کر اس کو لاتی ہوں۔

اس پیراگراف کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوں کے بعض طبقوں میں رات کو کم از کم لباس پہن کر سونے کا رواج تھا۔ جس کی طرف یہاں گل بکاولی کی گفتگو میں مصنف نے اشارہ کیا ہے اور خود گل بکاولی بھی کہتی ہے۔

دوسرے شب خوابی کے لباس میں ایک نامعلوم اور اجنبی کے سامنے آنے کا شاید اس وقت کوئی تصور نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر صرف شریک خلوت تو صرف شوہر ہی ہو سکتا ہے اس لیے گل بکاولی نے پردۂ ناموس کا بھی ذکر کیا ہے۔ حمالہ اس کی رازدار ہے اور صحیح صورت حال کو جانتی ہے۔ اس لیے نہ اس پر پریشان ہوتی ہے اور نہ اس کے خیال سے کوئی انہونی بات تھی اس لیے اس نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ یہاں ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ حمالہ کے کردار میں شاعر یا قصہ گو نے ایک دایا کا کردار بھی سامنے رکھا ہے جو ایسے موقعوں پر پریزادیوں کی ہمدم اور ہمراز بن کر سامنے آتی تھیں۔

تاج الملوک کے پاس پہنچ کر حمالہ مسکرانے لگی اور کہا اٹھ اے بے پروا تجھے تیری شمع نے یاد کیا ہے۔ اور پھر کاندھے پر بٹھا کر بکاولی کے پاس لے گئی۔ اسی اثنا میں بکاولی کی ماں جمیلہ خاتون کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ تمھاری بیٹی براگن بن گئی ہے۔ شاید وہ آدم زاد یا پری زاد پر دیوانی ہوئی ہے اس بات کی تحقیق کے لیے وہ بکاولی کے پاس پہنچی اور آثار عشق آہیں پا کر بہت خفا ہوئی اور اپنا منھ پیٹ کر بولی اری کنواری ہتھیاری یہ کس کے پیچھے روگ لیا پریوں کے ننگ و ناموس تو نے کھویا اور گل کا نام ڈبویا بکاولی نے کانوں پر ہاتھ رکھا

اور صاف مکر گئی۔ سخت سخت قسمیں کھانے لگی ماں کے پاؤں پر گر پڑی اور کہنے لگی میں نے تو آج تک عشق کا نام بھی نہیں سنا اور آدمی کو خواب میں بھی دیکھا کسی نے طوطیہ چھوڑا ہے اور تہمت لگائی ہے اس کا نام سچ بتاؤ نہیں تو اپنا خون کروں گی۔ یہ حالت دیکھ کر ماں کا دل پگھل گیا مگر ظاہرا اٹالی سے بولی چپ رہ اسے چھنال بیکار تُو رہے نہ بہا۔

اس کے بعد گل بکاولی کی ماں کا کردار سامنے آتا ہے جو ایک ملکہ ہے ظاہر ہے اس کے سوچنے کا انداز دوسرا ہے وہ اس خبر کو سن کر چراغ پا ہوتی ہے کہ بکاولی کس آدم زاد پر عاشق ہو گئی ہے اور اس کے فراق میں براگن بنی ہوئی ہے وہ اس طرح بیٹی پر خفا ہوتی ہے کہ تو آدم زاد سے عشق کر کے خاندان کا نام ڈبویا ہے اور پری زادیوں کی بے عزتی کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت آج سے بھی کچھ زیادہ شادی بیاہ کے معاملے میں طبقے اور خاندان کا خیال رکھا جاتا تھا اور اپنے سے کم درجے کے لوگوں میں شادی بیاہ اور اس کے ساتھ عشق و محبت کے رشتے کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا یہ وہی طبقاتی شعور ہے جو یہاں بھی سامنے آتا ہے۔

میر حسن نے بھی اس زمانے میں جب گویا یہ داستان لکھی گئی تھی ملکاؤں اور شہزادیوں کی زبان سے ایسی باتیں کھلوائی ہیں جن کو ہم غیر مہذب سمجھتے ہیں خاص طور پر گالیوں کو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اس وقت امیرزادیوں اور بیگمات شاہی میں ایسی عورتیں تھیں جو غصہ یا بے تکلفی کے وقت یہ انداز گفتگو اختیار کر سکتی تھیں۔

سمن پری نے بکاولی کو اشارہ سے آگاہ کر دیا شہزادی نے اشارے ہی سے کہا کہ ایک محفوظ مکان میں چھپا رکھوں اور پھر رات گئے بکاولی وہاں سے اٹھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ دبے پاؤں چلی لیکن شوق سے دل سینے سے باہر آ جاتا تھا۔ شہزادے کی نگاہ جیسے ہی بکاولی پر پڑی ہوش جاتے رہے اور وہ

غش کھا کر گر پڑا۔ بکاولی گھبرائی اور اس کا سر اپنے زانوں پر رکھ کر منہ سے منہ ملایا اس کی خوشبو سے جو گلاب سے تیز تھی شہزادے نے دماغ کو قوت بہم پہنچی اور اس نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور خوش و خرم اٹھ کھڑا ہوا پھر دونوں میں پیار کی پینگیں بڑھنے لگیں۔

آخری پیراگراف سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے قصہ نگاروں کے نزدیک شہزادے اور شہزادوں کے کردار میں کچھ کمزوریاں بہرحال موجود تھیں کہ وہ چھپ چھپ کر عشق و محبت کی پینگیں بڑھاتے تھے اور انھیں جنسی روابط پیدا کرنے میں بھی کوئی تکلف نہ تھا اس وقت کے شاہی معاشرے سے متعلق یہ کمزوری متعدد قصوں میں سامنے آتی ہے۔

جمیلہ خاتون آدھی رات کو اتفاق سے چونک پڑی اور اٹھ کر سیر کو چلی چاندنی کی بہار جا دو لیے ہوئے تھی گھومتے گھومتے ناگاہ وہاں جا پہنچی وہ دونوں بڑے بے سدھ سوتے تھے دیکھتے ہی اس کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ تاج الملوک کو ایک پتھر کے مانند صحرا کے طلسم میں پھینکا اور بکاولی کے گالوں کو طمانچوں سے لال کر دیا اور گلستان میں بکاولی کے باپ کے پاس لے گئی اور آنکھوں دیکھا حال کہہ سنایا اس نے کتنی ہی پریاں اس کی مصاحبت کے لیے مقرر کریں کہ یہ اس کو ہر وقت نصیحت کریں اور اس عشق سے باز رکھیں۔ لیکن بکاولی کی دبی ہوئی عشق کی آگ ان کی باتوں سے اور بھی سلگ اٹھی دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا رات بھر تاج الملوک کے خیال میں جاگتی۔

جب پریوں نے جانا کہ اس کے بدن میں عشق کی آگ لگی ہوئی اور اس کو چاروں طرف عشق نے گھیرا ہے تو وہ ناچار فیروز شاہ کے پاس جا کر حقیقت کہہ آئیں اس پر فیروز شاہ نے نصیحت بے اثر پاکر بکاولی کو طلسمات میں بند کیا اور پاؤں میں سونے کی زنجیر ڈال دی۔

آگے چل کر جمیلہ کا کردار سوتیلی ماں کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ قصے کے

مطابق شہزادے اور شہزادیوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش دیکھتی ہے اور غصے سے بے قابو ہو جاتی ہے اور تاج الملوک کو صحرائے طلسم میں پھنکوا دیتی اور بکاولی کے کمزور کردار کی داستان اس کے باپ سے کہتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس کا بحیثیت ماں کے جو شدید ردعمل ہوتا ہے وہ فیروز شاہ پر نہیں ہوتا اور جب وہ دیکھتا ہے کہ شہزادی کس طرح اپنے خیال و خام سے باز نہیں آنا چاہتی تو وہ اس کو چاہ طلسمات میں قید کر دیتا ہے۔ قصے کے یہ اجزا اس زمانے کے تہذیبی رویے کو ظاہر کرتے ہیں شاہی قیدی عام طور پر چاہ طلسمات میں رکھے جاتے تھے یا پھر ان کو اپنی موت آپ مرنے کے لیے صحرائے بے آب و گیاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حضرت یوسف کے قصے میں کنواں موجود ہے چاہ بابل میں ہاروت و ماروت کے قید کیے جانے کا واقعہ بھی مذہبی روایات کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ سونے کی زنجیر اس ارادے کی فارغ البلاغ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

چودھویں داستان (چودھواں باب) تاج الملوک کے صحرائے طلسم میں دریائے محیط میں جا پڑنے اور بیابانات میں پہنچ جانے اور پھر اصلی صورت کے ہو جانے سے متعلق ہے۔

یہاں صحرائے طلسم میں جس طرح کے واقعات سامنے آئے ہیں ان کے ذریعے قصہ نگار نے حیرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جزو اس قصے کو داستان سے زیادہ قریب کر دیتا ہے قصوں میں عام طور پر طلسم بندیاں نہیں ہوتیں داستانوں کا ہی حصہ ہوتا ہے اور اس سے سننے یا پڑھنے والے کی دلچسپی کو باقی رکھنا اور خیالی دیوتاؤں کی سیر کرانا داستان کو طلسم نگار کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔ سانپ کے من کا ذکر اکثر کہانیوں میں آیا ہے اور چوں کہ اس کی مدد سے بہت سی محیر العقول باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں اس لیے قصے نگار اس کی مدد سے کہانی کو آگے بڑھانے کا کام لیتے ہیں۔ شہزادے کے سفر کا ماحول بتا رہا ہے کہ یہ دور وہ ہے جب خود ہمارے ملک میں دور دور تک جنگل پھیلے ہوئے تھے۔

اس انداز سے اس نے کیچڑ کے لوندے کو منہ پر ڈالا کہ پھر اندھیرا ہو گیا اژدھا اور سانپ ٹپک ٹپک مر گئے۔ شاہزادہ صبح درخت سے نیچے اترا اور کیچڑ میں سے من نکال کر اپنی کمر میں باندھا اور آبادی کی امید پر آگے چلا تمام دن سفر میں گزرتا رات ہوتی تو کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھا رہتا اتفاق سے جس درخت پر ایک رات بیٹھا ہوا تھا اس پر ایک بولتی ہوئی مینا کا آشیانہ تھا وہ اپنے بچوں کو کہانیاں اور نظمیں سنایا کرتی تھی اور ہر ایک فن کی گھاتیں بتایا کرتی تھی اس لیے کہ کان پڑی بات ایک نہ ایک دن کام آتی ہے۔

اس کے بعد کہانی کا قصہ ہمیں طوطا مینا کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے مینا اور طوطے گھروں میں پلے رہتے تھے اور اپنے دائرے میں بولتے اور باتیں بھی کرتے تھے دوسرے جانوروں کے ماسوا کہانیوں میں خاص طور پر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ معاشرے میں بڑوں کی باتیں اس لیے نہایت دھیان سے سنی جاتی تھیں کہ وہ ایک نہ ایک دن کام آتی ہیں یعنی نصیحت کی بڑی اہمیت جانی جاتی تھی کیونکہ وہ بڑوں اور بہیلوں کے تجربوں میں آتی ہوئی باتوں پر انحصار رکھتی ہے۔ یہ باتیں صرف خشک نصیحت نہ ہو بلکہ ایک سبق آموز کہانی کا روپ رکھتی ہو۔ اس لیے بیشتر اس فرض کو مائیں ہی ادا کرتی تھیں کہ وہ بچوں کو کہانیاں سنایا کرتی تھیں جن سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ زندگی اور زندگی کے معاملات کو سمجھنے لگیں اور زندگی کو راہ کے خطروں سے مقابلہ کر سکیں۔

اس رات بچوں کے کہنے پر مینا نے اس بیابان کی بات کہی کہ اس جنگل میں بے شمار خزانے گڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کے علاوہ یہاں سے دکن کی طرف ایک حوض پر ایک بڑا درخت ہے اسے سراج القلب کہتے ہیں اگر کوئی اس کے پوست کی ٹوپی بنا کر پہنے تو وہ کسی کو نظر نہ آوے اور وہ سب کو دیکھتے لیکن اس درخت تک پہنچنے میں یہ دشواری ہے کہ اس کا نگہبان ایک بڑا سانپ ہے

اس پر کسی ہتھیار کا اثر نہیں ہوتا کوئی ایسا جوانمرد ہو جو گھبراوے نا۔ اس حوض کے کنارے اپنے آپ کو پہنچا دے جب وہ سانپ اس پر لپکے تو وہ حوض میں کود پڑے اس کی صورت کوئے کی ہو جائے اس سانپ کا کچھ اندیشہ نہ کرے اور اڑ کر اس درخت کی پھنگ کی ڈالی پر جا بیٹھے اس میں سے کتنے لال اور کتنے سبز پھول توڑ کر کھاوے تو اصلی حالت میں آ جاوے اور سبز پھل کی تاثیر یہ ہے کہ . . .

لکڑی چھال۔ پھول۔ پھل اور الگ الگ صفات کے حامل ہیں انسان نے درخت کو روشنی کا سمبل مانا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ درخت کے مختلف اجزا بہت سی بیماریوں کے علاج ہیں اور اپنے اندر طلسمی تاثر رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں قصہ نگار نے سحر اور طلسم کا گویا ایک مرقع بنا کر اس درخت کو پیش کیا ہے جس کا نام سراج القلب ہے۔

اشجار کے ساتھ ہم نے جو نام منسوب کیے ہیں ان میں سے بعض مذہبی اہمیت رکھتے ہیں جیسے گیان ورشک یا بہشت کا درخت کو شجر ممنوع یا شجر طوبیٰ یا درختوں کی ادبی اہمیت ہے جیسے خسرو۔ صنوبر۔ سرو صحیح یا سرو چراغاں، یا پھر اشوک ورشک درختوں میں سے ایک کلپنا ورشک ہے۔ جسے شجر تمنا کہا جا سکتا ہے۔ ادب میں درختوں کا حوالہ زیادہ شجر تمنا ہی ہیں۔ جب انسانی ذہن سوچنے پر آمادہ ہوتا ہے تو فکر و خیال کے وسیلے سے نت نئی باتیں تصور کر کے ان سے وابستہ کرتا ہے یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات ہے وہ دکن کی طرف روانہ ہونے کی جانب اشارہ کرتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ چندن کے درخت دکن میں ہی ہوتے تھے اور صندل کے درخت پر ہی ہمیشہ سانپ رہا کرتا ہے۔

اس کو سر پر رکھے تو کوئی حربہ بدن پر اثر نہ کرے اگر کمر میں باندھے تو ہوا میں اڑتا پھرے اور پتوں کے خواص یہ ہیں کہ زخم پر اگر انھیں رکھے تو فوراً بھر آوے اگر اس لکڑی ہزار من لوہے کے قفل کو چھوا دے تو اسی وقت کھل جاوے

صبح ہوتے ہی تاج الملوک مینا کی بتائی ہوئی سمت میں اس درخت تک پہنچنے کے لیے چلا اور اپنے آپ کو حوض تک پہنچایا۔ سانپ لپکا تو حوض میں کود پڑا اور کوا بنا ہوا باہر نکل کر اس درخت کی اس میوہ دار ڈالی پر جا بیٹھا۔ ایک لال پھل کھایا تو اصلی صورت میں آگیا اور کچھ سبز پھل توڑ کر کمر میں باندھے اور لکڑی بھی لاٹھی کی مانند توڑ لی۔ تھوڑی سی چھال ـــــــ اور کچھ پتے لے کر اڑا اور چند روز کے بعد ہی جنگل سے باہر نکلا آبادی دکھائی دی ایک نوک دار لکڑی اپنی ران کو چیرا اور کالے سانپ کے من کو اس میں رکھ کر وہی پتے زخم پر لگا دیے زخم فوراً اچھا ہو گیا اس کے بعد آبادی کی راہ لی۔

سانپ کے من کو ران میں رکھنے کا کوئی مطلب یہاں سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ بیشتر قیمتی چیزوں کو کمر میں باندھا جاتا تھا اور بے حد پسندیدہ چیزوں کو دل میں رکھا جاتا تھا۔

پندرھواں باب تاج الملوک کے ایک ایسے حوض پر پہنچنے غوطہ لگانے اور مرد کی صورت کھو دینے سے متعلق ہے۔ اس بات کا آغاز نقل ہے کے جملے سے ہوتا ہے یہ بھی اور انداز کے آغاز کے ساتھ ایک آغاز داستان تھا جو داستانوں کے عہد میں رواج پاتے ہوئے تھے۔ بالعموم یہ طریقہ فارس کی داستانوں میں پایا جاتا تھا۔

اس واردات سے تاج الملوک کا کبھی ہنسنا اور کبھی رونا۔ یونہی اپنے دن کاٹنا اور نو مہینے بعد اس نے لڑکا بھی جنا۔ چالیسویں روز ایک حوض میں جو گھر کے نزدیک تھا جا کے غوطہ مار آیا باہر آیا تو دیکھا نہ وہ سرزمین ہے نہ وہ صورت ایک حبشی جوان ان کی شکل میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے تو نجات ملی نہ سہی اصلی صورت۔ اتنے میں ایک حبشن سر کھولے ہوئے زبان سے ہونٹ چاٹتی ہوئی سامنے سے آگئی اور کمر پکڑ کے بولی "تین دن سے لڑکے بالے بھوکے پیاسے مرتے ہیں اور میں تجھے ڈھونڈھتی پھرتی ہوں کہاں چھپ رہا تھا۔ ہوا سو ہوا۔ اب تین دن کی لکڑیاں لا کر بیچ کر لڑکوں بالوں کے لیے کھانے کو لاؤں تاج الملوک

نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا دیں مگر وہ اسے کشاں کشاں گھر لے گئی۔ اس طرح حیران تھا کہ حبشن کلہاڑی لا کر دے دی تھی کہا جا لکڑیاں کاٹ لا۔ وہ اس فرصت کو غنیمت سمجھا جنگل میں پہنچا اور اس نے دل میں سوچا کہ پھر حوض میں غوطہ ماروں شاید صورت تبدیل ہو۔ دیکھا جائے کہ قدرت کو کیا منظور ہے۔" جیسے ہی ایک حوض میں غوطہ مار کر سر نکالا اصلی حالت میں اس حوض کے کنارے اپنے آپ کو پایا جہاں اس نے علامت مردمی کھوئی تھی لاٹھی اور ٹوپی جوں کی توں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ خدا کا شکر سجدہ کیا۔

جنس آج بھی تبدیل ہوتی ہے لیکن یہ طبیبی کرامات کی صورت میں" داستانوں میں اس کا ذکر اکثر و بیشتر ملتا ہے۔ مگر یہ سب طلسم کی وجہ سے ہوتا ہے اور بیان جو کچھ ہوا ہے وہ ایک خواب کی سی حیثیت ہے۔

لاٹھی اٹھائی سر پر ٹوپی رکھ کر روانہ ہوا۔

اس داستان سے مصنف نے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ خدا نے آدمی کو سر پر کرامت کو ٹوپی پہنا اور عظمت کا عصا کے ہاتھ میں دے کر دنیا کی طلسم گاہ میں بھیجا ہے یہ دنیا آخرت اور عاقبت کی کھیتی ہے یہاں آدمی آ کر اپنی عاقبت سنوارتا ہے یعنی عاقبت کی تکمیل کرتا ہے اس لیے آدمی کو چاہیئے کہ وہ گل سے خار کو اور آب سے شراب کو خوب نہ جانے اور ہر ایک باغ کے پھول کو نہ سونگھے ہر ایک نہر سے گھڑا نہ بھرے کیونکہ یہاں کانٹے گل سے زیادہ رنگین ہیں اور آب کی صورت میں شراب ادھر ادھر ہے اس لئے اگر آدمی دنیا کا موتی حاصل کرنے کے لیے دنیا کے چشمے میں غوطہ مارے گا۔ یعنی دنیا کی حرص میں پڑے گا تو وہ اپنی ٹوپی اور لاٹھی کھو دے گا۔ جو اس کی عاقبت سنوارنے کے بڑے سہارے ہیں۔ اس لیے طالب دنیا مونث ہے اور طالب مولا مرد ہیں۔ چونکہ تو مرد کامل ہے دنیا کی طلب تجھے ناقص العقل مونث بنا دے گی اس صورت میں صبر کے سوا چارہ نہ ہوگا اس لیے ضروری ہے کہ ذکر الٰہی کے دریا میں دم بخود ہو کر غوطہ مارنا چاہیئے پھر جو سر نکالے گا تو وہی عصا ہاتھ میں ہوگا۔

اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا۔

اس سے یہ اور بھی ثابت ہوتا ہے کہ معاشرے میں دنیا کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ عاقبت کی اہمیت جانی جاتی ہے اس لیے ذکر الٰہی کے لیے ہر طور اور ہر ذریعے سے افراد کو تاکید کی جاتی تھی۔ اس قصہ کے اس حصہ سے بھی دوسرے حصوں کی مانند یہ حاصل ہوتا ہے کہ معاشرہ راہ حق پر گامزن تھا یا گامزن ہونا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے داستانیں عموماً علامتی انداز میں لکھی جاتی رہی ہیں اور ان سے یہی مقصد لیا جاتا رہا ہے کہ دنیا سے آخرت کہیں زیادہ عظیم اور بیش بہا ہے۔

عصا یعنی لاٹھی کا تصور حضرت موسیٰ سے لیا گیا ہے اور ٹوپی کا رشتہ حضرت خضر سے وابستہ ہے تاکہ وہ سب کو دیکھیں اور خود کسی کو نظر نہ آئیں۔

سولھویں داستان تاج الملوک کے سیاہ پیکر دیو کے مکان میں پہنچنے اور بکاولی کی چچازاد بہن روح افزا سے ملنے سے متعلق ہے اس داستان کا آغاز کچھ اور ڈھب سے ظہور میں آیا ہے۔

" نقاش ازل اس حکایت کی تصویر صفحہ بیان پر یوں کھینچتا ہے، شاید ابواب کے آغاز میں اتنا زیادہ تنوع اور کسی داستان میں نہیں آغاز میں بلکہ اس کی زبان اور اس کے بیان ادب کا عنصر بیشتر ہی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے یہ درست ہے کہ داستان کسی نہ کسی وجہ سے باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے ہم پلہ قرار نہیں دی جا سکتی۔

تاج الملوک پھر پیدل سفر نہ کرتا تھا ہوا پر ہی اڑتا جاتا تھا ایک روز اس کا گذر ایسے پہاڑ پر ہوا کہ اس کے کوہ قاف حقیر سا نظر آتا تھا۔ اسے پہاڑ پر ایک پتھر کی حویلی دکھائی دی۔ حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے اندر گیا۔ ہر طرف پھرا لیکن کسی جاندار کا نشان وہاں نہ پایا پھرتے پھرتے اس نے یکایک ایک دردناک آواز سنی وہاں جا نکلا دیکھا کہ ایک نہایت حسین دوشیزہ جس کے دیکھنے سے ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ دوڑ جائے پلنگ پر پڑی ہچکیاں لیتے ہوئے روتی ہے۔

شہزادے نے سر سے ٹوپی اتاری اور اس سے دریافت کیا۔ تو نے اپنے عاشق سے کنارہ کیوں کیا اور اس بیچارے مشتاق کے دل کو فراق کا داغ دیا۔ اس انداز کے استفسار نے روح افزا کو بہت حیا آئی اور دوپٹے کا آنچل منہ پہ رکھ بولی "تو کون ہے کیا تجھے موت کے فرشتے کی تلاش ہے یہاں سے بھاگ جا نہیں تو مارا جائے گا۔

روح افزا نے اپنا سر اٹھایا اور کہا میں پری ہوں منظفر شاہ جزیرۂ فردوس کا بادشاہ میرا باپ ہے۔ میں اپنے چچا کی بیٹی کی عیادت کے لیے گئی تھی جو گلستان ارم میں رہتی ہے اور جس کا نام بکاولی ہے۔ پھرتے ہوئے یہ دیو سیاہ پیکر مجھے پکڑ لایا۔ مجھ سے نزدیکی چاہتا ہے۔ میں دور بھاگتی ہوں اس لیے نئے انداز سے ستاتا ہے اور ہر روز ایک نئی آفت لاتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل کئی مرتبہ ذکر کیا جا چکا ہے روح افزا کے شرم و حیا سے معاشرے میں دوشیزاؤں میں شرم و حیا کا چلن عام تھا اور ہر معاشرہ اس کو لازمی مانتا تھا۔

تاج الملوک نے دریافت کیا تیرے چچا کی بیٹی کو کیا مرض ہے۔ روح افزا نے بتایا ہے کہ وہ کسی آدم زاد کے عشق میں مبتلا ہے۔ تاج الملوک اس حالت کو سن کر طبیعت متغیر ہوتی۔ روح افزا نے دریافت کیا کہ یہ غمزدگی کی حالت کیوں۔ تاج الملوک نے جواب میں بتایا میں وہی گرفتار بلائے جدائی ہوں۔ ادھر اس کا دل قید میں گھبراتا اور ادھر مزاج میں آوارگی میں جاتا ہے روح افزا کو یہ ساری کیفیت سن کر حیرت ہوئی اور کہنے لگی اگر اس دیو کی قید سے نجات پاتی تو تیرے غم کا کچھ علاج کرتی۔ چل ابھی اس قید خانے سے نکل اس دیو کا ذرہ میں نہ لا۔ بیڑیاں کٹ کر گر گئیں پھر دونوں نے جزیرۂ فردوس کی راہ لی۔ کچھ زیادہ دور نہ گئے تھے کہ ایک ڈراونی آواز پیچھے سے آئی۔ روح افزا نے ہوشیار رہنے کو کہا کہ دشمن آپہنچا ہے۔

تاج الملوک نے بغل سے ٹوپی نکالی روح افزا کے سر پر رکھی اور خود دیو کے

سامنے آیا۔

دیو جس طرح آواز دے کر یا شور مچا کر اپنے ہم جنسوں کو بلاتا ہے وہ انداز اہل قبائل کا ہوتا تھا کہ جب قبیلے کا ایک آدمی پکارتا تھا تو سارے نکل کھڑے ہوتے تھے لیکن اس طرح سب کا آ کر جمع ہو جانا دو طرح کے جانوروں میں دیکھا جا سکتا ہے ایک بندروں اور لنگوروں اور قبیل کے دوسرے جانوروں میں اور ایک کوّوں میں اور شاید انہی خصوصیات کو دیو سے وابستہ کیا گیا ہے۔

جب دونوں جزیرہ فردوس کے نزدیک پہنچے تو روح افزا نے تاج الملوک کو روح افزا باغ میں ٹھہرایا اور خود ماں باپ کی ملاقات کو گئی۔ وہ دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ جیسے انھیں دوبارہ زندگی مل گئی۔ روح افزا نے کل سرگزشت کہہ سنائی مگر یہ نہ کہا کہ اس کو رہائی دلانے والا اور دیو پر فتح پانے والا بکاولی کا عاشق ہے روح افزا کا باپ منظفر شاہ باغ میں گیا اور کئی پریاں خدمت پر مقرر کر کے اپنے مکان پر آیا۔

سولہواں باب کا جو منظفر شاہ کا اپنے بھائی فیروز شاہ (بکاولی کا باپ) کو روح افزا کے پہنچنے کی اطلاع کا خط لکھنے اور بکاولی کی ماں کا اس کی ملاقات کو آنے سے متعلق ہے۔ آغاز چوتھے باب کے[1] آغاز سے مشابہت رکھتا ہے۔ راوی شیریں زبان یوں بیان کرتا ہے "ــــ ابواب کے آغاز کا تنوع کس قدر برقرار رہتا ہے۔

منظفر شاہ کا خط ملنے پر فیروز شاہ نے جمیلہ خاتون سے کہا روح افزا کو دیکھنے جلد جاوے۔ بکاولی نے یہ خبر سنی تو اس نے بھی کہلا بھیجا کہ میں بھی بہن کی ملاقات کو تمھارے ساتھ چلوں گی۔ ماں اس خیال سے بکاولی کو ساتھ لے جائے

---

[1] راوی شیریں زبان (بعض نسخوں میں شیریں بیان) یہ داستان یوں بیان کرتا ہے۔

پر آمادہ ہوگی شاید وہاں جانے سے اور بہن کو دیکھنے سے اور مختلف مکان کی سیر سے کدورت کا زنگ دور ہو جائے۔"

منظفر شاہ نے روح افزا کو استقبال کے لیے بھیجا روح افزا چچی کو سلام کر کے اس کے قدموں پر گر پڑی چچی نے اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور آنکھیں چومیں۔ بلائیں لیں اس کے بعد دونوں بہنیں کافی دیر تک گلے ملیں۔

یہاں ہر ایک رسم ہندو تہذیب کی عکاسی کرتی ہے روح افزا کا قدموں پر گرنا پیر چھونا ایک ہی بات ہے۔ دوسری طرف آنکھیں چومنا اور چھاتی سے لگانا مسلمان تہذیب کو ظاہر کرتا ہے چنانچہ اس داستان میں مشترکہ تہذیبیں پائی جاتی ہیں۔

روح افزا نے اس چہل پہل کے دوران بکاولی کے کان میں اس کے چہیتے کے آنے کی مبارکباد دی اور بکاولی کو تاج الملوک کے سامنے لا کھڑا کیا دیکھتے ہی صبر اختیار کی باگ بکاولی کے ہاتھوں میں نہ رہی۔ وہ بھی صبر نہ کر سکا دوڑ کر لپٹ گیا۔ بکاولی حیا کا دامن چھوڑ کر اپنے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے اور دونوں خوب دل کھول کر روئے اور جدائی کے غم کو اپنے آنسوؤں میں بہا دیا۔

خوشی کے موقع پر دونوں کا رونا فطرت انسانی کے خلاف تو نہیں ہے لیکن اردو کہانیاں جس ذہنی ماحول میں لکھی گئی تھیں یہاں اس کا عکس بھی نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ مغربی عمل کی صورت میں اس طرح کے جذباتی رویے عام طور پر فروغ پذیر رہتے ہیں اور یہاں بھی ہم اس صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں اس موقع پر بکاولی اور روح افزا کی طنزیہ باتیں کرنا گھریلو عورتوں کے باہمی رویے کو کسی نہ کسی حد تک ضرور سامنے لاتا ہے (اس سے قبل کئی جگہ حضرت سلیمان کی انگوٹھی) اور قسم کھانے پر گفتگو کی جا چکی ہے اس لیے اس کی یہاں مزید ضرورت نہیں)

بڑوں کا نام ڈبونا اور کنبے کو کلنگ کا ٹیکہ لگا۔ صرف محاورہ ہی نہیں بلکہ اس زمانے کے انداز نظر کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور ایسے کسی جرم کو نہ تو معاشرہ:

معاف کرتا تھا اور نہ اس میں بسنے والے اس کے والدین۔ اس لیے لڑکی کو خاندان کی عزت کہا جاتا تھا اور اس کے قدم بھٹک جانے کو بُرا خیال کیا جاتا تھا کیوں کہ سماج کی بنیادیں انہی اصولوں پر قائم تھیں اس لیے ان تمام باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ (اس تبصرے میں ہی کہانی کے کئی عوامل شامل ہیں)۔

انھوں نے کئی دن بوس و کنار کی لذت اٹھائی اور اپنے اپنے دل کی پیاس بجھائی۔ آخر بکاولی کی روانگی کا دن آپہنچا اور تاج الملوک پھر بیقرار ہوا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

بکاولی اپنے آپ کو اس نہج پر لے آتی اور چار و ناچار گلستان کے لیے عازم سفر ہوئی اور وہاں پہنچ کر ماں باپ کی خدمت میں مشغول ہو گئی۔

اٹھارھواں باب روح افزا کے اپنے ماں باپ پر بکاولی کے عشق کی کیفیت ظاہر کرنے اور روح افزا کی حسن آرا کے —— بکاولی کے ماں باپ کے پاس جانے اور تاج الملوک اور بکاولی کے بیاہ پر ان کو رضامند کرنے سے متعلق ہے۔

کہتے ہیں کہ روایتی انداز سے باب کا آغاز ہوتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ بکاولی کے جانے کے بعد روح افزا اپنی ماں سے شہزادہ اور بکاولی کے عشق کی کل کیفیت کہہ سنائی وہ سن کر بہت دیر تک فکر میں ڈوبی رہی۔ پھر بولی اگرچہ آدمی کا رشتہ پری سے ہونا محال ہے لیکن اس نے میری بیٹی کو دیو کی قید سے چھڑایا ہے اس لیے مجھ پر لازم ہے میں اس کو اس غم فراق سے نجات دلواؤں اور اسے اس کے مطلوب سے ملواؤں۔ اس مقصد سے ایک مصور کو بلوایا اور شہزادہ کی تصویر بنوائی اس طرح گلستان ارم میں تصویر ساتھ لے کر جا پہنچی۔

چند روز بعد جمیلہ خاتون سے باتیں کرتے کرتے مطلب کی بات کہی اور بات کہنے کا ایک انوکھا ڈھنگ اختیار کیا۔ کب تک بکاولی کو کنواری رکھو گی۔ جمیلہ خاتون نے کہا تو نے سنا ہو گا کہ اس نے کسی آدم زاد سے دل لگایا ہے اور اس کا سودا اس کے سر میں سمایا ہے۔ اپنے ہم جنس کو نہیں چاہتی اور غیر جنس کے

واسطے وہ رات دن پڑی کراہتی ہے۔ اس معاملے میں ناچار ہوں جو باپ دادا بزرگوں کا چلن کیونکر چھوڑ دوں اور اس امر کی خواہش سے قدیم سلسلہ کو کس طرح توڑوں۔ اپنے کفوؤں کے ہوتے ہوئے غیر کفوؤں میں کس نے کیا ہے جو میں کروں۔ پری کا آدمی سے کبھی بیاہ ہوا ہے کہ میں بیاہ دوں۔

یہاں ہم جنس ہونے پر زور دیا گیا ہے جب کہ بہت سی داستانوں میں یہ شادیاں ہوتی رہی ہیں اصل بات یہ ہے شادی اپنے ہی طبقہ۔ اپنی ہی گوترا اپنی ہی ذات اور اپنے ہی مذہب میں کرنے کا رواج عام رہا ہے۔ جانوروں میں ضرور ایک جنس کا جانور دوسری جنس کے جانور سے اختلاط نہیں کرتا۔ انسان کے معاملے میں یہ بات صرف ذات پات تک تھی اور کبھی کبھی بہت سختی سے پابندی کی جاتی رہی ہے۔ ایسا عام طور پر نہیں تھا۔ بڑے خاندانوں کے لوگ، کمتر خاندانوں کی عورتوں سے شادی کر لیتے تھے ان کو اپنی باندیاں بنا کر رکھتے تھے جن سے ان کے یہاں اولاد بھی ہوتی تھی مگر حد بندیاں بہر حال قائم تھیں اور پری کی گفتگو سے یہ ہی بات سامنے آتی ہے۔

حسن آرا، جمیلہ خاتون کی ہم خیالی کرتی ہے اور پری لطیف اور آدم زاد کو کثیف کہتی ہے اور دونوں میں رابطے کو عقل سے بعید ٹھہراتی ہے۔ مگر مدلل انداز اختیار کرتے ہوئے کہتی ہے اگر آپ انسانوں کے کمالوں سے واقف ہوتیں تو ایسے خیال دل میں نہ آنے دیتیں۔

حسن آرا یہ بات کر کے جزیرہ فردوس میں آپہنچیں اور شہزادے سے کل قصہ بیان کر دیا اور اسے وصل کا مژدہ سنایا ہے۔

حسن آرا نے انسان کی جس قدر فضیلتیں بیان کی ہیں ان کا بیان معاشرہ کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ کچھ تو صوفیا کے بصیرت خیز بیانات سے کچھ دینی اور مذہبی کتابوں کے سبب اور کچھ دلیوں، درویشوں اور سنتوں کی ہدایات کی وجہ سے۔ یہی معاشرے کی اخلاقیات کے جنم داتا ہیں اور یہی معاشرے کے لیے راہ مستقیم بناتے ہیں۔ داستانی دور کا معاشرہ انہی بنیادوں پر قائم اقدار

یے ہوئے تھا جو مشرقیت کی روح تھیں اور جن پر مغربیت کی پرچھائیں نہیں پڑی تھی۔ خدا کو قادرِ مطلق جانا اور مانا جاتا تھا۔ سب ہی انسانی قوتیں خدا کی ہی ودیعت کی ہوئی سمجھی جاتی تھیں۔

انیسواں باب تاج الملوک اور بکاولی کے بیاہ کے بیان سے متعلق ہے۔ اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے "باغبانِ اس گلستان کا گل و بلبل کی مواصلت یوں بیان کرتا ہے۔" یہ اور ابواب کے آغاز سے مختلف متنوع ہے۔

حسن آرا کے جزیرہ فردوس کے چلے جانے کے بعد جمیلہ خاتون نے ساری گفتگو کا خلاصہ فروزشاہ سے بیان کیا اور شہزادہ کی تصویر جو حسن آرا لائی تھی سمن روپری کے ہاتھ بکاولی کے پاس بھیجی اور کہلا بھیجا تیری مرضی ہو تو اس کے ساتھ بیاہ کر دوں پری دانست میں تو نوعِ انسانی میں ایسا سخن گستر ہوگا بلکہ پریوں پر بھی خوف ہے۔" بکاولی تو یہی چاہتی تھی جمیلہ خاتون کو معلوم نہ کہ یہ وہی آدم زاد ہے جسے اس نے صحرائے طلسم میں پھینک دیا تھا بکاولی فوراً جان گئی۔ یہ ساری سعی روح افزا کی ہے۔ سمن پری نے بھی اور کہا لو اب ہنسو اور خوشیاں کرو اور بکاولی کے پاس سے بادشاہ کے حضور میں آکر عرض کی۔ ہم سب فرزندان آپ کے تابع ہیں آپکی سعادت مندی اس میں ہے کہ والدین کی مرضی کے خلاف نہ کریں اور ہر حالت میں ان کی خوشی کو مقدم رکھیں۔

داستانوں میں اکثر جزیروں کا ذکر آتا ہے یہاں بھی جزیرہ فردوس موجود ہے جزیروں سے دلچسپی اور اس دور کی تہذیبی دین ــــ معلوم ہوتی ہے کہ جب عربوں کے سمندری سفر جاری تھے یہ تجارتی سفر ہوتے تھے۔ لیکن اس کے دوران گاہ گاہ نئے جزیروں تک رسائی ہو جاتی تھی اس کا واضح امکان موجود ہے۔ مغربی قوموں میں جب سمندروں کے سفر شروع کیے تو ابتداً ان کی رہنمائی عرب ملاحوں نے کی تھی الف لیلیٰ میں سندباد جہازی کا سفر ایسی ذہنی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لڑکے

اور لڑکیوں سے پوچھنے کا دستور تو صرف نام کو تھا ایسا بھی اکثر ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو قریب لانے کے لیے تصویر بنائی جاتی تھی آج بھی اکثر بیاہ شادی کے موقعوں پر فوٹو بھیجنے کا دستور دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ بات اکثر کہانیوں میں بھی موجود ہے۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں تمام جزائر کی دوکانوں کو نقش و نگار سے آرائش دی۔ اندر اور باہر نئے فرش بچھ گئے راگ رنگ کی محفلیں برپا کی گئیں۔ ہر طرف شادی کی دھوم مچ گئی تحفے جانے لگے لوگ ضیافتیں کھانے لگے۔ فیروز شاہ ہر ایک کو اس کے رتبے کے موافق خاطرداری اور تیمارداری آپ بھی کرتا اور اہلکاروں پر ہی نہیں چھوڑتا تھا۔

مختلف گھرانوں میں جیسا کہ کسی شاہی یا امرا کے خاندان سے تعلق ہوتا تھا کھانے کی چیزیں دسترخوانوں میں سجا سجا کر بھیجی جاتی تھیں آج بھی اس رواج کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ شادی کے موقع پر گھروں کو سجانا اب بھی ہوتا ہے کیونکہ شاہی خاندان میں شادی ہو رہی ہے اس لیے اس موقع پر گھروں اور بازاروں کی بھی آئینہ بندی سننے میں آتی ہے۔

شادی کے موقع پر امرا میں بھی دستور تھا۔ آج اہل حرفہ تک اس کو نبھاتے ہیں کہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں لڑکے اور لڑکی کا باپ۔ یا خاندان کا کوئی دوسرا بڑا شخص برابر شریک رہتا تھا اب تک یہ محاورہ موجود ہے کہ کوئی "بڑا سر پر نہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ فرقِ مراتب کا خیال ضروری ہے اور اس پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اس کا خیال بڑے ہی زیادہ رکھ سکتے تھے۔

جزیرہ فردوس مظفر شاہ نے بھی ایسی تیاری کی اور لوگوں مہمان داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مقررہ دن امیروں، وزیروں نے زریں لباس کے لیے لشکر کے سردار کے ہاتھ آراستہ ہوئے محل میں حسن آرا نے مصاحبوں اور عواموں کو آراستہ کیا اور ایک ساعت دیکھ کر شہزادے کو دولہا بنایا اور سب رکھ رکھاؤ پورے کیے۔ پھر ایک خوبصورت گھوڑی پر گنگا جمنی

سازنگاکر کلابتوں کی جھالر ڈال کر شہزادہ کو سوار کیا اور منظفر شاہ کی بادشاہوں سمیت۔ شاہزادہ کو درمیان میں لیے ہوئے آگے نوبت و نشان اور دائیں بائیں ــــــ ــــــ دوسرے لوازمات اور سازو سامان شان و شکوہ کے ساتھ بکاولی کو بیاہ لانے کے لیے روانہ ہوا۔

یہ عبارت خود ایک طرح سے تہذیبی تصویر ہے اور اس عہد کے تمدنی ماحول کا عکس پیش کرتی ہے نوبت دہ باجا ہے جسے بجاتے ہوئے آج بھی دولہا کے سامنے سازندے چلتے ہیں نشان شاہی جھنڈا یا پھر ایسی ہی کوئی علامت ہوتی تھی جس کو خاص کر نصب کیا جاتا تھا اور جس سے اس امیر۔ یا اس بادشاہ کے خاندان کا امتیاز اور تاریخ سامنے آتی تھی اس کو نشان کہتے تھے۔

روشن چوکی۔ نفری اور طبلے جیسے سازوں کے ساتھ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ منفقوں کے یہاں شادی کے موقع پر نوبت اور امیر گھروں کے دروازوں پر بھی بجتی ہے اور دولہا کے ساتھ بھی چلتی ہے۔ شادی کی گھوڑی کو بھی آراستہ کیا جاتا ہے اور دہلی میں نوشہ سازی کی رسم بھی ادا ہوتی ہے۔

بکاولی کی آراستگی اور بڑھ چڑھ کر کی گئی جو لباس اور جواہرات و زیورات اسے پہنائے گئے۔ وہ اس زمانے میں شہزادیوں کے بیاہ شادی کے طور طریق کو ظاہر کرتے ہیں کہ چونکہ شاہی طبقہ اعلیٰ طبقہ ہوتا تھا اس لیے اس طبقے میں اہتمام اس کی شان کے مطابق کیا جاتا تھا اس سے نیچے طبقے میں بھی اس سے کم درجہ پر اہتمام کیا جاتا تھا برات بھی اس انداز سے چڑھائی گئی جیسے کہ اس زمانے میں بادشاہوں کے یہاں چڑھائی جاتی تھی (اور جس کا چھوٹا موٹا نمونہ آج بھی سامنے آتا ہے) تفصیل کے بیان میں تخیل کا خاصہ دخل ہے اس لیے کہ وہ ایک غیر معمولی موقع تھا دوسرے پریوں کی دنیا کا اہم ترین واقعہ تھا اس لیے کہ اس سے پہلے پری اور آدم زاد میں یہ رشتہ نہیں ہوتا تھا پھر مفصل بیان سے اس زمانے کے معاشرے میں بادشاہوں کی شادیوں پر کافی روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ کیا جاسکتا

ہے کہ نچلے طبقے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ فرق صرف طبقاتی حیثیت کا ہی رہتا ہوگا اس زمانے میں جتنے زیورات استعمال میں تھے جو جو جواہرات پائے جاتے تھے اور جیسی جیسی رسومات اختیار کی جاتی تھیں سب ہی بیان ہوتی ہیں۔ جیسے نیک ساعت دیکھ کر شہزادے کو دولہا بنانے کے لیے چوکی پر بٹھانا اور دولہا کا رکھ رکھاؤ اور اس کی سج دھج کو ویسی ہی بیان کیا ہے جیسا کہ بادشاہوں کے یہاں ہوتا تھا یعنی شاہانہ جوڑا۔ تاج شاہانہ اور موتیوں کا گوشوارہ۔ سہرا جیغہ و کلغی اور سرپیچ ہار اور ــــ بازو پر جوشن۔ بکاولی کی آراستگی منظوم ہے مثنوی کی مصنف میں نے اس میں اس کو حور جنت بنا دیا گیا ہے چوٹی کا گجوری گوندھا جانا موتیوں سے مانگ بھرنا۔ پیشانی پر افشاں چننا ماتھے پر ٹیکہ لگانا منہ پر سہرا۔ کان میں جھمکا پہنانا۔ نتھ پہنایا جانا۔ دانتوں میں مسّی۔ پان کھانا۔ ذقن (ٹھوڑی) کا جل خال بنانا۔ گلے میں موتیوں کی مالا۔ ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے۔ پاؤں میں خالی سونے کی پائل۔ ہاتھوں میں مہندی لال انگیا اور پھر حسن کا بیان جو اس بیان کے آخر کی مین ہے۔

نظر جس کی پڑی اس پر وہ بولا   شفق میں دیکھنا کیا چاند نکلا

پریوں میں لباس پہننے کا رواج تھا جسکا ذکر بکاولی کے لباس میں آچکا ہے۔ جس سے انگیا کا رنگ جھلکتا رہتا تھا۔ یہ سرخ رنگ۔ شادابی شباب اور خوش حالی کی علامت تصور کیا جاتا تھا جنسی اعتبار سے بھی اس کی اپنی ایک الگ اہمیت تھی آج بھی مہندی لگائی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں مانگ میں سیندور۔ شادی کے وقت ہی لگتا ہے۔ جو خود سرخ ہوتا ہے۔ ارکان دولت نے استقبال کیا اور نہایت تعظیم و تکریم سے لاکر مجلس نشاط و انبساط میں ہر ایک کے تواضع سے بٹھایا اور جمیلہ خاتون حسن آرا کے ساتھ سمدھنوں کا سارا برتاو کیا اور رات کے پچھلے پہر عقد کر دیا گیا مبارک سلامت کا غل۔ شربت پلانا پھولوں اور گوٹوں کے ہار پہنانا الائچیاں اور چکنی ڈلیاں عطر کی شیشیاں پیش کرنا دولہا کو گھر میں لے جانا دولہا کے پاس دلہن کو

مسند پر بٹھانا پھول چھوانا ٹوٹے گوانا پھر آرسی مصحف دکھانا اور دولہا کو باہر جانے کے لیے رخصت کرنا۔ یہ سب کچھ وہی ہے جو تھوڑے تھوڑے فرق سے آج بھی ہوتا ہے اور اس معاشرے میں بھی ہوتا رہے گا۔ یہاں صرف ایک سوال ہوتا ہے کہ کیا پریوں کے دیس میں بھی ایسی رسومات کا ہونا قرین قیاس ہے جو ہمارے ماضی کے اور آج کے معاشرے میں اختیار کی جاتی تھیں اور کی جاتی ہیں۔ غالباً یہاں مصنف اور مترجم دونوں جس ماحول سے تعلق رکھتے تھے وہ اس ہی کی تصویر پیش کر سکتے تھے یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پریوں کے ذکر کو اور ان کی داستان میں مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب کہ بات صرف اتنی ہے مختلف تہذیبوں میں کچھ غائب مخلوقات کا تصور اور وجود تھا لیکن ان کے احساسات ان کے رسم و رواج ان کا ماحول اور تیاریاں اس انداز کی ہوتی تھی جو اس زمانے کی تاریخی اور تہذیبی ہوتی تھیں۔

برات کی رخصت کے وقت دولہا کو گھر میں بلوانا ڈیوڑھی پر چھپال رکھانا دولہا کا دلہن کی گود میں لے کر چھپال میں سوار کرانا۔ دلہن کی سواری پر چاندی سونے کے پھول لٹوانا وغیرہ وغیرہ پھر رخصت کرکے رات بھر کی قیام گاہ پر پہنچا دلہن کا گود میں لے کر مسند پر بٹھانا کھیر چٹوانا

یہ دستور تو آج بھی ہے کہ صرف دلہن کو گود میں اٹھا کر لے جایا جاتا ہے مگر بعض طبقوں میں ہے اور بعض میں نہیں ہے۔

دن تو یوں گزرا رات آئی پردے چھوٹے دلہن کو مسہری پر لے جایا گیا پھر ان کا شوق وصل اور جوش اشتیاق مثنوی کی صنف میں منظوم ہوا ہے۔

دو الماس و گوہر ہوئے پھر بہم
لینے لگے دونوں مزے پھر بہم

بیسواں باب تاج الملوک کا مع بکاولی کے فیروز شاہ اور جمیلہ خاتون سے رخصت ہونے سے متعلق بیان پر مشتمل ہے اور کسی متنوع آغاز کے بغیر بیان واقعہ کی جانب سے پیش قدمی کی گئی ہے۔

بکاولی سے مشورہ کرکے فیروز شاہ اور جمیلہ خاتون سے تاج الملوک سے رخصت کی درخواست کی انھوں نے بخوشی اجازت دی اور ہزار غلام قیصر طلعت اور سیکڑوں لونڈیاں خوبصورت اور سامان جس میں نقد و جنس اور لوازمہ سفر ہمراہ کیا جو نہایت اصلی اور بے شمار تھا۔

جہیز دینے کی رسم قدیم معاشرے سے پائی جاتی ہے یہ بات دوسری ہے ہر دور میں اس کی شکل بدلتی رہتی ہے بادشاہوں، امیروں اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں یہ دستور تھا کہ بیٹی کے ساتھ لونڈیاں یا باندیاں بعض سہیلیاں بھی رخصت کرتے تھے ظاہر ہے کہ متوسط طبقے کے لوگوں میں یہ مالی تاب و توان نہ تھی اس لیے وہ اس رواج کو اپنا نہ سکتے تھے حسب حیثیت ہر طبقہ۔ اس سمت میں یا ایسی کسی سمت کچھ نہ کچھ کرتا تھا۔ معاشرت کا یہ پہلو ہر فرد کے سامنے دنیوی اور دینی مسئلہ کے طور پر ابھرتا ہے اور وہ جو کچھ اس کے امکان میں ہوتا ہے کر گزرتا ہے۔ بعض اوقات اپنے امکانات اور اپنی حیثیت سے آگے بھی بڑھ جاتا ہے جسے بعد کی زندگی میں بھگتتا رہتا ہے۔

شہزادے کی واپسی سے دلبر لبوا اور محمودہ کی جان میں جان آئی لیکن بکاولی کے حسن و جمال سے دونوں کے ہوش جاتے رہے بکاولی نے یہ طور دیکھ کر ان دونوں کو گلے لگایا اور کہا کسی بات کا اندیشہ نہ کرو اور وہ سب آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنے لگیں کسی کو سوتاپے کی جلن نہ ہوتی شہزادہ خود بھی ان کے ساتھ ہنسی خوشی سے اوقات بسر کرنے لگا اور ہر ایک کے حقوق کا واجب طور سے خیال رکھنے لگا۔

سوتیاڈھا یا سوتن سے اختلاف اور اس کی موجودگی سے شدید اختلاف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ اپنے شوہر کی محبت میں کسی کو شرکت نہیں چاہتی اور یہ بات تو اس کے لیے بے حد ناگواری کا باعث ہوتی ہے کہ اس کا شوہر ایک سے زیادہ، عورتوں سے شادی کرکے انھیں اپنے ساتھ رکھے ہندو راجاؤں کے یہاں البتہ ہم بہت سی رانیوں اور باندیوں کو دیکھتے ہیں جن کا

رواج شاید زمانہ وسطیٰ تک ہوا ہوگا۔ قبائل میں ایک سے زیادہ عورتیں بھی رکھی جاسکتی ہیں اور بعض قبائل میں ایک عورت ایک سے زیادہ مردوں کی بیوی بھی ہوسکتی ہے لیکن ہندوستان کا اپنا تہذیبی مزاج یہ نہیں اس کے مقابلے میں اسلام چار بیویاں ایک ساتھ رکھنے کی اجازت دی ہے اور اسلامی معاشرے میں بہت سی باندیاں رکھنے اور ان سے جنسی تعلقات پیدا کرنے کا رواج بھی رہا ہے۔ مذہب اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے لیکن ہر بیوی کے حقوق کی برابر کی سطح پر ادائیگی کے لیے بھی ان لوگوں کو پابند کیا ہے جو ایک سے زیادہ شادیاں کریں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قصہ نگار سوتیا ڈھا کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اس لیے وہ ذہنی فضا کو مکدر نہیں ہوتے دیتا اور مناسب سطح پر دونوں کے حقوق کی ادائیگی کا ذکر ہے برابر کا سلوک عملاً ممکن بھی ہے یا نہیں اس کا صحیح تجربہ ان عورتوں کو ہی ہوسکتا ہے جو ان حالات سے دوچار رہی ہوں خود مسلمان معاشرے میں بھی ہندوستان کی حد تک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج بہت کم ہے یہاں ہندوستانی تہذیب کا پرتو مصنف کے بیان میں ایک اعتبار سے بھی دیکھا جاسکتا ہے اور دوسرے اعتبار سے بھی اس کا عکس پڑتا ہے۔

اکیسواں باب بکاولی کے راجہ اندر کے اکھاڑے میں ناچنے کے لیے جاتے رہنے اور تاج الملوک اور بکاولی میں تفرقہ پڑنے سے متعلق ہے۔ اس بات کا آغاز ایک اور ہی انداز سے ہوتا ہے۔ اہل ہند کی کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ امر نگر نام کی ایک بستی ہے۔ وہاں کے باشندے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور راجہ اندر وہاں راج کرتا تھا۔۔۔ عالم جنات بھی اس کے تابع ہے ساری پریاں اس کی مجلس میں جاتی ہیں رات دن ناچتی ہیں۔

راجہ اندر اور اس کا اکھاڑہ ہندو دیو مالا کا ایک غیر طبقاتی پہلو ہے اس سے بہت سی روایتیں حکایتیں قصے کہانیاں وابستہ ہیں جو نہ جانے کسی نہ کسی انداز سے راجہ اندر کا ذکر آتا ہے اسے دیوتاؤں کا راجہ بھی مانا جاتا ہے اور

یہ اپنی سلطنت میں جلال گوارہ نہیں کرتا جب کبھی ایسا کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے تو یہ اپنی سیاست اور حکایت عمل کو عمل میں لاتا ہے اور رشیوں اور منیوں اور درویشوں کی برسوں کی ریاضت تباہ کردینے کی کوشش کرتا ہے جس زمانے کی تصنیف یہ داستان ہے اس زمانے کی معاشرت اپنے سے پہلے زمانوں کی معاشرت کی مانند اس ہیولائی عالم پر یقین رکھتی تھی۔

انسان کا ذہن اس آنی اور فانی دنیا کے مقابلے میں ایک ایسی دنیا کو تخلیق کرتا رہا ہے جو اپنے حسن کے اعتبار سے باقی رہنے والی ہے۔ امر نگر اس تصور کو پیش کرتا ہے وہاں جو کچھ بھی ہے وہ لافانی ہے۔ خوشیوں، مسرتوں اور راحتوں سے بھرپور ہے اس لیے راجہ اندر کے دربار میں پریاں رقص کرنے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ وسطیٰ دور میں امرا کے یہاں ہوتا تھا کہ طوائفیں بلائی جاتی تھیں۔ قوال۔ نقال اور آرٹسٹ آج بھی مدعو کیے جاتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ بکاولی پریوں کی شہزادی ہوتے ہوئے بھی اندر کے دربار میں رقص کرنے جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا باپ پریوں کا حاکم اعلیٰ ضرور ہے لیکن اندر کا تابع اور فرماں بردار ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بیٹی بھی اس کے دربار میں جاکر رقص کرتی ہے۔ یہ بات تاج الملوک کو اس لیے ناگوار گزرتی ہے کہ مسلم جاگیردار شہنشاہ کا تابع فرمان معلوم ہوتا ہے جو معاشرہ شاہی خاندان میں اپنی بیٹیاں دینے پر فخر کرتا تھا لیکن اس کے گھر کی خواتین نہ بادشاہ کے یہاں جاکر کوئی کام کرتی تھیں اور نہ کسی ناچ رنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ ان تمام کاموں کے لیے عورتوں کا ایک الگ طبقہ ہوتا ہے۔

ایک رات راجہ اندر نے فروز شاہ کی بیٹی بکاولی کو اپنی مجلس میں مدت سے موجود نہ پاکر سبب معلوم کیا ایک پری نے کہا " وہ ایک انسان کے عشق میں سرشار رہا کرتی ہے اور اپنے بیگانے سے اس کو نفرت ہے " راجہ اندر نے غصے میں اگر پریوں کی طرف اشارہ کیا اس کو اس وقت حاضر کرو پریاں تخت رواں لے کر تاج الملوک کے باغ میں اتریں اور بکاولی کو جگا کر کیفیت حال کہی وہ چار و ناچار

گی اور خوف سے لرزتی ہوئی راجہ اندر کے سامنے آداب بجالائی اور دست بستہ کھڑی رہی راجہ اندر نے اسے بہت جھڑکا اور حکم دیا کہ اس کو آگ میں ڈال کر انسان کے بدن کی بو باس نکالو اور یہاں کی صحبت کے قابل بناؤ۔

شہزادی اور بیگمات اپنے شوہروں سے چھپ کر بھی اپنی دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرتی نظر آتی ہیں اس میں انسانی فطرت کا بھی ایک حد تک کوئی تقاضا شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ ہم اس کے پس منظر میں معاشرتی رویوں، نفسیاتی مجبوریوں اور سماجی جبر و کرب کو بھی دیکھنے کی کوشش کریں انسان کی صحبت سے یا غیروں کے ساتھ رہنے سے انسانی وجود ناپاک ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کا احساس بھی دلایا گیا ہے۔ اس لیے روزانہ بکاولی آگ میں ڈال دی جاتی ہے جس سے اس کا وجود راکھ ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ منتروں کے ذریعے وہ اپنی پہلی حالت میں واپس آجاتی ہے اس میں بھی ہندو رسومات کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ آگ ہر چیز کو پاک کر دیتی ہے یا پھر یہ تصور کہ ہڈیاں جل کر راکھ ہونے کے باوجود پھر زندہ ہو سکتی ہیں اور کچھ منتروں کی مدد سے ان ہڈیوں کو ان کے وجود اصلی کی طرف واپس لایا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں استھیوں کے ویسرجن کے وقت جو منتر پڑھے جاتے ہیں وہ بھی اس ذہنی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ایک حالت سے دوسری حالت میں واپس آنے کے بعد نہانا واجب ہو جاتا ہے اس لیے بکاولی اپنے محل میں واپس آکر گلاب سے بھرے حوض میں نہاتی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں حوض کے پانی میں وضو کرنا اور ہندوؤں میں پوجا سے پہلے کنڈ میں نہانا اب بھی مروج ہے۔ کنکھل میں استھیوں کے وسرجن کے بعد واپس آنے سے پہلے مرنے والے کے عزیز و اقارب آج بھی ہر کسی کی پیڑیوں پر اشنان کرتے ہیں۔

پریوں نے بکاولی کو ہاتھوں ہاتھ لاکر آتش کدہ میں ڈال دیا اور جل کر

راکھ ہو گئی پھر پانی پر کچھ منتر پڑھ کر راکھ پر چھڑکنے سے وہ فی الفور جی اٹھی اور اصلی ہیئت میں آکر ناچنے لگی اور ناچنے کا حق ادا کر دیا پھر راجہ اندر سے رخصت ہو تخت رواں کے ذریعے اپنے باغ میں آئی گلاب کے حوض میں نہا دھو کر شہزادے کے پہلو میں جا کر سو رہی اور صبح کو معمولات کے مطابق عمل کرتی رہی۔

یہی معمول عرصے تک چلتا رہا۔ ایک رات شہزادے کی آنکھ کھلی بکاولی کو نہ پاکر ہر طرف باغ میں ڈھونڈا نہ پایا نہایت تنگ خلوت میں آبیٹھا اور اس کی راہ دیکھتا رہا۔ اور اس حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی مگر بکاولی کو صبح بدستور سوتے ہوئے پایا تو تاج الملوک نے حیران ہوا اس کی تحقیقات کے لیے دوسری رات کو آنکھ نہ لگ جانے کے مقصد سے اپنی انگلی چیر کر جاگتا رہا آدھی رات بکاولی اٹھ کر تیار ہوئی اور تخت پر آبیٹھی تو شہزادہ پہنچ کر تخت کا پایا پکڑ کر بیٹھا رہا اور بکاولی کے ساتھ راجہ اندر کے دروازے پر جا اترا —— بکاولی سے معمول کا برتاؤ کیا گیا اور تاج الملوک بھی ایک طرف سے سارا تماشا دیکھتا رہا۔ محفل اور مجلس کا وہ رنگ تھا کہ تمام عمر نہ سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ جب بکاولی کو آتش کدہ میں ڈال دیا۔ بکاولی فی الفور زندہ ہو گئی اور مجلس میں آکر ناچنے لگی تاج الملوک بھی پیچھے پیچھے چلا۔ بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی کوئی نہ جانا کہ کون ہے اور کیوں کھڑا ہے[1] پھر یہ اتفاق ہوا کہ بکاولی کا پکھاوجی بہت ضعیف تھا اس لیے اچھی طرح نہ بجا سکتا تھا اور اس کا ناچ اپنے عروج پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ تیوری چڑھائی تھی۔ تاج الملوک نے یہ دیکھ کر پکھاوجی کے کان میں جھک کر کہا اگر تیری مرضی ہو تو ایک دو گتیں میں بجالوں پکھاوج لے کر چونکہ اس کام میں

---

[1] یہاں انسان کی بو باس کو کسی نے کیوں نہیں جانا یہ راز کھلتا محض بھیڑ بھاڑ کے سبب نہ جانا تو کافی تھا۔ پھر وہ تو پکھاوجی بن کر گتیں بھی بجاتا رہا۔
(ع - ز)

ماہر تھا بکاولی کی خواہش کے مطابق بجانے لگا اس لگن میں بکاولی سے اس کی محبت کا بھی ہاتھ تھا۔ ناچ اتنا فنکارانہ ہوا کہ راجہ اندر نہایت محظوظ ہوا اور اپنے گلے سے نو لکھا ہار اتار کر بکاولی کو عنایت کیا وہ ناچتے ناچتے پیچھے ہٹ کر ہار بکھاوجی کے حوالے کر کے پھر ناچنے لگی۔

معمول کے مطابق تاج الملوک سمیت گئی اور سلام و مجرا کے بعد بکاولی نے عرض کی ایک بجانے والا چالاک دست اپنے ساتھ لائی ہوں اگر حکم ہو تو یہاں آ کر بجائے۔" راجہ کی خوشی پانے پر تاج الملوک بجانے لگا اور بکاولی ناچنے لگی۔ جب ساری محفل غش کر گئی اور راجہ اندر بھی مست ہو کر جھومنے لگا تو بکاولی نے کہا "جو مانگنا چاہتی ہے مانگ۔ بکاولی آداب بجا لائی اور عرض کی اور کوئی آرزو نہیں اس بکھاوجی کو بخشیے کہ یہ آرزو ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ اندر برہم ہوا اور شہزادے کی طرف دیکھ کر کہا تو یہی وہ آدم زاد ہے جسے یہ چاہتی ہے اب ذرا اس کا مزہ چکھ بے محنت اور مشقت بکاولی پری کو کیسے لے جا سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہ ہوگا پھر بکاولی کی طرف دیکھ کر کہا تجھ سے سخن ہار چکا ہوں جا تجھے بخشا لیکن بارہ برس تک تیرا نیچے کا دھڑ پتھر کا رہے گا اس حرف کے ساتھ بکاولی اسی شکل کی ہو کر غائب ہو گئی۔

یہ بارہ برس ہی کیوں۔ چودہ برس کیوں نہیں یا اور کم و بیش کیوں نہیں بارہ کے عدد کی اہمیت کیا ہے۔ برس کے بارہ مہینے کیوں ہوئے۔ بارہ ہی امام کیوں رہے بارہ ہی راشی (ستارے) کیوں ہیں۔ بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بارہ کا عدد نہایت قدیم سے مختلف صورتوں میں رائج ہے اور بیشتر اس کی اہمیت مذہبی بھی رہی ہے۔

اور یہ بہار بوستاں خزاں دیدہ ہو گئی اس کیفیت کو چند اشعار مثنوی میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کا آخری شعر یہ ہے۔

دم بھر جو نشاط عیش ہووے　　خمیازہ پھر اس کا طپش ہووے

بائیسواں باب بکاولی کی تلاش میں تاج الملوک کے سنگلادیپ میں پہنچنے بکاولی سے ملنے اور اس پر چترا وت کی بیٹی کے عاشق ہونے سے متعلق ہے اور کہتے ہیں کہ جملے سے آغاز پاتا ہے۔

تاج الملوک کو پریوں نے اٹھا کر نیچے ڈال دیا اور وہ ایک جنگل میں جا پڑا تین روز تک بے ہوش پڑا رہا چوتھے دن حواس لوٹے تو ہر طرف جا کر شور و فریاد کرنے لگا درختوں سے بکاولی کی خبر معلوم کی اور یونہی بھٹکتا ہوا ایک دن سنگ مرمر کے ایک تالاب میں جا پہنچا چاروں طرف سیڑھیاں میوہ دار درخت گرداگرد۔ وہیں ایک ساعت دم لیا پھر نہا کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے جا پڑا۔ محبوب کے تصور میں کھویا ہوا سو گیا بہت سی پریاں آئیں وہ اس کے حال سے واقف تھیں اس تالاب میں نہلا کر بال سکھانے لگیں شہزادے کو وہاں پڑا ہوا دیکھ کر ان میں سے ایک بولی بکاولی کا پکھاوجی یہی ہے تاج الملوک نے آنکھیں کھول دیں اور پریوں سے نہایت دردمندی سے دریافت کیا "تمہیں کچھ معلوم ہے بکاولی کہاں ہے۔ پریوں کا دل اس کے حال سے متاثر ہوا اور اس پر رحم کرتے ہوئے بولیں "آنکھوں سے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ سنگلادیپ میں ایک بت خانہ ہے اس میں ہے ناف تک نیچے کا دھڑ پتھر کا ہو گیا ہے۔ دن بھر اس مندر کا دروازہ بند رہتا ہے پھر رات کے بعد صبح تک کھلا رہتا ہے۔" تاج الملوک نے دریافت کیا وہ کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔

پراکرت ادب میں عورت ہی بے تابانہ محبت کرتی ہے اور بے چین و بے قرار ہوتی نظر آتی ہے اس کے مقابلے میں قدیم سنسکرت ادب نیز ایرانی پراکرتوں میں اظہار عشق اور بے فراوانی محبت مرد کا حصہ ہے۔ یہاں بھی ہم تاج الملوک کو اس بے قراری عشق میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

اس میں سنگ مرمر کا تالاب اور اس کے چاروں طرف سایہ دار اور پھل دار

درخت مغل باغات کی طرف اشارہ کرتے ہیں مگر یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مندر کے دروازے رات کو کھلے کیوں رہتے ہیں ممکن ہے کہ یہ روایت کسی قدیم دیو مالا سے لی گئی ہو۔ مثال کے طور پر آدھے چاند کو سامنے رکھا گیا ہو۔ اس لیے کہ رات کو مندر کے پٹ کھولنا اور کھلے رہنا اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بعض قدیم مندروں کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سورج ڈوبنے کے ساتھ دیئے جلائے جاتے تھے اور دیوتاؤں کی آرتی اتاری جاتی تھی بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی "مہاکوی کالی داس نے اپنی معروف تخلیق "میگھ دوت" میں مہاکال کے مندر کے بارے میں ایسا ہی کچھ لکھا ہے لیکن یہ مندر تمام رات کیوں کھلا رہتا ہے اور بکاولی اس میں تنہا کیوں رہتی ہے اس پر تعجب ہوتا ہے۔

تاج الملوک کے پوچھنے پر پریوں نے بتایا اگر تو ساری عمر چلے جب بھی وہاں نہ پہنچے،، اس پر تاج الملوک مایوس ہو کر دھاڑیں مارنے اور پتھروں سے سر پھوڑنے لگا پریوں سے اس کا حال نہ دیکھا گیا آپس میں مشورہ کر کے اسے وہاں تک پہنچا دیا اور تاج الملوک نے خود ایک رشک بہشت شہر میں پایا کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا درختوں میں بھی عجب حسن تھا سیر کرتا ہوا بازار میں جا نکلا ایک پجارن برہمن سے ملاقات ہوئی۔ پوچھنے پر برہمن نے بتایا کہ اس ملک کا راجہ چیتر سین ہے اس کے ٹھاکر دوارے کا پجاری ہوں اور پھر پوچھنے پر سب مشہور ٹھاکر دوارے بتائے اور کہا تھوڑے دنوں سے کسی طرف دریا کے کنارے ایک نیا مندر ظہور میں آیا ہے۔ دن بھر دروازہ بند رہتا ہے کوئی نہیں جانتا کہ اس میں کیا بھید ہے۔

یہ سن کر تاج الملوک خوش ہوا اور اس سمت چل پڑا۔ دریا کے کنارے مندر کے دروازے پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر رات کے بعد دروازے کا ایک پٹ کھلا وہ اندر گیا دیکھا بکاولی آدھی اصلی صورت میں اور آدھی پتھر کی دیوار پر تکیہ لگائے پاؤں پھیلائے بیٹھی ہے۔

سنسکرت ادبیات میں جو اپسرائیں ملتی ہیں ان کے پر نہیں ہوتے مگر وہ

اڑنے کا فن جانتی ہیں فارسی زبان اور عربی میں پریوں اور فرشتوں کے پر بھی ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اڑتے ہیں یہاں اس تصور کی نمائندگی کی ہے اور جو پریوں اور فرشتوں کی طرح پرواز کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے کہ آناً فاناً میں ادھر سے ادھر پہنچ سکتا ہے۔

ہوا میں پرواز کا خیال آدمی کو پرندوں کو اڑتے دیکھ کر آیا یہاں سے اس نے یہ خیال بھی کیا کہ انسان بھی کسی غیبی طاقت یا طلسمی قوت کے ذریعہ ہوا میں اڑ سکتا ہے جس کی وجہ سے بہت سی کہانیوں میں اس طرح کے کردار سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ پریوں کا تاج الملوک کا مدد کرنا اور سنگلا دیپ میں پہنچا دینا بھی غیبی امداد کی ذیل میں آتا ہے ورنہ وہ کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

تاج الملوک کو دیکھ کر پوچھا یہاں کیونکر آیا اس نے کل سرگذشت کہہ سنائی اور باتوں ہی باتوں میں صبح ہونے لگی تو بکاولی نے کہا اب یہاں سے جا۔ سورج نکل آیا ورنہ تو بھی مجھ سا ہو جائے گا اور ایک موتی اپنے کان سے نکال کر دیا کہ اسے بیچ کر اسباب درست کر اور وقت گذارے اور گزر بسر کرنے کا اہتمام کر۔ شہر میں جا کر موتی بیچا اور ایک حویلی مول لی۔ اسی طرح وہ روز بکاولی سے ملنے جاتا رہا۔

اس سے آگے چل کر جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ تین لڑکیاں ایک ہی شکل کی ہیں۔ اس میں ایک راجہ کی بیٹی ہے جس کا نام چندراوت ہے۔ دوسری تمولی کی بیٹی۔ نرملا اور تیسری مالی کی بیٹی چیلا یہ تینوں ہی بہت خوبصورت ہیں اور اپنی اپنی شادی کی خود مختار بھی ہیں۔ ایک روز راجہ کی بیٹی تاج الملوک پر عاشق ہو جاتی ہے اور اس کی سہیلیاں اس کو تسلی دیتی ہیں کہ تمھاری شادی اس سے ضرور ہو جائے گی۔ اس قصے سے بھی معاشرے کے کئی تہذیبی پہلو سامنے آتے ہیں۔

یہاں اور باتوں کے علاوہ یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ شہزادی کے

ساتھ دو ایسی سہیلیاں ہیں جو اس کی ہم شکل ہیں اور اس کی طرح شادی کے معاملے میں آزاد اور خود مختار ہیں دکن میں مادرانہ کلچر ہونے کی وجہ سے عورتوں کے لیے خود اختیاری کوئی نئی بات تو نہیں ہے لیکن اس کا تین سہیلیوں کی صورت میں ہونا شاید تیسری بڑی دیوی کی طرف اشارہ ہے۔ عشق یونانی اور ہندوستانی دیومالا سے اخذ کیا گیا معلوم ہوتا ہے اور دیکھتے ہی عاشق ہو جانا اس قوم کی روایت عشق جہاں پردہ کیا جاتا رہا ہے۔ عورتیں کیونکہ سامنے نہیں آتی ہیں بغیر شادی کے کسی دوشیزہ یا عورت سے تو قربت کا کوئی تصور نہیں تھا اس لیے عشق بھی پہلی بار دیکھتے ہی ہو جاتا تھا چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ یہاں لڑکی عاشق ہے اور شہزادے کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی ہے۔

پدماوتی ہندوستانی ادبیات کی ایک معروف ہیروئن ہے اس سے کچھ کم چندراوتی ہے ممکن ہے یہ دوسرا کردار گل بکاولی کی ابتدائی روایت کی زینت کے وقت بنگال میں بہت معروف ہو۔ اور اس لیے سنگادیپ کے راجہ کی بیٹی کا نام چندراوت دیا ہے لہٰذا مختلف کہانیوں کے اجزا ایک دوسرے سے ملحوظ ہیں یہاں یہ بھی صورت ہو سکتی ہے۔

تاج الملوک ہر روز لباس بدلتا اور اس کے جھروکے کے نیچے سے ہو کر نکلتا چتراوت اس کے فراق میں چاند کی طرح گھٹنے لگی۔ چند روز بعد یہ راز ظاہر ہو گیا اور ماں باپ کو بھی معلوم ہوا تو راجہ نے ایک نہایت ہوشیار دلالہ کو بلایا اور شہزادے کے پاس آئی اور ہر طرح سے سمجھایا مگر شہزادے نے جواب دیا بعد سلام نیاز راجہ کی خدمت میں عرض کر کے مجھ جیسے کی پابندی کا خیال کرنا فی الحقیقت پانی پر نقش جمانا ہے اور ہوا میں گرہ باندھنا ہے راجہ شہزادے کے اغماض کرنے سے فکرمند ہوا اور وزیر سے مشورہ کیا اس نے کہا یہ کوئی بات نہیں اور مکاری سے اس کے درپے ہوا کہ چوری کی تہمت میں گناہ گار قرار دے کر اپنا کام نکالے۔

دلالائیں اور کٹنیاں تو قدیم قصے کہانیوں میں بہت زیادہ ملتی ہیں اور نائنیں بھی کام کرتی تھیں یہاں بھی کٹنی کا یہ کردار سامنے آتا ہے کہ وہ شہزادے کو رضامند کر کے آتی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ مہاراجہ خود شہزادے کو پھنسانے کے لیے اس پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور گھٹیا سطح پر اتر کر اس سے معاملہ کرنا چاہتا ہے اس طرح کا کردار جاگیرداری عہد میں کوئی ہو اس کے امکان سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کردار سازی کی کوئی پسندیدہ صورت نہیں۔ ممکن ہے یہ زلیخا یوسف کے قصے کا کوئی اثر ہو اور ایسی کہانیاں بنگال اور کلکتے کے علاقے میں رائج ہوں۔

اس مرحلے میں نکات اور مسائل کے بیان سے قارئین کی توجہ پند و نصیحت کی جانب مائل کی گئی کہ اگر خدا کی رنگا رنگی کو غور و فکر سے دیکھے تو کسی چیز کو شر سے خالی نہ جانے بشر کے بعد خیر ہائے حق تعالیٰ نے بدن سے عالم ارواح کو آزادی دی اس لیے جو حرکت بدن سے ہو وہ اصل میں روح سے ہو یعنی جو کچھ اس عالم میں ہوا سے اس کی طرف ماننا چاہیے لیکن شر نہیں در پردہ خیر ہے۔ کیونکہ وہاں شر کی گنجائش ہی نہیں۔

تاج الملوک کو آخر خرچ کی ضرورت ہوئی اسے سانپ کے من کی یاد آئی اس نے بکاولی سے مانگنے کا خیال چھوڑا جراح سے مہرہ نکلوایا اور زخم پر مرہم رکھ دیا اچھا ہونے پر بازار میں لے گیا جوہری دیکھ کر حیران ہوا وزیر کو خبر کی وزیر نے اس کے ساتھ کئی جوان بھیجے اور اسے پکڑوا لیا دیکھا کہ یہ وہی شخص ہے چوری کے الزام میں قید کیا بادشاہ کو مژدہ سنایا قریب سے اسے قید کیا ہے یقین ہے کہ جو آپ کہیں گے وہی قبول کرے گا ورنہ قید میں پڑا رہے گا۔

جیسا کہ اس سے پیشتر کہا جا چکا ہے کہ مطلب براری کے لیے اس انداز کے فریب بھی معاشرے میں وجود پاتے رہتے تھے اور ارباب اقتدار کے وزیر اور مشیران کی خوشنودی کے لیے اس طرح کے اقدام کرتے ہوں گے یعنی معاشرے

میں دونوں پہلو موجود تھے روشن بھی اور تاریک بھی۔ قریب قریب ہر ایک طبقے
میں کیا اعلیٰ کیا ادنیٰ کیا اور مجبور اور بے بس ہر ایک چیز کو برداشت کرنے کے
علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا تھا اس معاملے میں وہ معاشرہ بھی آج کے معاشرے
سے مختلف نہ تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا کہ کسی بادشاہ سے اس قسم کے گھٹیا
کردار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

تیئیسواں باب تاج الملوک کا چتراوت سے بیاہ ہونے اور اس مندر کو
اٹھا کر دروازے کو کھدوا دینے سے متعلق ہے جس میں بکاولی قید رکھی گئی تھی
اس کا آغاز داستانی اور روایتی نہیں ہے پچھلے باب کے تسلسل کو قایم رکھا گیا
ایک نیا آغاز نہیں دیا گیا اگرچہ ایک نیا باب ایک نئی داستان کا قیام عمل میں
لایا گیا ہے۔

قید میں نہایت تنگ کیے جانے پر بھی شہزادہ چتراوت سے شادی
کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا اور قید کی سختیاں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ایک دن
دربان نے راجہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر اس گرفتار کو آزاد جلد از جلد نہ کیا
گیا تو خون ناحق سر لیجیے گا۔ راجہ نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور بیٹی سے اس کے
پاس جانے کے لیے کہا۔ چتراوت یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور نرملا اور چپلا کے
ساتھ بن سنور کر شہزادہ کے پاس پہنچی۔

یہ معاشرہ خونِ ناحق جزا و سزا کا ماننے والا تھا اور خدا کا خوف اس پر
زیادہ غالب نظر آتا ہے۔

ہر طرح سے شہزادی نے شہزادے کو متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن اس
کی نظر قبول نے کسی کا اثر نہ لیا۔ لیکن چتراوت کی آتش باطن تاثیر دار تھی اس
مقام پر پہنچ کر مصنف رسول مقبول کے حوالے سے کہتا ہے "رسول مقبول نے عبادت
کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا اور عجز سے کہا کہ عبادت تیری میں نے
جیسی چاہیے نہیں کی" پھر کون اپنی عبادت پر نازاں ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے

کہ خود اس کی خاص محبت کا گھر بنائے اور خود یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کی مانند
خاک ہو جائے تاکہ اکسیر پسند بادشاہوں کو سونے سے زیادہ نظر آئے۔ یہی سبب
تھا کہ چتراوت بے سکت ہو کر شہزادے کے سامنے گر پڑی اور بے تابی سے تڑپنے
لگی۔ تاج الملوک کو اس کی تڑپ سے صدمہ پہنچا اور وہ بے اختیار ہو کر اٹھ کھڑا
ہوا اس کو آغوش میں لے لیا اور شادی کرنے پر آمادہ ہوا اس لیے بھی کہ اس کے
بغیر اپنی رہائی نہ دیکھی یہ خبر فوراً بادشاہ کو پہنچائی گئی بادشاہ نے شہزادے کو
قید خانے سے نکلوایا۔ حمام میں بھیجا شاہانہ خلعت عنایت کی رسومات کے
مطابق شہزادی کی شادی کر دی مگر جب تاج الملوک خلوت کدے میں پہنچا
نرملا اور چپلا نے بھی اپنی گرمیاں دکھائیں تو اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر
نہ دیکھا۔ سر نیچے کیے رہا جب پچھلی رات ہوئی تو اٹھ کھڑا ہوا اور بکاولی کے مندر
میں جا پہنچا۔ کئی دنوں سے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اپنا سر دے دے مارتی تھی
اسے دیکھا تو خوش ہو کر کھل اٹھی مگر ہاتھ پاؤں کی مہندی دیکھ کر اس کا منہ غصے
سے سرخ ہو گیا اور بڑا صدمہ ہوا خاموشی کی تاب نہ رہی تو بولی اتنے دنوں کے
بعد آئے تو یہ رنگ ڈھنگ لائے عاشقوں کا نام ڈبو دیا عشق کی آبرو کھوئی اور
اپنا عشق کسی سے ظاہر نہ کرنا اور عاشق کا نام ہرگز نہ بھرنا۔

اس موقع پر تابع الٰہی میں انسان کی طرف سے کوتاہی کا ذکر بہت زور
دار طریقے سے کیا گیا ہے اور اس سے یہ اخلاقی نکتہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسان کو
اپنی عبادت پر کبھی فخر نہیں کرنا چاہتے۔ یہ اس لیے کہ عبادت گزاروں کا یہ
رویہ اکثر خود پسندانہ ہو جاتا ہے دوسری بات یہاں تاج الملوک کو قید
خانے سے رہا کیا گیا ہے اور اس کو نہلا دھلا کر خلعت فاخرہ پہنایا گیا ہے
اس میں حضرت یوسف کے قصے کی ایک جھلک موجود ہے۔ اگرچہ تفصیلات
مختلف ہیں۔

بکاولی بنیادی طور پر ہندو عورت تھی اور دوسری شادی کا تصور اس کے

نزدیک تھا ہی نہیں اور دوسرے وہ مسلسل تکالیف اٹھا رہی تھی اور مندر میں پتھر بنی ہوئی تھی اس سے ہم ایک ہندو عورت کے تہذیبی رویے اور جذبات عشق محبت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں دمگر اس سے قبل تاج الملوک کی دلبر بوا اور خود وہ کے سامنے بکاولی کو لے کر پہنچا تھا وہاں پر ایک مسلمان عورت کا کردار نظر آتا ہے جو حقوق کی مساوات پر زور دیتی ہے، چنانچہ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف کے دماغ میں دونوں مذہبی رویوں کا عکس موجود ہے اور وہ دونوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہاں شہزادے کے ہاتھ پیر لال ہیں اس کا مطلب ہے کہ بعض ہندو اور طبقوں کی طرح مصنف کی نظر میں مسلمانوں میں بھی ایسے طبقے موجود تھے جن کے یہاں شادی کے موقع پر دولہا کے مہندی لگانے کا رواج تھا۔

مصنف نے ان احساسات اور جذبات کو مثنوی میں بیان کیا ہے اور پچاس کے لگ بھگ شعر اس باب کا حصہ بنائے گئے ہیں جس سے تاج الملوک کی کیفیات کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔

اس طرح آپس میں شکوہ و شکایت اور راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور تاج الملوک نے کل کیفیت اور اپنی بے گناہی کا ثبوت میں کہہ دی تو کہیں جاکر بکاولی کے دل کی کدورت کا غبار دھویا گیا۔

صبح ہونے پر تاج الملوک گھر آگیا اور چترا وت کے پلنگ پر سو گیا اور اس کا روز ہی معمول بن گیا دن بھر چترا وت کے ساتھ نقل و حکایت میں وقت گذارتا اور بکاولی کے یہاں پہنچ جاتا چترا وت اس کی اس بات سے نہایت حیران تھی اور دل میں کہتی تھی یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ایک گھر میں مگر پورب پچھم کا سا فاصلہ۔ اس مقام پر پھر نصیحت و پند کا لقمہ دیا گیا ہے وہ جب تک تیرے دل کی آنکھیں اعتبار کے حسن کو دیکھنے والی ہیں تجھے یار کی صورت کیا نظر آسکتی ہے۔ ہر چند بے پردہ ہو پہلے خارِ غیر کو دل کی سرزمین سے اٹھا کر پھینک دے گل

رخسار یار کو آئینہ دل میں دیکھے۔ اگر تو اپنے گلشن وجود کو بنظر تامل دیکھے تو اس میں رنگ و بو کے سوا کچھ نہ پاوے۔ یعنی سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ایک مرکز میں کھو جانے ہی سے مطلوب حاصل ہوتا ہے یہ شعار شہزادے نے اختیار کیے رکھا تھا آخر ایک دن چترا وت نے اپنے باپ سے اسکا ذکر کیا اور شہزادے کی بے التفاتی کا حال کہہ دیا راجہ نے کئی جاسوس لگائے وہ تحقیق کر کے بتائیں کہ وہ ساری رات کہاں رہتا ہے اس لیے شہزادہ گھر سے نکلا اور اس مندر میں گیا اور صبح کو محل میں داخل ہو جاسوسوں نے راجہ کو سازی کیفیت بیان کر دی۔

عشقیہ جذبات کے سلسلے میں تصوف کی روشنی میں جو تعبیرات پیش کی گئی ہیں اس کی پرچھائیں اس دور کی دوسری داستانوں میں بھی ملتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چترا وت نہ اس سے خود پوری طرح آگاہ ہوتی ہے نہ اپنے ماں باپ اور سہیلیوں سے اس کی شکایت کرتی ہے اس صورت حال کو بیان کرنے میں قصہ نگار نے شاید ہندو عورت کی بے پناہ وفاداری کے جذبے کو آگاہ کرنا چاہا ہے۔ اس پر بھی بہر حال وہ صورت ہے اور شہزادے کی بیوی ہے اس لیے زیادہ دنوں تک صبر نہیں کرتی اور اپنے باپ سے اس کا گلا کرتی ہے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ باپ سے اس کا گلا کرتی ہے۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ باپ سے اپنے شوہر کی بے التفاتی کا ذکر کرتی ہے ایسا کیوں ہے؟ جبکہ اس کی دو سہیلیاں موجود ہیں جو اس کے بہت قریب ہیں ہو سکتا ہے کہ اس لیے کہ چترا وت کا باپ راجہ ہے اور اس کی شکایت پر جملہ کارروائی شروع کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مندر کو کھدوا ڈالا۔

راجہ نے کئی سنگ تراش بلائے اور اسکو کھود کر پھنکوا دیا۔ جب رات کو حسب معمول تاج الملوک گیا تو وہاں کوئی نشان نہ پایا وہ دیوانوں کی مانند خاک پر لوٹنے لگا آخر کار چند روز یونہی بیزار رہنے کے بعد اس نے رونے کا حاصل نہیں دیکھا اور چترا وت کی جادو بھری باتوں پر متوجہ ہوا۔

راجہ کا ایک عبادت گاہ کو توڑ ڈالنا اس اعتبار سے توصحیح ہوسکتا ہے کہ وہاں ایک مجرم آتما موجود تھی لیکن اس میں جو بے تکلفی اختیار کی گئی ہے اس کا تعلق یا بالگمان غالب اس سے بھی ہے کہ لکھنے والا مسلمان ہے۔

چوبیسواں باب بکاولی کے ایک کسان کے یہاں پیدا ہونے اور تاج الملوک کو ملنے اور اس کے جتر اوت اور بکاولی کے ساتھ ملک نگارین کو پہنچنے کے بیان سے متعلق ہے۔ اس کا آغاز عام داستانی انداز کا ہے "یعنی کہتے ہیں۔"

مندر کی زمین کو ایک کسان نے جوتا بو یا سرسوں خوب پھولی۔ تاج الملوک اس کی ہریالی دیکھنے جاتا اور اپنے دل کو اس کے قرب سے تسکین دیتا جب سرسوں پھولی تو شہزادہ دونوں وقت وہاں جانے لگا اور اپنے گل رو کی خبر سرسوں کے پھولوں سے پوچھتا رہتا۔

فصل اٹھائی گئی سرسوں سے تیل نکالا گیا یہ کسانوں میں چلن تھا کہ ہر چیز جو کھیت میں پیدا ہو اس کو پہلے اس کے گھر والے کھاتے۔ اس لیے وہ تیل اس کی جورو کے کھانے میں آیا حالانکہ وہ بانجھ تھی مگر خدا کی قدرت سے حاملہ ہوئی اور نو مہینے بعد ایک پری پیکر لڑکی پیدا ہوئی۔

ہندوؤں میں زندگی کے ساتھ ساتھ آواگون کا تصور بھی موجود ہے جس کی رو سے مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں جنم لیا جاتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ جون بدل جائے اس لیے بکاولی بھی ایک کسان کے یہاں لڑکی کی شکل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ زمین سے سرسوں کی صورت میں اُگی ہے اور جب وہ سرسوں کا تیل کسان کی بیوی کھا لیتی ہے تو حاملہ ہو جاتی ہے یہاں تو عورت کا شوہر موجود ہے اگر نہ بھی ہوتا تب بھی اس طرح عورت کا پُراسرار طریقے سے حاملہ ہو جانا بہت سے قصوں میں آیا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسان کے یہاں فصل کو پہلے خود استعمال کرنے کا رواج تھا دلیا بھی یہ قدرتی ہے اور اس معاشرے میں بھی ——

متصور کیا جاسکتا ہے۔ اور یوں یہ رواج ہونا بھی چاہیے کیوں کہ کھیتوں کی پیداوار ان کے لیے تبرک یا پرشاد کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر زمانے میں یہی ہوتا رہا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں دھرتی پوجا کا رواج رہا ہے غالباً اس کی بھی یہی وجہ ہے۔

اس کی شہرت چاروں طرف ہو گئی اس کی خوبصورتی اور رعنائی کے چرچے کی بات تاج الملوک کے کان تک بھی پہنچی وہ سمجھا کہ یہ تاثیر اس سرسوں کا ہے کسان کو اس کی بیٹی سمیت بلوایا اس پر نظر پڑتے ہی تاج الملوک کو بکاولی کی شکل دکھائی دی وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اسے بہت سے روپے دیئے اور کہا اس لڑکی کی بخوبی پرورش کرے۔

جب لڑکی سات برس کی ہوئی اس کی شادی کے پیغام آنے لگے لیکن اس خیال سے کہ شہزادے نے اس کی پرورش کی تاکید کی ہے نہ جانے وہ کیا چاہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کسان نے سوچا میری جان پر آبنے اس لیے اس نے کسی طرف کا پیغام قبول نہیں کیا اور ہر ایک سے کہا جب لڑکی بالغ ہو جائے گی پھر جسے وہ پسند کرے گی اس کے ساتھ بیاہوں گا۔

ہندوؤں اور ہندوستان کی دوسری مسلمان اور غیر مسلمان ذاتوں میں چھوٹی عمر کی شادی کا رواج عام رہا ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو دودھ پیتی بچی کی شادی کر دی جاتی تھی اور رخصت بعد میں کرتے تھے لڑکوں کے گھر سے رشتہ آنا مسلمان تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔

دسواں برس شروع ہوا تاج الملوک نے ایک مشاطہ کو کسان کے پاس شادی کا پیغام دیکر بھیجا یہ سن کر وہ بیچارہ کانپنے لگا کہ میرا یہ مرتبہ کہاں کہ بادشاہ کے داماد کو اپنا داماد کروں آخر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ میری بیٹی لونڈی بن کر رہے گی۔ ایسی خوبصورت بیٹی کو راجہ کی بیٹی کی لونڈی بناؤں۔ یہ بات لڑکی نے سنی اس نے کہا "میرا نام بکاولی ہے اور میں پری ہوں تم ایسا

اندیشہ بالکل نہ کرو کہ گُلِ رنگین کی جگہ سر پر ہے اور بے بہا موتی کا مقام بادشاہوں کا تاج ہے تم شہزادے سے کہلا بھیجو چند دن ابھی اور ٹھہرو کسان چپ ہو رہا اور یہی مشاطہ کے ہاتھ کہلوا بھیجا۔

اگرچہ بکاؤلی نے کہا میں پری ہوں لیکن کسان کے گھر پیدا ہونے سے وہ غیر جنس نہ رہی معاشرے میں جنس اور کفو کا بڑا خیال کیا جاتا تھا۔

تاج الملوک خوشی سے پھولا نہ سمایا اور مشاطہ کو بہت سا انعام دیا۔ اور بکاؤلی کی نحوست اور راجہ اندر کی بددعا کے اثر کا زمانہ نہ رہا تو سیکڑوں پریاں چاروں طرف سے آئیں اور تمن روپری بھی لباسِ پرتکلف اور جواہرات تمام پریوں کو باہر چھوڑ آپ اکیلی اندر گئی اور چترا وت کا ہاتھ پکڑ کر بہنوں کی طرح گلے لگایا۔ چترا وت اس کی سج دھج دیکھ کر بے حواس ہوئی اور مسند سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ پھر بکاؤلی نے اول سے آخر تک سرگذشت کہی اور شہزادے کی سنی پھر چترا وت سے کہا کہ اگر شہزادے کی رفاقت منظور ہو تو اٹھ کھڑی ہو وہ بھی تمہارا گھر ہے۔ چترا وت بولی میری جان شہزادے کے ساتھ ہے پھر اس جسمِ فانی کو کیونکر رکھ سکوں گی میں دل سے حاضر ہوں اس کے بعد بکاؤلی نے پریوں سے ظاہر ہو جانے کے لیے کہا۔ سارے شہر میں دھوم پڑ گئی لوگ گھبرائے راجہ بھی مضطرب ہو کر وہاں دوڑا آیا۔ شہزادہ استقبال کے لیے آیا اور چند قدم آگے جا کر مسند پر بٹھایا اور راسے اپنا اور بکاؤلی کا کل حال کہہ سنایا وہ پہلے تو بہت کڑھا پھر چترا وت کا ہاتھ پکڑ کر بکاؤلی کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا میری یہ اکلوتی بیٹی ہے تیری پرستاری میں اس توقع پر دیتا ہوں کہ اس پر مہربانی کی نظر رکھنا اپنی لونڈی جان کر یہ کہا اور رخصت کیا۔ تاج الملوک تخت پر بیٹھا اور دائیں بائیں چترا وت اور بکاؤلی بیٹھیں اور نرملا چپلا اب اس کے سامنے کھڑی رہیں۔ پریاں تخت لے کر اڑیں اور تاج الملوک کی ڈیوڑھی پر جا کر رکھ دیا بکاؤلی اور چترا وت اندر گئیں زین الملوک کے وزیر

کا لڑکا بہرام دوڑا آیا آداب بجا لایا اور اپنا نام و نشان بتایا تاج الملوک نے اس پر بہت نوازش کی نذر قبول کی اور خلعت دیا پھر محل میں داخل ہوا۔ دلبر اور محمودہ دیکھتے ہی نہایت شاد ہوئیں پھر چترا وت اور بکاؤلی سے بہت خوش ہو کر ملیں۔

دولہا دلہن کو چوکی پر بٹھانا یا کسی طرح کے اسٹیج پر فروکش کرنا قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ یہاں صرف ایک بات ہی قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ چترا وت کا باپ اس کا ہاتھ بکاؤلی کے ہاتھ میں دیتا ہے اور کہتا ہے میں اس کو باندی کے روپ میں تم کو دیتا ہوں اس لیے کہ وہ بکاؤلی کو تاج الملوک بیاہتا بیوی سمجھتا ہے لڑکی کو رخصت کرتے وقت آج بھی اس طرح کے کلمات ان لوگوں سے کہے جاتے ہیں جن کے یہاں لڑکی رخصت ہو کر جاتی ہے۔ باقی اس موقع میں آرائش کا اندازہ بھی ملتا ہے ممکن ہے کلکتہ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں اس انداز سے شادی میں دولہا دلہن کا استقبال کیا جاتا ہو ہندوؤں میں منڈپ تیار کرنے کا رواج تو اب تک ہے۔

چھبیسواں باب فیروز شاہ، منظفر شاہ اور اپنے باپ زین الملوک کو لکھنے اور ان کے تاج الملوک کی ملاقات کو آنے اور بہرام کی روح افزا پر عاشق ہونے سے متعلق ہے اس کا آغاز روایتی آغاز سے منفرد ہے اور پہلے آغازوں سے متنوع ہے۔ مصورِ نگارستان اس عشق کی داستان کی تصویر صفحۂ کاغذ پر یوں کھینچتا ہے۔

تاج الملوک نے اپنے آپہنچنے کا مژدہ فیروز شاہ منظفر شاہ اور زین الملوک نے لکھ بھیجا ہر ایک کا دل اس مژدہ سے تروتازہ ہو گیا فیروز شاہ نے جمیلہ خاتون کے ہمراہ بڑی شان و شوکت سے اور جاہ و حشمت سے شرقستان کی طرف کوچ کیا اور منظفر شاہ اور حسن آرا روح افزا کو ساتھ لیے اس تجمل سے روانہ ہوئے اور زین الملوک بھی خاص محل کو ہمراہ لے کر بڑے کروفر کے ساتھ روانہ ہوا۔ اور سب کے سب تھوڑے دنوں میں ملک نگارس آپہنچے۔

رجواڑوں اور بڑے جاگیرداروں کے مابین جب شادیاں ہوتی تھیں تو اس طرح جشن منائے جاتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب بکاولی رخصت ہو کر اپنی سسرال آئی تو کسی نے کوئی رسم ادا نہیں کی جب کہ دلہن نے استقبال کے لیے کچھ رسمیں قریب قریب ہر علاقے میں موجود ہیں اہل دربار اور خانہ زادوں کو بھی انعام دینے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا یعنی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی توجیہی کیونکر کی جاسکتی ہے شادی کے مہمان عام طور پر تین دن کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں اور کچھ خاص خاص افراد کو اس کے بعد بھی روکا جاتا ہے۔

ملک نگاریں اور اس کے گرد و نواح میں انسانوں اور عزیزداروں کی اتنی کثرت ہوئی کہ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ تاج الملوک اور بکاولی کے دیدار سے دلوں سے رنج والم دور ہوئے اور تین دن تک جشن رہا اور چوتھے دن ہر ایک اپنے اپنے وطن کو رخصت ہوئے مگر بکاولی نے روح افزا کو چند دن اور بھی اس کی صحبت سے محظوظ ہونے کے لیے عقیق کا دالان اس کی خواب گاہ کے طور پر مقرر کیا۔

تین دن کے جشن کا بہت پہلے سے معاشروں میں رواج رہا ہے مگر ویسے تو ہر طبقہ میں خاص کر ہندوؤں میں شادیوں کا جشن اور شادیوں کے رسم و رواج پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تیسرا دن گزرنے پر برات رخصت کی جاتی تھی۔ اس رواج کی آج بھی کہیں کہیں ہلکی سی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ پہلے تو کسی جگہ تین دن کے بجائے سات دن تک جشن برپا رہتے تھے مگر یہ خصوصیت سے اعلیٰ طبقے میں اور بادشاہوں اور بڑے بڑے امیروں کے یہاں ہی ایسا ہوتا تھا۔

روح افزا رات گئے تک سرگرم گفتگو رہی پھر اپنی خوابگاہ میں جا کر سو رہی ایک رات اس کی جوتی سوتے ہوئے کھڑکی سے باہر پڑی تھی اس کے ہوباف میں ایک گوہر شب چراغ چمک رہا تھا بہرام (وزیر زادہ) چاندنی کی سیر کرتا ہوا ادھر

آنکلا نظر پڑی تو سمجھا کالا ناگ اپنا پھن لیے اوپر چڑھا جاتا ہے مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ کسی کی جوتی میں لعل چمکتا ہے۔ سوچا شاید بکاولی یہاں سوتی ہے۔ مگر اس کا دل ساری رات پیچ و تاب کھاتا رہا اور صبح کو سمن رو پری سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ روح افزا کی خوابگاہ ہے یہ سننا تھا کہ اسے عشق کا سودا ہوا اور آدھی رات کو کمند لگا اس کے مکان میں جا اترا اور بے تابانہ دالان کے اندر چلا گیا۔ اسے سوتا ہوا دیکھنے کی کیفیت سے دیوانہ سا ہو گیا یہ مزہ پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ اس لیے وحشت کو سنبھال نہ سکا اور بدمستوں کی طرح جا کر اس سے ہم آغوش ہو گیا روح افزا کی آنکھ کھل گئی اگرچہ اس کا شیشہ دل بہرام کے عشق سے چور ہو چکا تھا لیکن یہ بدمستی اور بے باکی اس کی طبع نازک پر گراں گزری جھنجھلا کر ایسا طمانچہ مارا اور دھکا دیا کہ کھڑکی کے نیچے جا پڑا اور روتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

ذکر سن کر عاشق ہونا کہانیوں میں بہت ملتا ہے۔ کمند لگا کر اوپر چڑھنے کا قصہ بہت سی داستانوں میں موجود ہے لیکن عام طور پر یہ واقعہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی محبوبہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے جو خود بھی انتظار کر رہی ہوتی ہے لیکن یہاں تو وزیر زادہ ایک محو خواب وزیرزادی کی خواب گاہ تک پہنچتا ہے اور مزید بدتمیزی یہ کرتا ہے کہ اس سے ہم آغوش ہوتا ہے اور طمانچہ کھاتا ہے اور کھڑکی سے نیچے گرتا ہے اس سے کم از کم ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاہی معاشرے کے امرا اپنے مقام اور وقعت سے گر کر کچھ خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے تھے اور اس گراوٹ کا اندازہ بعض دوسرے قصوں سے بھی ہوتا ہے لیکن وہ روتا ہوا گھر واپس ہوتا ہے یہ ایک مضحکہ خیز صورت ہے اور قصہ نگار کی اہلیت سے یہ بالکل ظاہر ہو جاتا ہے کہ ــــــ وہ شاہی معاشرے اور اس کے آداب سے اچھی طرح واقف نہیں۔

صبح کو روح افزا نے بکاولی سے رخصت چاہی بکاولی ہر چند منت سماجت سے روکنا چاہا لیکن روح افزا نہ مانی اس لیے کہ رات کی بات ظاہر ہونے سے

بکاولی ہنسی اڑائے گی اور جھڑے گی کسی طرح نہ مانی اور جزیرۂ فردوس کی راہ لی لیکن
نہ دن کو چین آتا تھا نہ رات کو آرام ملتا تھا۔ ہر وقت بہرام کا عشق ستائے رکھتا
تھا اور یہ بات صداقت پا چکی تھی کہ عشق معشوق پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور
کسی کے گلے میں عشق کی کمند ڈال کر دنیا کے کسی گوشے سے بھی اپنے حضور میں
کھینچ لائے کسی کو تمام عمر ہجر میں بسر کرنے کے لئے مصروف رکھے ادھر روح افزا
کی ایسی کیفیت تھی ادھر بہرام بھی دن رات میں کسی آن چین نہ پاتا تھا اور
چاہتا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے اور جیسے بھی ہو معشوق کا قرب حاصل کرے چاہے
اس میں جان جائے چاہے رہے۔

چھبیسواں باب سمن رو پری کی مدد سے بہرام کے جزیرہ فردوس میں پہنچنے
اور نقشہ کی توجہ سے روح افزا سے ملنے کے متعلق ہے اور کہتے ہیں کہ روایتِ داستان
آغاز سے شروع ہوتا ہے۔

بہرام کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے اس کے عشق کے راز سے سمن رو
پری کے سوا اور کوئی واقف نہ تھا۔ وہی اس کو ہمیشہ نصیحت کرتی ہے کہ اس خیال
سے درگزر رہ اور دل سے یہ خام خیال دور کر کیوں کہ غیر جنس کا شجر محبت
جدائی کے سوا کوئی پھل نہیں دیتا۔

نصیحت کرتی ہو ناحق تم اتنی   نہیں جائے گی زنگی سے سیاہی

آخر ایک دن سمن رو پری نے کہا "مجھ سے تیری امداد اور تو کچھ نہیں ہو سکتی
لیکن اگر تو کہے تو جزیرۂ فردوس میں تجھے پہنچا دوں آگے تیری قسمت بہرام نے
یہ خوشی سے قبول کیا۔ اس لیے سمن رو پری اسے زنانہ لباس اور گہنے پہنائے
پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر جزیرہ فردوس لے جانے کے لیے اڑی اور اپنی منہ بولی
بہن کے گھر جا کر اتری اس کا نام بنفشہ تھا اور وہ روح افزا کی مشاطہ تھی وہ
سمن رو کے آنے سے بہت خوش ہوئی اور بہرام کے بارے میں جو نوجوان لڑکی
کے بھیس میں تھا پوچھا سمن رو پری نے بتلایا یہ پری میری دینی بہن ہے اس کا جی

اس سرزمین کی سیر کرنا چاہتا تھا اس لیے تمہارے پاس لائی ہوں اسے خوب
اچھی طرح سیر کراؤ اور پرستان کے تماشے دکھاؤ۔

بہرام کو پہنچا کر سمن رو پری واپس آ گئی۔ بنفشہ بہرام کی ہر خوشی کا خیال
رکھتی اور اسے دنیا کی نعمتیں کھلاتی اور دن کو ہر ایک باغ میں لے جاتی اور شام کو
لوٹتی۔ یوں چند روز گزرے ایک روز بنفشہ کہیں گئی ہوئی تھی تو بہرام نے مشاطہ
کے اسباب میں سے آئینہ نکالا اور اس کی پشت پر چند شعر لکھ کر آئینہ ویسے ہی
رکھ دیا۔ بنفشہ اپنے وقت پر روح افزا کے یہاں گئی اور کنگھی چوٹی کر کے آئینہ جو
اس کے ہاتھ میں دیا روح افزا کی نظر اس کی پشت کے نوشتہ پر پڑی اور وہ جان
گئی اس کا لکھنے والا بہرام ہے لیکن اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اس نے بنفشے
کہا اے بنفشہ جو چیز ہمیشہ ہے وہ کیا اور وہ شے جو مدام غم کے ساتھ ہے کون شے
ہے۔" لیکن بنفشہ کو اس کا جواب نہ سوجھا اس نے کہا اس کا جواب کل دوں گی۔

بنفشہ گھر آئی اور پہیلی پوچھنے کی منتظر رہی بہرام یہ کیفیت بھانپ گیا
اور کہا آج اتنی بے حواس کیوں ہو تو بنفشہ نے روح افزا کا سوال بیان کیا اور
مجھے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا کہ اس حکیم مطلق کو دوام ہے اور شادی غم
سے وابستہ مدام ہے بہرام نے کہا اس کا یہ جواب ہرگز نہیں بلکہ یہ ہے کہ جس عاشق
کے منہ پر معشوق کے ہاتھ کے طمانچے لگے ہیں وہ ہمیشہ سرخ رو ہے اور مدام ناخوشی
سے تلخ کام وہ ہے کہ جس کا محبوب ہے ———— اور وہ ہر ایک چیز کو اپنا
محبوب سمجھتا ہے۔

بات صرف یہ ہے کہ تاریخوں اور کہانیوں میں اکثر پڑھنے میں آیا ہے کہ دوسروں کی
عقل اور فکری رسائی کو جاننے کے لیے عجیب و غریب سوال کیے جاتے تھے اور
بعض باتوں کا انحصار جن میں لڑکی کی شادی بھی کر دینا شامل ہے ایسے سوالوں
کے جواب پر ہی منحصر ہوتا تھا۔ ہمیشگی اور دوام کا تصور اس تہذیبی دور کی بڑی
آرزو بنا اور رفتہ رفتہ اس سے بعض عقائد پیدا ہو گئے۔

اس مرحلے میں یہ نقل درمیان میں لائی گئی ہے کہ مجنون سے پوچھا کہ خلافت پیغمبر کے بعد خلفائے راشدین میں سے کسی کا حق تھا اس نے جواب دیا لیلےٰ کا۔

بنفشہ نے دوسرے دن روح افزا سے یہی جواب کہہ دیا روح افزا اس جواب سے بہرام کا آنا یقیناً جان گئی اور بنفشہ سے کہا "سچ کہہ یہ جواب کس نے دیا ہے بنفشہ نے کہا بات کو میرے خیال میں گزرا تھا لیکن روح افزا نے ہرگز نہ مانا آخر بنفشہ نے مجبور ہو کر جو حقیقت تھی کہہ دی۔

روح افزا نے کہا اس کو ہمارے روبرو کیوں نہ لائی آج اپنے ساتھ لے آنا میں بھی تو دیکھوں۔

رات ہوئی تو روح افزا پریوں کی مجلس سے خلوت سرا میں آئی اور بہرام کو اکیلا لے کر بیٹھی اور اجنبیوں کی طرح سے بات چیت کا آغاز کیا اور نام و ملک پوچھا۔ بہرام نے کہا کہ چہ ننگ و نام تو مجھ سے کبھی کا چھوٹ چکا ہے تیرے نام کے سوا کچھ نہیں۔

اس مرحلے پر پھر مصنف نصیحت و پند کی رو میں آجاتا ہے اور لکھتا ہے "اگر اپنی عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے گا تو تجلی یار سے فائدہ نہ اٹھائے گا اور اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیات ابدی کب تیرے ہاتھ آئے گی جو راہِ عشق میں آپ سے گذرا وہ منزل مقصود پر کب پہنچا۔

مگر دشمنوں کی نظر سے چھپائے رکھا۔ اس نے اس کے گلے میں ایک طلسم باندھا اور اسے قمری بنا کر ایک سونے کے پنجرے میں رکھا ——

—— رات کو پنجرے سے نکال آدمی بنا صبح تک اس کی محبت سے لذتیں اٹھاتی چند مہینے یوں گزر رہے آخر کچھ بو باس حسن آرا تک پہنچی۔ ایک دن نور کے تڑکے اس کا پتہ لینے آئی جب روح افزا کے پاس پہنچی دیکھا کہ اس زلف مشکیں کا طور بے طور ہے اور خال سے بے حال ہے۔ پشواز چولی کی حالت اور طرح کی پائی اور انگیا کی صورت کچھ اور ہی نظر آئی وہ جان گئی

کہ یہ یاقوت ضرور کسی الماس سے ٹکرایا ہوا ہے دوڑ کر غصے سے دو ہتڑ پیٹھ پر مار کر کہنے لگی۔ کل کا نام ڈبو دیا۔ تجھے غیر مرد سے حیا نہ آئی۔ حیف تیری زلیست پر چلو بھر پانی میں ڈوب مر تو نے باپ کا نام خراب کیا سچ بتا کہ یہ کیا ماجرا ہے نہیں تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ روح افزا ڈر سے تھرتھراتی تھی اور کہتی تھی اماں مجھے تیرے سر کی قسم جو میں نے کسی مردوے کو دیکھا بھی ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ فقط تہمت ہے تم ——— ماں ہو کر بیٹی کو عیب لگاتی ہو اور لوگوں کے کہنے سننے پر جاتی ہو۔

جادو ٹونے کا یہ اثر ہوتا تھا کہ روح اپنا جون بدل لیتی تھی اور ایک قالب سے دوسرے کے قالب میں آجاتی تھی۔ اس سے قبل اس داستان میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

کُل کا نام ڈبونا باپ کا نام خراب کرنا اور غیرت دلانے کے لیے چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا معاشرے میں لاج کی اہمیت کا پتہ دیتا ہے کل اور باپ کے نام کو عزت اور آبرو کا نشان جانا جاتا رہا ہے اور کسی ایسے ویسے پر غیرت دلانے کے لیے چینی (چلو) بھر پانی میں ڈوب مر" کہا جاتا ہے۔ لڑکیاں بھی کُل اور باپ کے نام کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھیں یہ ایک مسلمہ قدری حیثیت رکھتا تھا۔ اور ماں کا بیٹی کو عیب لگانا بڑا ہی عجیب خیال کیا جاتا تھا۔

حسن آرا نے روح افزا کی قسموں کا یقین نہ کیا اور اس بات کے درپے ہوئی کہ چور کو پکڑنا چاہیے اس لیے ہزاروں جاسوسوں اور عیاروں نے زمین آسمان ہر جگہ ڈھونڈ ماری مگر پنجرے کا بھید کسی پر نہ کھلا۔

آخر حسن آرا نے روح افزا کی خواصوں کو منظفر شاہ کے غضب سے ڈرایا تو گل رخ خواص اس کے پاس آکر بولی کہ اس کی خلوت سرا کا بھید ہم پر کیسے کھلے نہ وہاں گزر نہ دیدہ بان نینا۔ لیکن ان دنوں تمہاری صاحبزادی صبح و شام اس قمری سے مشغول رہتی ہے اور اس کے پنجرے کو ایک دم آنکھ سے اوجھل نہیں کرتی ظاہر میں تو یہ پرندہ ہے۔ باطن کی ہم کو بالکل خبر نہیں۔

جانوروں کو انسان کرنا اور انسان کو جانور بنانا طلسماتی دور میں یقین رکھنے
کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حسن آرا روح افزا کی نشست گاہ میں گئی اور پنجرہ اتار کر لے چلی روح افزا
کلیجہ پکڑ کر رہ گئی منہ سے کچھ بول نہ سکی مگر اس کا طائر روح اس کے قفس تن میں
بے طرح پھڑ پھڑایا۔ منظفر شاہ نے قمری کو پنجرے سے نکال کر اس کے پر و بال
کھولنے لگے پر ہاتھ پڑا تو تعویذ نظر آیا اس کو کھولا تو قمری آدمی ہوگیا۔ وہ یہ
دیکھ کر آتش غضب سے جلنے لگا اور کہا "سچ بتا تجھے اس جزیرے میں کون لایا
اور محل میں کس نے پہنچایا۔ اس ڈھٹائی کا ثمرہ تیری ہلاکت ہے بہرام نے
جواب دیا عاشقوں کا مرنا جذبۂ اشتیاق ہے اس عشق کی زنجیر وہ نہیں کہ کوئی
اپنے پاؤں میں ڈالے جس نے زندگانی سے ہاتھ دھوئے اسے موت سے کیا ڈر
مگر جی میں دیدار کی حسرت رہے گی اور قبر میں آنکھوں سے خون کی ندی بہے گی۔
منظفر شاہ کا شعلۂ غضب ایسا بھڑکا کہ لوگوں سے کہا اس آتش کے پرکالے
کو جلد شہر سے دور لے جا کر آگ میں ڈال دو اور جلا کر خاک کر ڈالو۔ لوگ اس
حکم پر کسی تعمیل کے لیے بہرام کو شہر سے دور جنگل میں لے گئے اور لکڑیاں اکٹھی
کرکے اس کے انبار پر بہرام کو بٹھا دیا اور چاروں طرف سے آگ دے چکے تھے
کہ اتفاق سے تاج الملوک اور بکاولی کا گلستان ارم کی سیر کو جاتے ہوئے
اس مقام پر پہنچے جہاں سے جزیرہ فردوس قریب رہ جاتا ہے تو انھوں نے
سوچا روح افزا سے ملتے چلیں اس لیے اس طرف کو ہولیے وہاں جا نکلے جہاں
یہ سب کچھ تیاری کی جاچکی تھی۔ بکاولی نے لوگوں کی بھیڑ اور بھڑکی ہوئی آگ دیکھی
تو تخت قریب اتارا اور حقیقت حال دریافت کرنے پر فی الفور کہا آگ کو فوراً
بجھاؤ، اگر اس کا ایک رواں بھی جلا تو سینکڑوں کو جلا کر خاک کر دوں گی۔
لوگ ڈر سے آگ بجھا دی اور وہ دونوں بہرام کو لے جا کر ایک باغ میں
اترے اور بہرام اور تاج الملوک کو وہیں چھوڑ کر چچا اور چچی کے پاس گئی

اور جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے خیر و عافیت معلوم کی تو بکاولی نے کہا آپ سے
اور چچی جان سے جی ملنے کو چاہتا ہے اور سب خیریت ہی ہے لیکن راہ میں ایک عجیب
ماجرا دیکھا کہ میرے زین الملوک کے وزیر زادے کو لوگ جلانا چاہتے تھے۔
اگر میں نہ پہنچ جاتی تو وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔ فی الواقع اس سے تقصیر ایسی ہی
ہوئی تھی لیکن اس طرح کی سزا فائدہ نہیں دیتی جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہو چکا کلنک
کا ٹیکہ تو نہ مٹے گا۔ اب کچھ لوگ جانتے ہیں پھر ہزاروں جانیں گے۔ بہتر ہے کہ
تقصیر معاف ہو اور روح افزا کو اس کے ساتھ بیاہ دیجیے۔ مجھے بھی تو تاج الملوک
کے ساتھ بیاہا۔ بیٹی اور بھتیجی میں کیا فرق ہے۔ منظفر شاہ نے یہ باتیں سن کر
تامل کیا اور کہا "بہت بہتر تم مختار ہو۔"

بکاولی وہاں سے روح افزا کے پاس آئی۔ صبح کو روح افزا کو اس کے ماں
باپ کے پاس لے گئی اور اس کی تقصیر معاف کروائی پھر اس کو مائیوں بٹھا کر
تینوں گلستان ارم جا پہنچے۔

مائیوں بٹھانے کی رسم آج بھی مسلم گھرانوں میں دیکھی جاسکتی ہے اور
کُل ماجرا اپنے ماں باپ کو گوش گزار کیا اور ان سے التجا کی کہ جیسی دھوم دھام
سے تاج الملوک کو وہ بیاہنے آئے تھے اس طرح آپ بھی بہرام کو بیاہنے چلیے
ماں باپ نے اس کی آرزو کا پاس کیا اور اس طرح سب کچھ کر کے ٹھاٹھ باٹھ
سے جزیرہ فردوس کو بہرام کی برات لے گئے وہاں بھی کوئی کمی نہیں رکھی گئی تھی
اور نہایت عظیم الشان محفل برپا کی اور زنانی سواریوں کو اس وضع سے اتروا کر
ـــــ عملا تے وار مجلس انبساط میں لے آئے۔ پھر رات تک ناچ اور راگ
رنگ کی صحبت رہی پھر اپنے خاندان کے چلن کے موافق نکاح کر دیا گیا۔ ہار اور
پان دینے کے بعد نوشہ کو رسم کے واسطے محل میں بھیجا گیا۔ بکاولی بہنوں کی
طرح ساتھ گئی اور اس کی طرف سے خوب جھگڑی۔ آرسی مصحف کے بعد دولہا
کو دلہن کا جھوٹا شربت پلایا۔ پھر رخصتی عمل میں آئی اور اس آن بان سے برات

گلستان ارم واپس لائی گئی اور کئی دن وہیں رہی پھر نہایت طمطراق سے ملکِ نگاریں لوٹے اور بہرام کے ماں باپ کو بلوا کر سارا قصہ سنایا۔ وہ بہو بیٹے کو دیکھ کر نہایت شاد ہوئے اور مجلس نشاط کی تیاریاں ہوئیں۔ بادشاہ جاکر انھیں لے آئے۔ شہر کے سب ہی اہل طرب طلب کیے گئے کئی دن تک ناچ اور راگ کی صحبتیں رہیں اور خوب خوب مہمانداریاں کی گئیں۔ نقد و جنس بے شمار بانٹا گیا۔

سب کے رخصت ہو جانے کے بعد بکاولی نے دیو کے ہاتھ حمالہ کو کہلا بھیجا کہ بہت جلد میرا باغ اور محل اکھڑوا کر یہاں لے آو۔ چار ہی دن میں محل سرائے کے متصل نہایت آراستگی سے باغ و محل درست کر دیا۔

اور یہ داستان خدا کے فضل و کرم سے سب کو بامراد اور خانہ آباد کرنے کے بعد اختتام کو پہنچی اور آدمی اور پری کے درمیان رشتہ سے آدمی کی عظمت کو پایہ ثبوت تک پہنچایا اور پریوں کی نظر میں حقیر نہ رہنے دیا۔ تہذیب اور معاشرے کی ترجمانی کے ساتھ داستان کو اس انداز کے مختلف مراحل سے گزارا گیا کہ اس کی دلچسپی کسی مرحلے میں کم نہیں ہونے پائی اور داستانی معاشرے کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی یہ اور بات ہے کہ اس میں بہت سی کمیاں ہیں اس داستان کا انجام بتاتا ہے کہ داستان نگار روایتی طور پر اس کا قایل ہے کہ داستان کو المیہ نہیں بلکہ طربیہ پر ختم ہونا چاہیے۔ تاکہ داستان پڑھنے والے یا سننے والے ایک طرح سے ذہنی تسکین حاصل کریں اور اپنے اپنے دائرے میں کامیابیوں کے متوقع اور امیدوار رہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر محلات کو رکھ دینا ہم اس طرح بھی دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک شہر کی جگہ دوسرا شہر آباد ہوا ہے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نئے تعمیری خانے وجود میں آئے۔ ہندوستانی شہروں کے متوازی انگریزوں کی کوٹھیاں الگ نشان سے بن رہی تھیں ان سے بھی یہ صورت حال ایک بدلتے ہوئے تہذیبی رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ داستان تہذیبی مطالعہ کے نقطہ نظر سے ایک اہم داستان ہے۔ اس لیے

بھی کہ یہ کہانی در کہانی ہے اور ایک دائرہ دوسرے دائرے میں داخل ہو گیا ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ دھنک کے نیم دائرے کی طرح اس میں کئی رنگ شامل ہو گئے ہیں۔ ہندو معاشرہ اور معاشرتی روایت مسلم معاشرت کے ساتھ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح مل گئی ہے اور مزید اس پر اس مغربی معاشرت کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہو گئی ہیں جو مغرب کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سرحدوں میں مشرق سے مغرب تک پھیلتا جا رہا ہے۔

بھی کہ یہ کہانی در کہانی ہے اور ایک دائرہ دوسرے دائرے میں داخل ہو گیا ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ دھنک کے نیم دائرے کی طرح اس میں کئی رنگ شامل ہو گئے ہیں۔ ہندو معاشرہ اور معاشرتی روایت مسلم معاشرت کے ساتھ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح مل گئی ہے اور مزید اس پر اس مغربی معاشرت کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہو گئی ہیں جو مغرب کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سرحدوں میں مشرق سے مغرب تک پھیلتا جا رہا ہے۔

● تہذیبی مطالعہ قوموں کی زندگی اور ان کے ذہن کی وہ روداد ہے جسے ہم ان کی سوچ کا سفرنامہ کہہ سکتے ہیں۔ سوچ کا سفر بھی لہروں کی طرح جاری رہتا ہے۔ اس میں بھنور بھی پڑتے ہیں دائرے بھی بنتے ہیں مرادوں کا ساحل بھی آتا ہے اور نامرادیوں کے ساتھ واپسی بھی ہوتی ہے۔

تہذیبی مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر ایک دریا کے سفر کا مطالعہ ہے جو اپنے اندر سمندر کی سی وسعتیں رکھتا ہے۔ وہم سے لے کر فہم، اور فکر سے لے کر فلسفے تک ہم ایسا کوئی حلقہ یا دائرہ نہیں دیکھتے جو تہذیبی مطالعے سے باہر ہو۔ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی طور پر کوئی معاشرہ کن بندھنوں میں قید رہا کب رسم کی کس ڈوری کو توڑ کر اس نے کس رشتۂ خیال کو اپنا لیا اس کا زمین سے کیا تعلق ہے زمانے سے کیا ربط ہے؟ نسلوں اور قوموں کی تاریخی اُفتادوں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کے خوابوں اور خوابوں کی شکست سے اس کا کیا واسطہ ہے یہ سب باتیں تہذیبی مطالعے کے ہی ذریعے معلوم ہوتی ہیں۔ ادارے تہذیب کا حصّہ ہوتے ہیں اور تہذیبیں اداروں کو جنم دیتی ہیں اور ذہنوں کو سمت اور رفتار عطا کرتی ہیں۔

مذہبیت مابعدالطبعیات، صنعت و حرفت، تجارت اور اقتصادیات، غرض کہ ہر شے کو تہذیبی مطالعہ سے نسبت اور اسی لیے ہے کہ اس کا تہذیب سے رشتہ ہے — ادب کی صحیح تفہیم، تعبیر اور تفسیر تہذیبی مطالعے ہی کے ذریعے ممکن ہے، اپنی اس کتاب میں (ڈاکٹر) عفت زریں نے اس تہذیبی مطالعے کی کچھ راہوں پر سفر کیا ہے اور ان اوراق کی سیر اسی مطالعے کی حقیقت اور اس کے ذریعے دید و دریافت کی کوشش علم و آگہی کا باعث بنتی ہے۔ عفت زریں اس کے لیے ہماری توجہ اور تحسین کی ہر طرح مستحق ہیں۔

تنویر احمد علوی

۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ء
دہلی